سخنورانِ حیدرآباد

(حیدرآباد میں اُردو شاعری آزادی کے بعد)

ڈاکٹر سیّد بشیر احمد

سخنورانِ حیدرآباد

(حیدرآباد میں اُردو شاعری آزادی کے بعد)

ڈاکٹر سیّد بشیر احمد

DR. SYED BASHEER AHMAD
M.A., M.Phil., Ph.D.
Off: 6-2-30/B, Ist Floor, Flat No.B1
Sukhamani Apartments, Lakdi-Ka-Pul,
HYDERABAD - 500 004. A.P.
Tel : 2330 0227, 2339 3911
Res.: 2475 3816 Cell: 93910 14005

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

SUKHANWARANE HYDERABAD
(Hyderabad Mein Urdu shairy Āzadi Ke Baad)
By
Dr.Syed Basheer Ahmed
Year of Edition 2007
ISBN 81-8223-286-4
Price Rs.250/-

نام کتاب	سخنورانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں اُردو شاعری آزادی کے بعد)
مصنف و ناشر	ڈاکٹر بشیر احمد
سنہ اشاعت	۲۰۰۷ء
صفحات	۳۱۲
تعداد اشاعت	۵۰۰
قیمت	۲۵۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
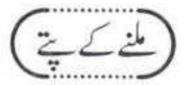
☆ ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد ☆ اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد
☆ حسامی بک ڈپو، چارکمان، حیدرآباد
☆ فلیٹ نمبر B-1، سکھ منی اپارٹمنٹ، لکڑی کا پل، حیدرآباد Cell :9391014005

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com, website:www.ephbooks.com

اِنتساب

میرے والدین

کے نامِ نامی

جن کی تربیت اور دعاؤں کی بدولت

یہہ تخلیق منظرِ عام پر آسکی

ڈاکٹر سید بشیر احمد

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ اِرم کر　　　اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ رحم کر
توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر　　　گم نام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلم رو سے نہ جائے

فہرست مضامین

پیش گفتار
پیش لفظ
باب اول : آزادی کے بعد حیدرآباد میں شعری اصناف ۱۲
باب دوم : آزادی کے بعد روایت پرست، ترقی پسند اور جدیدیت کے علمبردار شعراء ۲۷
۱۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں عثماںؔ آصفِ سابع ۳۹
۲۔ امجدؔ حیدرآبادی ۴۶
۳۔ صفیؔ اورنگ آبادی ۵۳
۴۔ نجمؔ آفندی ۶۳
۵۔ حیرتؔ بدایونی ۶۸
۶۔ نواب میر حمایت علی خاں (ولی عہد بہادر) ۷۲
۷۔ صدقؔ جائسی ۷۳
۸۔ ابوزاہد سید یحییٰ حسینی قدرؔ عریضی ۸۳
۹۔ حلمیؔ آفندی ۸۸
۱۰۔ الحاج مرزا شکور بیگ ۹۴
۱۱۔ شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیعؔ ۱۰۱
۱۲۔ علامہ رشیدؔ ترابی ۱۰۶
۱۳۔ خورشید احمد جامیؔ ۱۱۰
۱۴۔ مخدومؔ محی الدین ۱۱۷
۱۵۔ عظمتؔ عبدالقیوم ۱۲۵
۱۶۔ شاہدؔ صدیقی ۱۲۶

۱۷۔ سکندر علی وجد ۱۳۲
۱۸۔ اوجؔ یعقوبی ۱۳۹
۱۹۔ سعیدؔ شہیدی ۱۴۸
۲۰۔ تہنیت النساء بیگم تہنیتؔ ۱۵۵
۲۱۔ بشیر النساء بیگم بشیرؔ النساء ۱۶۰
۲۲۔ صاحبزادہ محمد علی خاں میکشؔ ۱۶۶
۲۳۔ امیر احمد خسروؔ ۱۷۵
۲۴۔ عزیز احمد جلیلیؔ ۱۷۹
۲۵۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلیؔ ۱۸۰
۲۶۔ طالبؔ رزاقی ۱۸۹
۲۷۔ سلیمان اریبؔ ۱۹۳
۲۸۔ خورشید حسین مضطرؔ ۲۰۳
۲۹۔ شمس الدین تاباںؔ ۲۰۴
۳۰۔ سہیلؔ آفندی ۲۰۶
۳۱۔ ڈاکٹر بانو طاہرہؔ سعید ۲۰۷
۳۲۔ ڈاکٹر غیاثؔ صدیقی ۲۱۷
۳۳۔ خواجہ شوقؔ ۲۲۱
۳۴۔ یوسف یکتاؔ ۲۲۷
۳۵۔ صاحبزادہ میر برہان علی خاں کلیمؔ ۲۲۸
۳۶۔ حمید رونقؔ ۲۲۹
۳۷۔ مغنی تبسمؔ ۲۳۰
۳۸۔ بشیرؔ امجد ۲۳۳
۳۹۔ راشد آزرؔ ۲۳۴

۴۰۔	شاذ تمکنت	۲۴۰
۴۱۔	رئیس اختر	۲۴۸
۴۲۔	صلاح الدین نیر	۲۵۴
۴۳۔	مضطر مجاز	۲۶۱
۴۴۔	ڈاکٹر صادق نقوی	۲۶۹
۴۵۔	فیض الحسن خیال	۲۷۳
۴۶۔	رحمٰن جامی	۲۷۷
۴۷۔	ناصر کرنولی	۲۸۲
۴۸۔	محسن جلگانوی	۲۸۳
۴۹۔	مصحف اقبال توصیفی	۲۸۴
۵۰۔	رشید جلیلی	۲۸۶
۵۱۔	رؤف خلش	۲۸۷
۵۲۔	مومن خاں شوق	۲۸۸
۵۳۔	ڈاکٹر ہادی قادری	۲۸۹
۵۴۔	غیاث متین	۲۹۰
۵۵۔	علی الدین نوید	۲۹۲
۵۶۔	مظفر النساء ناز	۲۹۳
۵۷۔	علی ظہیر	۲۹۴
۵۸۔	ڈاکٹر راہی	۲۹۵
۵۹۔	فاطمہ تاج	۲۹۶
۶۰۔	رؤف خیر	۲۹۷
۶۱۔	حسن فرخ	۲۹۸
باب سوم	کتابیات	

پیش گفتار

جناب سید بشیر احمد انتہائی خوبیوں کے مالک ہیں۔ مخلص، منکسر المزاج، شریف النفس، ہمدرد دوسروں کی مدد کے لئے تیار، فلاحی کاموں میں سرگرم، حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کا نمونہ۔۔۔۔ اسی کے ساتھ شستہ وشگفتہ شعری وادبی ذوق کے حامل۔ اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ دی تو یکے بعد دیگرے ڈگریاں حاصل کرتے گئے، ایم۔اے ہوئے، ایم۔فل ہوئے اور اب پی۔ایچ۔ڈی۔۔۔۔ زندگی کو دیکھے بھالے ہیں، شعروادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ ہے۔ زبان و بیان پر قابو ہے اور قلم پر گرفت مضبوط۔ تحریر وتصنیف سے دلچسپی ہے۔ اِدھر لکھا اور مسلسل لکھا کہ حیدرآباد کے روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں کے مستقل قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے اچھوتے موضوعات ان موضوعات کے تعلق سے رویہ، صاف ستھری زبان، متوجہ کرنے والا طرزِ تحریر، دھیما، خنک اور پر اثر لہجہ کہ ان کے مضامین کو اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والوں میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ گزشتہ سال ان کی کتاب ''حیدرآباد میں غیر مسلموں کی اردو خدمات'' (آزادی کے بعد) شائع ہوئی جو اپنے موضوع اور مواد کی وجہ سے مقبول ہی نہیں ہوئی بلکہ زبان و بیان اور لہجہ واسلوب کے باعث بھی اس کتاب نے اپنے پڑھنے اور پسند کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کرلیا اور اب انہوں نے ''سخنورانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد) جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ بشیر صاحب کی یہ کتاب بھی اتنی ہی معلوماتی اور دلچسپ ہے جتنی کہ ان کی پہلی کتاب تھی۔ بشیر صاحب تحقیق کا ہنر جانتے ہیں۔ جب کسی موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں تو

حیدرآباد کی لائبریریوں کو چھانتے ہیں، اہلِ ذوق اصحاب کی ذاتی لائبریریوں سے رجوع ہوتے ہیں اور موضوع کے سارے متعلقات پر نظر رکھتے ہیں۔ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اس کا جائزہ ہی نہیں لیتے تجزیہ بھی کرتے ہیں اور خواہ کتنے ہی موانع کیوں نہ ہوں اولین ذرائع تک رسائی حاصل کرتے ہیں کہ مواد مصدقہ طور پر حاصل ہو۔ محقق کو جس لگن، جستجو، محنت، صبر، احتیاط اور اپنی ذات پر اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے بشیر صاحب ان اوصاف سے متصف ہیں۔ کہئے، رموزِ تحقیق ان پر روشن ہیں۔ ویسے تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ بشیر صاحب محصلہ وسائل اور ذرائع سے پوری طرح کام لیتے ہیں کہ کہیں کوئی گوشہ چھوٹ نہ پائے اور نہ کسی کو ایسا موقع دیتے ہیں کہ آسانی سے اعتراض کر بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ مکمل ہوتی ہے اور حرفِ آخر کے قریب!

"سخنورانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد)" کے موضوع پر انہوں نے ایسے ہی کام کیا ہے اور ایک وسیع ترین کینوس کے موضوع کو سلیقہ سے سمیٹ لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض شعراء کا تذکرہ نہیں آیا ہو۔ ایسے موضوعات پر تحقیق میں ایسا ہی ہوتا ہے، کہ ہر کسی کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ممتاز اور نمائندہ شعراء کا تذکرہ ہو جائے یہی کافی ہے۔ بشیر صاحب نے یہی کیا ہے۔ اول تو انہوں نے حیدرآباد میں آزادی کے بعد شعری اصناف پر گفتگو کی ہے۔ غزل، قصیدہ، واسوخت، مثنوی، رباعی، سہرا، گیت اور مرثیہ وغیرہ جیسی اصناف میں خاطر خواہ طبع آزمائی رہی اسی کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں اور شعر و ادب کے مطالعہ کے بعد ہمارے شاعروں نے ان زبانوں کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ فنکارانہ دسترس اور اعتماد کے ساتھ! چنانچہ ماہئے، ترائیلے، ہائیکو، ثلاثی، سانیٹ اور دوہے وغیرہ بھی لکھے جانے لگے اور اتنے کہ ان کے مجموعے بھی شائع کئے جاسکتے ہیں بعض شاعروں کی یہ شناخت بھی بن گئے۔ بشیر صاحب نے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ان پر قلم اٹھایا ہے اور کہنے کا حق ادا کیا ہے۔ بشیر صاحب نے شاعروں کے حالاتِ زندگی بھی شامل کئے ہیں اور بعض ایسے پہلو اور سنین کہ عام طور پر لوگ ان سے آگہی نہیں رکھتے۔ شاعروں کے کلام پر تنقید و تبصرہ بھی ہے۔ ایسی تفصیل سے کام لینا ممکن بھی نہ تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ جتنا ہونا چاہئے اتنا تو ہے۔

''سخنورانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد)'' حیدرآباد میں اردو شاعری کے منظر نامہ کو روشن کرنے والی ایک اہم کتاب ہے۔ ایسی کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اب نہیں ہوتا، زمانہ جیسے جیسے گذرے گا تب محسوس ہوگا کہ یہ کتابیں ادبی خزینہ ہیں۔ بشیر احمد نے نہایت جانگدازی سے یہ کام کیا ہے اور سلیقہ سے کیا ہے۔ اہلِ ذوق اس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے عام افراد کے لئے بھی یہ کتاب اچھا ادبی تحفہ رہے گی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

۲۲ر مئی ۲۰۰۶ء
ارونا کالونی، ٹولی چوکی
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۸

پیش لفظ

سابق ریاست حیدرآباد سہ لسانی ریاست تھی جو کنڑی، مرہٹی اور تلگو بولنے والے علاقوں پر مشتمل تھی لیکن رابطہ کی زبان اردو تھی۔ سلاطینِ آصفیہ نے مقامی زبانوں کی ترویج کے ساتھ ساتھ اردو کو رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ترقی میں خصوصی دلچسپی لی۔ آصفِ سادس کے زمانے میں اردو کو ریاستِ حیدرآباد کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ آصفِ سابع نے جامعہ عثمانیہ قائم کیا اور اس جامعہ میں ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا۔ اس طرح ملک میں یہ پہلی جامعہ تھی جہاں کا ذریعہ تعلیم مقامی زبان قرار پایا تھا۔

سقوطِ حیدرآباد کے بعد لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل جدید کی گئی جس کی وجہ سے ریاستِ حیدرآباد کے اضلاع اورنگ آباد، گلبرگہ، بیدر، ناندیڑ، پربھنی، رائچور، عثمان آباد وغیرہ کا مرہٹواڑہ اور کرناٹک میں انضمام عمل میں آیا۔ ماباقی تلنگانہ کے اضلاع کو آندھرا کے اضلاع کے ساتھ ملا کر ریاستِ آندھرا پردیش کا قیام ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا۔

اپنے فطرتی میلان کی بناء راقم حیدرآبادی شعراء، ان کی شخصیت اور انکی شاعری پر کام کرنا چاہتا تھا۔ اس سے قبل حیدرآبادی شعراء پر کوئی تفصیلی کام نہیں ہوا تھا۔ اگر کچھ مواد کہیں ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مختصر اور پراگندہ۔ سابق میں راقم نے ایک کتاب ''حیدرآباد میں غیر مسلم شعراء اور ادباء کا اردو کی ترقی میں حصہ'' (آزادی کے بعد) کے

موضوع پر رقم کیا جسکی اشاعت بھی عمل میں آچکی ہے۔اب موجودہ کتاب ''حیدرآباد میں اردو شاعری'' (آزادی کے بعد) تحریر کی گئی ہے۔اس کتاب میں صرف ریاستِ آندھراپردیش اور اس کا عہد'' آزادی کے بعد'' کا تعین کیا گیا ہے۔اس کتاب میں روایت پسند شعراء کے ذکر کے علاوہ ان شعراء کا بھی ذکر موجود ہے جومختلف تحریکات اور رجحانات سے متاثر ہوئے۔اس طرح اصنافِ شاعری میں جوتغیرات اور تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ان سب کااس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔

سہولت کی خاطر کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے بابِ اول میں ''آزادی کے بعد حیدرآباد میں شعری اصناف'' کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔عام طور سے حیدرآبادی شعراء شاعری کے روایتی انداز سے جڑے ہوئے تھے جن کو روایت پسند شعراء کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳٦ء میں ترقی پسند تحریک کے ذریعہ ملک گیر سطح پر شعراء کی فکر اور طرز میں تبدیلی رونما ہوئی۔ترقی پسند تحریک کی وجہہ حیدرآبادی شاعروں کے کلام میں کافی تغیر پیدا ہوا۔خارجی موضوعات پر توجہ دی جانے لگی۔غزل اور نظم میں ترقی پسند موضوعات کا اضافہ ہوا،نئی لفظیات درآئیں۔ ہر صنفِ شاعری خصوصاً صنفِ نظم میں وقیع اضافہ ہوا۔صنفِ غزل بھی اس تحریک سے متاثر ہوئی اور مختلف النوع موضوعات کا غزل میں احاطہ کیا جانے لگا۔ترقی پسند تحریک کا ۱۹۵٦ء رفتہ رفتہ زور کم ہونے کے بعد جدیدیت کے رجحان نے اصنافِ شاعری پر اثر ڈالا ۔ مروجہ اصناف کے علاوہ بیرونی ممالک سے درآئی ہوئی اصناف مثلاً ترائیلے ،سانیٹ اور جاپانی صنف سخن ہائیکو اور پنجابی صنف شاعری ماہیے وغیرہ بھی اردو شاعری میں اثر دکھانے لگے اور حیدرآبادی شعراء نے ان اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے جنکا احاطہ اس کتاب کے پہلے باب میں کیا گیا ہے۔

کتاب کے بابِ دوم میں آزادی کے بعد حیدرآباد کے روایت پرست ،ترقی پسند اور جدیدیت کے علمبردار شعراء کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس باب میں اس انداز سے شعر کہنے والے شعراء کے تعارف اور ان کے کلام کے تجزیے سے تحقیق کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے روایتی شعر گوئی میں آصفِ سابع نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ۔ اِن کی غزلیات کو پانچ دیوانوں میں مرتب کر کے دیوانِ آصفِ سابع کے نام سے شائع کروایا گیا۔ان کی نعتوں کا مجموعہ ''وسیلہ نجات'' بھی منصہ

شہود پر آچکا ہے۔ اُنکی حمد، نعت، منقبت، غزل، مرثیہ، سلام اور نوحہ وغیرہ اردو شاعری کے ذخیرے میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔ صنفِ شاعری میں رباعی کو ایک مشکل فن کا درجہ حاصل ہے۔ حیدرآبادی شعراء نے اس مشکل صنف کی طرف بھی توجہ دی چنانچہ اس باب میں اس صنف کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

صنفِ رباعی میں میر انیسؔ، حالیؔ، اکبرؔ، رواںؔ، یگانہؔ، فانیؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، وغیرہ یقیناً معروف رباعی گو شعراء ہیں لیکن حضرت امجدؔ حیدرآبادی کو امامِ رباعیات ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حیدرآباد میں صنفِ رباعی کو استحکام بخشنے کیلئے قدرؔ عریضی نے ادارۂ قدرِ ادب قائم کیا تھا، یہاں پر دوبیتی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس طرح حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلیؔ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنہوں نے صنفِ نظم کو استحکام بخشنے کیلئے موضوعاتی نظموں کے مشاعروں کا انعقاد کیا تھا۔ حضرت امجدؔ حیدرآبادی کے بعد شاید قدرؔ عریضی، سکینہ الہام اور راشدؔ آزر وہ رباعی گو شاعر ہیں جنہوں نے رباعی کے سارے ۲۴ اوزان کا استعمال کر کے اس صنف کی آبیاری کی۔

حیدرآبادی شعراء نے جس طرح رباعی کی صنف کو یادگار بنا دیا۔ اسی طرح اردو غزل کو بھی حیات بخشی۔ ایسے ہی شاعروں میں صفیؔ اورنگ آبادی کا شمار ہوتا ہے۔ صفیؔ اورنگ آبادی نے دکنی محاورات کو اشعار میں استعمال کر کے ان محاوروں کو اعتبار بخشا۔ علامہ رشید ترابیؔ، جو برِصغیر کے بے بدل خطیب تھے علامہ اقبال کے شکوہ پر سب سے پہلے جوابِ شکوہ لکھا۔ جو ۱۳۵۲ھ میں منظرِ عام پر آیا۔ اُسکے بعد علامہ اقبال نے جوابِ شکوہ نظم کیا۔ سکندر علی وجد نے قدیم دبستانِ شاعری کی روایات کو استحکام بخشا اور نظم کو جمالیاتی احساس دیا۔ ایلورہ اور اجنتا کے حسن کو انہوں نے اپنی نظم اجنتا لکھ کر حسین تر بنا دیا۔ مخدوم محی الدین جو ترقی پسند تحریک کے نقیب تھے ان کا حیدرآباد ہی سے تعلق تھا۔ وہ محبت اور محنت کے شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے جہاں اشتراکیت کو استحکام بخشا، وہاں انکے کلام میں جمالیاتی حسن بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے بچپن میں داغِ مفارقت دینے والے تیسرے لختِ جگر آصف کی رحلت کے صدمۂ جانکاہ سے متاثر ہو کر ''پر اثر نوحہ'' لکھا جس کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

اس طرح انہوں نے مرزا غالبؔ کی یاد تازہ کردی جنہوں نے اپنے ہمشیر زادے عارف کی بے وقت موت پر حزن وملال کا اظہار کرنے رثائی غزل لکھ کر اردو میں شخصی مرثیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس طرح دکنی شاعروں نے غزل کی روایت کو مزید فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ غزل کے موضوعات میں ندرتیں پیدا کی گئیں اور مسائلی غزل کا آغاز ہوا۔ حیدرآباد میں مسائلی شاعری میں اوجؔ یعقوبی کو انفرادی حیثیت حاصل ہے انہوں نے صفیؔ اورنگ آبادی کی طرح دکنی محاوروں کو اپنی شاعری میں استعمال کر کے دکنی محاوروں کو معتبر بنایا۔ انہوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے مصائبِ کربلا کو بھی نظم کیا لیکن وہ صرف مصائب کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان سازشوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں جن کی وجہ سے سانحہ کربلا وقوع پذیر ہوا۔ غزل کی شعری روایت کو عالمی تناظر میں نمایاں کرنے والے شعراء میں علامہ نجم آفندی کا شمار ہوتا ہے۔ علامہ نجم آفندی الہ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوئے اور حیدرآباد ہی کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا تھا وہ اردو کے پرگو اور استادِ سخن شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اسوۂ حسینؑ کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

ان شعراء کے علاوہ حیدرآباد کی شاعرات بشیر النساء بیگم بشیر، تہنیت النساء بیگم زورؔ، بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم اور دیگر شاعرات نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں بیش بہا اضافہ کیا۔ بشیر النساء بیگم گو پردہ نشین خاتون تھیں لیکن ان کے کلام کو پڑھنے سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ارضِ دکن کے معروف شاعر مضطر مجازؔ نے مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ پر وقیع کام کیا ہے۔ انہوں نے ہر دو شعرا کے فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ از خود ایک محال کام ہے اور منظوم ترجمہ اور بھی امر محال ہے جس کو مضطر مجاز نے عمدگی سے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ گو کہ دیگر شعراء نے بھی اس کام کو انجام دیا ہے لیکن ان کے ترجمے کی خوبی کچھ اور ہے۔ متاخرین شعراء میں ہجو یہ کلام سے کیفیتوں کو اجاگر کرنے میں صدقؔ جائسی کے بعد مضطر مجازؔ کا کو انفرادیت حاصل ہے۔

صدقؔ جائسی کا شمالی ہند سے تعلق ہے حیدرآباد میں انکا طویل عرصہ قیام رہا۔ وہ پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ پرنس معظم جاہ بہادر کے دربار سے ایک عرصہ تک وابستگی

رہی۔ یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں بھی ان کی پذیرائی ہوئی۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے تعلق سے مہاراجہ کو اپنے کلامِ لطیف سے توجہ دلائی جو خاصہ کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ہجو یہ کلام عہدِ آتش و مصحفی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

مروجہ اصناف شاعری کے علاوہ دیگر زبانوں سے در آئی ہوئی اصناف سخن مثلاً سانیٹ، ہائیکو، ترائیلے، ثلاثی اور ماہیے وغیرہ پر بھی حیدرآبادی شعراء جیسے ڈاکٹر راہی، بانو طاہرہ سعید وغیرہ نے طبع آزمائی کی ہے لیکن رحمٰن جامی قابل ذکر شاعر ہیں جنہوں نے دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہونے والی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور ان اصناف میں بڑے ذخیرے کا اضافہ کیا۔

علاوہ ازین حیدرآبادی شعراء نے مختلف شعراء کے کلام پر تضمین بھی لکھی ہیں۔ مزاحیہ اور طنزیہ مشہور شاعر طالب خوندمیری نے مشاعروں کی نظامت کے دوران مختلف شعراء کے اشعار پر فی البدیہہ تضمین کہہ کر شہرت حاصل کی۔

بشیر النساء بیگم بشیر، تہنیت النساء بیگم تہنیت پردہ نشین خواتین تھیں ان کی تصاویر عدم دستیابی کی وجہ شریک کتاب نہیں کئے جا سکے۔

اس کتاب کے باب سوم میں کتابیات کو جگہ دی گئی ہے جن میں مستفیض شدہ کتابوں کو ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ راقم صمیمِ قلب کے ساتھ استاذی ڈاکٹر عبدالمجید بیدار کا شکر گذار ہے جن کی رہبری کی وجہ سے اس کتاب کی تکمیل ہو سکی۔ اس کے علاوہ راقم پروفیسر بیگ احساس صدر شعبہ اردو کا بھی شکر گذار ہے جن کی رہنمائی اور اخلاقی اعانت کے باعث یہ کتاب تحریر کی جا سکی۔ راقم کے لئے ادارۂ ادبیاتِ اردو، جامعہ عثمانیہ کی لائبریری، نظام ٹرسٹ لائبریری اور کتب خانہ جعفریہ کے اربابِ مقتدر کا شکریہ ادا کرنا بھی از حد ضروری ہے۔ امید ہے کہ اس حقیری کوشش کو پسند کیا جائے گا فقط

ڈاکٹر سید بشیر احمد

آزادی کے بعد
حیدرآباد میں شعری اصناف

یوں تو ۱۸۸۴ء میں آصفِ سادس نے اردو کو حیدرآباد کی سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا[۱] لیکن عہدِ عثمانی میں اردو بڑی تیزی سے ارتقائی منازل طئے کرنے لگی۔ آصفِ سابع ۱۹۱۱ء میں تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔[۲] جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔[۳] اسطرح ملک بھر میں یہ پہلی جامعہ تھی جس میں ایک اہم ہندوستانی زبان کو ذریعہ تعلیم کا موقف حاصل ہوا۔ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے علمی اور ادبی ماحول میں ترقی کے ساتھ اردو کی ہر صنفِ سخن میں ارتقاء کا عمل تیز ہوگیا۔ دورِ عثمانی میں شعراء اور ادباء کی کثیر تعداد شمالی ہندوستان سے حیدرآباد وارد ہوئی۔ جن میں چند اہم نام یہ ہیں۔ داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، فانیؔ بدایونی، جوشؔ ملیح آبادی، صدقؔ جائسی، علامہ نجمؔ آفندی، شاہدؔ صدیقی اور حضرت شاہ محمد صدیقی سوداگر وغیرہ وغیرہ۔ ان میں بیشتر حضرات نے حیدرآباد ہی کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا اور یہیں پر پیوندِ خاک ہوئے۔

داغؔ دہلوی کو آصفِ سادس اور آصفِ سابع ہر دو کا استاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ داغؔ دہلوی نے حیدرآباد میں اپنی قیام گاہ میں ایک دفتر بھی قائم کیا تھا جہاں وہ کلام پر ضروری اصلاح دیا کرتے تھے۔ بیرونِ حیدرآباد کے شعراء بذریعہ ڈاک اپنا کلام انکے ہاں بھجواتے جو ضروری اصلاح کے بعد انکو واپس کردیا جاتا تھا۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو بھی داغؔ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا چنانچہ داغؔ کی شاگردی پر علامہ اقبالؔ فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جنابِ داغؔ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے ترے جیسے کو کرڈالا سخن داں بھی سخن ور بھی

۱،۲،۳۔ مقالہ برائے ایم فل اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد ۲۰۰۳ء "آزادی کے بعد حیدرآباد میں غیر مسلم شعراء اور ادباء کا اردو کی ترقی میں حصہ" صفحہ ۱

غزل:۔

غزل ابتداء میں حسن وعشق کی حکایتوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی اسی لئے صنفِ غزل کو ''سخن بایار گفتن'' کہا جاتا تھا۔ بعد میں تصوف اور پند ونصائح کے مضامین بھی غزل میں باندھے گئے۔ غزل کا ایک شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک شعر میں شاعر اپنے موضوع کو ان دو مختصر پیمانوں (مصرعوں) میں بیان کرتا ہے۔ غزل میں کفایتِ لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ غزل کا فن رمز وایما کا فن ہے۔ غزل میں ابہام سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ جب بات وضاحت کے ساتھ نہیں کی جاتی تو ایک طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اسی کو ابہام کہتے ہیں۔ غزل کے شعر کا وزن کرنے کے پیمانے بحریں کہلاتے ہیں۔ غزل کے تمام مصرعے ایک بحر میں ہوتے ہیں۔ بحر میں ردیف اور قافیہ دونوں استعمال میں آتے ہیں ایسی غزل کو مردف غزل کہتے ہیں اور ردیف نہ ہو تو صرف قافیے استعمال ہوتے ہیں۔ بغیر ردیف کے غزل لکھی جاسکتی ہے لیکن قافیہ کا ہونا ضروری ہے غزل اگر مردف ہو تو مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور اگر غزل مردف نہ ہو تو مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ شاعر آخری شعر میں اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ اس کو مقطع کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی غزل میں فلسفہ کو بھی پیش کیا۔ اسی روایت کی تقلید میں حیدرآبادی شعراء نے بھی سماجی، معاشرتی، سیاسی، مسائلی، مذہبی اور پند ونصائح کے مضامین کو اپنی غزل میں کامیابی سے پیش کیا۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۶۰ء ترقی پسند تحریک کا دور رہا ہے۔ اس عرصہ میں داخلی موضوعات پر کم اور خارجی موضوعات پر زیادہ لکھا گیا۔ ایک طرح قلم کار کے قلم پر موضوعات کی پابندی عائد کردی گئی تھی۔ بیانیہ اور سادہ بیانیہ پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کا دور شروع ہوتا ہے اور اشتراکیت کی پابندیاں جو قلمکار پر عائد کی گئی تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ موضوع کی یکسانیت سے ترقی پسند تحریک کے دور میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا جدیدیت نے اس یکسانیت کو توڑا۔ غزل گوئی میں اب مذہب، سیاست، اخلاق، حسن اور نفسیات المختصر بے شمار موضوعات در آئے۔ آج کی غزل گوئی میں علامتی اسلوب اہمیت کے حامل ہیں۔ حیدرآباد کے شعراء نے صنفِ غزل کی ساری تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کرلی اور انہوں نے سیاسی، مذہبی، اخلاقی، نفسیاتی اور مسائلی

امور کا اپنی غزل گوئی میں احاطہ کیا۔ صنفِ غزل میں علامتی شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علامتی شاعری میں شعر کے پسِ منظر سے واقف نہ ہوں تو منظر صاف نہیں ہوتا۔ پاکستانی شاعر افتخار عارف نے ذوالفقار علی بھٹو سابق حکمران پاکستان کے دور میں اُنکے اختیار کردہ آمرانہ طرزِ حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

زمانہ کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا   یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجہ میں

ذیل کے شعر میں حیدرآبادی شاعر صلاح الدین نیرؔ نے گجرات کے فسادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے جو علامتی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔

غالباً پھر کسی مقتل سے چلے آئے ہو   خون کے دھبے نظر آتے ہیں دستاروں

غزل میں عصر حاضر کے کرب کا خواجہ شوقؔ نے ذکر کیا ہے۔

طئے ہو رہی ہے عمر عجب بے بسی کے ساتھ   اک سانس اجل کے ساتھ ہے اک زندگی کے ساتھ

خواجہ شوقؔ خوش لباسی اور اچھے کردار کے تعلق سے کہتے ہیں۔

لباس اچھا ہو تو لازم نہیں کردار اچھے ہوں   بہت کم لوگ اس معیار پہ پورے اترتے ہیں

غزل میں پند و نصائح کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ چنانچہ شاذؔ تمکنت اپنے محبوب کو آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں تیری راہ کا پتھر سہی یہ بات تو سُن   آگے کھائی ہے اگر راہ کا پتھر ہٹ جائے

پرانے اقدار میں مناسب تبدیلی کے تعلق سے شاہدؔ صدیقی کہتے ہیں۔

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی شمعیں   نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

شاہدؔ صدیقی نے منزلِ مقصود میں ناکامی کی وجہ بتاتے ہیں۔

اے قافلہ والوں سچ کہنا بے وجہ تو ہم ناکام نہیں   منزل کا تصور عام سہی، منزل کی محبت عام نہیں

مخدوم محی الدین نے معصوم پیار کی حکایت کو یوں بیان کیا ہے۔

نہ ماتھے پہ شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے   خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

لیکن ان روایتی موضوعات سے ہٹ کر محنت اور محبت اور اچھے مستقبل کی تمنا اور اس کے لئے جہدِ مسلسل کے تعلق سے مخدومؔ کہتے ہیں۔

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو   صدائے تیشہ کامران ہو، کوہ کن کی جیت ہو

روایتی اصناف میں غزل کے بعد قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، شہر آشوب اور واسوخت شامل ہیں۔

خمسہ یا مخمس شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس میں کسی شاعر کی غزل کے مصرعہ یا شعر پر تین مصرعے اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ تینوں مصرعے اشعارِ ماقبل کے منشا و مفہوم کے مربوط ہو جائیں۔ متقدمین سے متاخرین تک تمام شعراء کے دواوین میں غزلوں کے بعد جہاں دیگر اصنافِ شاعری کے نمونے ملتے ہیں وہاں خمسے بھی موجود نظر آتے ہیں۔

صدقؔ جائسی نے اپنے استاد حضرت جلیل کی نعتِ شریف کے مصرعہ پر برجستہ موضوع مصرعے اس طرح لگائے ہیں کہ وہ اس نعتِ شریف کا جزِ ضروری معلوم ہوتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان مصرعوں کے بغیر نعتِ شریف کا مفہوم تشنہ رہ جاتا۔

جذبۂ صادق کب دکھائے گا اثر اے مصطفیٰؐ
شوقِ کامل کب بنے گا راہبر یا مصطفیٰؐ
یہ خاک سیرت ہوگی کب کحل البصر یا مصطفیٰؐ
خواب ہی میں ہو کسی دن جلوہ گر یا مصطفیٰؐ
ڈھونڈتی ہے تم کو آنکھوں میں نظر یا مصطفیٰؐ

مستزاد:-

"لفظی اعتبار سے مستزاد کے معنی ہے زیادہ کی گئی چیز اصطلاحاً یہ وہ الفاظ ہیں جو غزل، رباعی یا نظم وغیرہ کے مصرعوں میں بڑھائے جاتے ہیں۔ کسی دوسری ہئیت پر مستزاد کا اضافہ اسطرح ہوتا ہے کہ مصرعے یا شعر کے آخر میں کچھ موضوع فقرے متصل کر دیئے جائیں۔ مستزاد کیلئے مثنوی یا رباعی کی طرح بحر یا بحریں مقرر نہیں اسے ہر بحر میں کہا جا سکتا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جس بحر میں نظم یا غزل ہے، اسکے مصرعوں پر اضافہ کردہ مستزادی فقرے، اسی بحر میں ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی سخت گیر اصول نہیں ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ نظم یا غزل کا مصرعہ کسی اور بحر میں ہے اور مستزادی فقرہ کسی اور بحر میں۔ بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ مستزادی فقرہ رباعی کے وزن میں ہو لیکن اردو فارسی کے قدیم شعراء کا عمل اکثر

اس اصول کی نفی کرتا ہے۔اسطرح مستزادی فقرے کے قافیے نظم یا غزل کے قافیوں کے ہم قافیہ بھی ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔اس معاملہ میں کسی اصول پر سختی نہیں برتی گئی۔

مستزاد دو قسم کا ہوتا ہے۔اول مستزادِ عارض اس میں مستزادی فقرہ اصل شعر کے مضمون و مفہوم سے اس طرح پیوست نہیں ہوتا کہ اگر وہ حذف کر دیا جائے تو کلام نامکمل رہ جائے۔ دوّم مستزاد الزم۔اس میں اضافہ کردہ فقرہ یا ٹکڑا اصل شعر کے مفہوم کو مکمل کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔مستزاد ٹکڑے میں کتنے الفاظ ہوں،اس کی بھی کوئی قید نہیں لیکن ظاہر ہے کہ مستزاد ٹکڑا،اصل مصرعے سے کچھ چھوٹا ہی ہوگا۔''[1]

حیدرآبادی شعراء نے بھی اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے چنانچہ حیدرآباد کے جید عالم اور نامور شاعر شیخ الاسلام حضرت سید محمد بادشاہ حسینی قادری لئیقؔ نے مستزاد کی ہئیت میں ایک نعت لکھی ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اے ختمِ رُسلؐ سیدِ کُل سرورِ ذیشاں سلطانوں کے سلطاں
تم قبلہ دل،کعبۂ جاں،مرکزِ عرفاں اور حاصل ایماں

قصیدہ:-

قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں۔جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی تمام اشعار دوسرے مصرعے سے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں لیکن ردیف کی پابندی ضروری نہیں۔قصیدہ میں مضامین بلند اور الفاظ پرشکوہ ہوتے ہیں۔قصیدہ کے اجزائے ترکیبی تشبیب،گریز،مداح اور عرضِ مطلب اور دعا ہوتا ہے۔قصیدے مختصر اور طویل دونوں طرز میں لکھے گئے ہیں۔قصیدہ ایک شاندار صنفِ سخن ہے اسکا ماضی بیحد تابناک تھا۔جس قصیدے میں کسی کی مدح کی جائے وہ مدحیہ قصیدہ کہلاتا ہے اور جس قصیدہ میں کسی شخص کی برائی یا زمانے کی خرابی کا گلہ ہو وہ ہجویہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

حیدرآباد میں ۱۹۳۷ء میں مہاراجہ کرشن پرشاد صدرِاعظم کے عہدہ پر دوبارہ مامور ہوئے۔اس موقع پر صدق جائسی نے مہاراجہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے تہنیتی کلام قصیدے کی ہیئت میں پیش کیا تھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

---

[1] درسِ بلاغت تالیف ترقی اردو بیرو نئی دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۴۶

چھائی ہوئی گھٹا تو غم انگیز تھی مگر دل بولتا تھا چاند بھی ہے اس سحاب میں
ناگاہ آئی مژدہ تازہ لئے ہوئے بادِ صبا بسی ہوئی عطرِ گلاب میں
شکرِ خدا کہ گلشنِ عالم کے دن پھرے آئی بہارِ جاں جہانِ خراب میں
اس کارواں کے ہاتھ میں آئی زمامِ ملک جس نے دلوں پہ کی ہے حکومت شباب میں

صدقؔ جائسی نے قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں ہجویہ قصیدے بھی لکھے ۔ متاخرین شعراء میں اس صنفِ سخن میں صدقؔ جائسی ماہر نظر آتے ہیں اور سودا جیسے ہجویہ قصیدہ گوئی میں نقاشِ اول کی یاد ان کے کلام سے تازہ ہو جاتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو کی پروفیسری باوجود کوشش کے جناب صدق جائسی کو نہ مل سکی البتہ انکے بجائے میرٹھ کے سید سجاد صاحب جو اعلیٰ ڈگریوں کے حامل تھے کا انتخاب ہو گیا۔ صدقؔ جائسی نے اس تقرر پر اپنی برہمی کا اظہار ہجویہ قصیدہ لکھ کر کیا۔ جسکے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

بھاڑ ایک زمانہ تک دلی میں اگر جھونکا اس سے کہیں اردو کا جلوہ نظر آتا ہے
میرٹھ کا لب ولہجہ چھپا ہے چھپائے کب ہر لفظ ہر اک فقرہ بھونڈا نظر آتا ہے
مقصود ریا کاری ہر بات میں رہتی ہے کمبخت تصنع کا پتلا نظر آتا ہے
تہذیب نشت اس کی موٹر میں کوئی دیکھے انگریز بہادر کا کتا نظر آتا ہے

واسوخت:۔

واسوخت ایک دلچسپ صنف ہے جس میں غزل کے روایتی عاشق کی نیاز مندی اور خود سپردگی کے بجائے اس کے پندار و خودداری کا اظہار ہوتا ہے۔ واسوخت میں عاشق، محبوب کو کھلے لفظوں میں یہ باور کرواتا ہے کہ اسکے حسن کی جو قدر و قیمت اور حیثیت ہے وہ اسکے عشق کی بدولت ہے۔ مگر یہ صنف متبذل اور عامیانہ خیالات سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر واسوخت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں "واسوخت وہ صنفِ سخن ہے جس میں عاشق معشوق کی متلون مزاجی، کج ادائی اور ہرجائی پن سے تنگ آکر اس کو بھی جلی کٹی سناتا ہے اور غم وغصہ کے عالم میں کسی دوسرے معشوق سے محبت کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ معشوق اس سے سراسیمہ ہو کر عاشق سے از سرِ نو قول و قرار کرتا ہے اور عاشق و معشوق کے درمیان صلح صفائی ہو جاتی ہے۔"[1]

ابتداً واسوخت آٹھ مصرعوں کی ہئیت میں لکھے جاتے تھے ہر بند کے اولین چھ مصرعہ ہم قافیہ ہوتے تھے اور ٹیپ کا شعر کسی اور قافیہ میں ہوتا تھا مگر میر نے اس ہیئت سے انحراف کرتے ہوئے واسوخت کیلئے چھ مصرعہ کی ہئیت اختیار کی۔ ۲

شہر آشوب:۔

شہر آشوب یہ وہ صنفِ سخن ہیں جس میں بربادیوں اور تباہ کاریوں کا دردمندی کیساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بربادی کسی شہر، ملک اور خطے کی بھی ہوسکتی ہے۔ کسی عہد کی، کسی معاشرہ اور جماعت کی بے بسی، پستی اور مفلوک الحالی اسکے موضوعات ہیں۔ شہرِ آشوب غزل کی ہئیت میں بھی لکھے گئے ہیں اور مثنوی، مخمس اور مسدس کی ہیئتوں میں بھی۔ ۳

مثنوی:۔

یہ صنفِ سخن فارسی سے اردو میں در آئی ہے۔ مثنوی ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر شعر ہم وزن ہوتا ہے اور جس میں مطلع کی طرح قافیہ و ردیف یا صرف قافیہ کا التزام ہوتا ہے۔ مثنوی میں کوئی طویل داستان، قصہ، کہانی یا واقعہ درج کیا جاتا ہے اس صنفِ شاعری میں ہر قسم کے خیالات، واقعات اور موضوعات تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثنوی نگار کے پیشِ نظر ہمیشہ ایک سبق 'ایک پیغام رہتا ہے جسے وہ مثنوی کے اختتام پر اپنے پڑھنے والے تک پہچانا چاہتا ہے جیسے بدی پر نیکی کی فتح' جیسے برائی کا انجام' جیسے عشق میں ناکامی وغیرہ۔ اس صنفِ سخن میں دکنی شعراء نے بھی اہم حصہ لیا ہے۔ وقت کے گذرنے اور حالات کے بدلنے کی وجہ سے مثنوی اپنے فطری زوال سے دو چار ہوئی۔ تکیی پاشاہ حاذق جو حیدر آباد کے پیرانِ طریقت میں ایک اہم اور منفرد مقام کے حامل ہیں ''شیر سے نصیحت'' کے عنوان پر ایک مختصر مثنوی لکھی ہے۔

رباعیات:۔

رباعی کو کسی زمانے میں ''ترانہ اور دو بیتی بھی کہا جاتا تھا''۔ ابتداء میں خانقاہی شعراء نے رشد و ہدایت کیلئے اس صنف کو منتخب کیا۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۱،۲،۳ درسِ بلاغت تالیف ترقی اردو بیرونئی دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء صفحہ نمبر ۱۴۳

پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے تیسرا مصرعہ بے قافیہ ہوتا ہے۔ رباعی میں مختلف اوزان ہوتے ہیں جنکو رباعی گو شاعر ملحوظ رکھتا ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہی مصرعہ ابتدائی تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ رباعی تصوفانہ اور اخلاقی مضامین کیلئے مختص ہے گو اس میں فلسفیانہ مذہبی اخلاقی اصلاحی عشقیہ اور ہر قسم کے مضامین پیش کئے جاسکتے ہیں۔

صنفِ رباعی کی بقاء واحیاء کیلئے ابوزاہد قدؔر عریضی نے حیدرآباد میں ادارہ قدرِ ادب قائم کیا جو اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا جہاں پر صرف دوبیتی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ الہام جنہوں نے اپنی رباعیات میں اردو کے خوبصورت اور برجستہ محاورات کو رباعی کی انگشتری میں مرصع کیا۔ جذبؔ عالپوری نے بھی اس صنفِ سخن میں کافی اضافہ کیا لیکن حضرت امجد حیدرآبادی کو برِ صغیر میں اس صنفِ سخن کی آبیاری میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو رباعی کیلئے وقف کردیا تھا اور اب یہ صنف انکی شناخت بن چکی ہے۔ امجد کو رباعی سے اور رباعی کو امجد سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ انکے علاوہ اور دیگر بیسیوں حیدرآبادی شعراء نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

ذیل میں امجدؔ حیدرآبادی کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے	پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں	میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

حیدرآبادی مشہور شاعرہ بانو طاہرہ سعید کی ایک رباعی ملاحظہ ہو

دل کے زخموں کو بھی سی لیتے ہیں سینے والے	موت کی گود میں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
ساغرِ زیست کی مئے تلخ سہی تلخ سہی	مسکرا کر اسے پی لیتے ہیں پینے والے

مرثیہ گوئی:-

یہ صنفِ سخن عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں در آئی۔ مرثیہ کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) شخصی مرثیے (۲) واقعہ کربلا اور حضرت امام حسینؑ اور اہلبیت سے عقیدت کے اظہار میں لکھے جانے والے مرثیے۔ گو کہ ہر دو اقسام کے مرثیے ہمارے

ہاں مروج ہیں لیکن مرثیہ کا نام آتے ہی واقعہ کربلا کی جانب ہمارا ذہن ملتفت ہو جاتا ہے۔ ارضِ دکن کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس صنفِ سخن میں بھی ہمارے معتقدمین شعراء نے کافی ذخیرہ چھوڑا ہے اس زمانے میں غزل اور قصیدہ کی ہئیت میں مرثیے لکھے گئے۔ مرثیہ گوئی کا آغاز کافی عرصہ بعد شمالی ہندوستان میں ہوا۔ یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس صنفِ سخن میں اردو ادب میں اتنا ذخیرہ ہے کہ دنیا کے کسی اور زبان میں اتنا ذخیرہ نظر نہیں آتا۔ ابتداء میں مرثیے غزل کی ہئیت میں بھی لکھے گئے۔ سودا کے زمانے سے مرثیہ مسدس کی شکل میں عموماً لکھا جاتا ہے۔ اس صنفِ شاعری میں حیدرآباد کے شعراء نے اپنا حصہ ادا کیا۔

آزادی کے بعد حیدرآباد میں تقریباً سارے شعراء کرام نے اس صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں آصفِ سابع، حضرت عبدالقدیر حسرت، حضرت غوثی شاہ، حضرت شیخن احمد شطاری کاملؔ، حضرت امجد حیدرآبادی، اوج یعقوبی، سعید شہیدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ماہیئے :-

ماہیا پنجابی صنفِ شاعری ہے۔ پنجابی سے یہ اردو شاعری میں در آئی۔ ماہیا پنجابی میں بھینس کو اور بھینس چرانے والے کو ماہی کہتے ہیں۔ چرواہوں نے وقت گذاری کے لئے جو گیت گنگنائے ان کی ارتقائی صورت ماہیا ہے۔ اس نظم کا وزن اسطرح ہے۔

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

اس نظم کا وزن ایسا بھی ہے۔

مفعول مفاعلین
فعل مفاعلن
مفعول مفاعلن

استاد قمر جلال آبادی نے فلم ''پھاگن'' کیلئے ماہیا لکھا۔ ملاحظہ ہو

تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ

ساحرلدھیانوی نے فلم ''نیا دور'' کے لئے ماہیا لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

دل دے کے دغا دیں گے
یا رہیں گے مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

حیدرآبادی شاعر رحمٰن جامی نے صنفِ ماہیا پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دو ماہیے بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

اظہار نہیں کرتے
لوگ محبت کا
اقرار نہیں کرتے

☆☆☆

توصیف بھی اس کی ہے
ظلم بھی اس کا ہے
تعریف بھی اس کی ہے

ان ماہیوں میں پہلے اور تیسرے مصرعے ہم قافیہ ہیں اور دوسرا مصرعہ مختلف ہے۔ اس کے علاوہ تمام ماہیوں میں دوسرے مصرعے میں ایک جز کم ہونے کی احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔

سانیٹ:-

صنفِ سانیٹ یوروپی ادب سے اردو میں درآئی ہے۔ سانیٹ میں چودہ مصرعے ہوتے ہیں اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح پہلے حصہ میں آٹھ مصرعے اور دوسرے حصہ میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اردو میں سانیٹ کی ہیئت میں جو تجربے ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں کہ پہلے حصہ میں ۸ مصرعے دو قطعوں کی شکل میں اور

دوسرے حصہ کے چھ مصرعے ایک قطعہ اور ایک شعر کی شکل میں۔ پروفیسر عنوان چشتی رقم کرتے ہیں۔ ''سانیٹ کیلئے ایک بحر کا انتخاب بھی قابلِ غور ہے۔ اطالوی اور انگریزی شعراء نے عموماً ایسی بحریں استعمال کی ہیں جو نہ طویل ہیں نہ مختصر چونکہ سانیٹ ایک نغمہ ہے جو وحدتِ خیال کا مکمل ترین اظہار ہے۔ اس لئے بحریں ایسی ہونی چاہئے جو نظم کی ایک رنگی مجروح نہ کریں۔ چھوٹی بحروں میں خیال کا ارتقاء دشوار ہے لمبی بحروں سے تعقید یا تکرار کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔[1]

ذیل میں حیدرآباد کے شاعر رحمن جامی کا ایک سانیٹ جوان کے شعری مجموعہ ''فسطاط'' میں شائع ہو چکا ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔

نہ جانے تم نے بتایا ہے کیا تمہاری سکھی
بہت دنوں سے مجھے دیکھتی ہے ہنستی ہے
اور اب تو ہوش بھی اپنا نہیں مجھے کوئی
جو مجھ پہ گذری ہے وہ کب کسی پہ گذری ہے
سنا ہے میں نے کہ مجھ سے تمہیں شکایت ہے
تمہیں یہ خدشہ کہ ہوگی تمہاری رسوائی
تمہارے عشق میں جو کچھ بھی میری حالت ہے
تمہیں بھی میں نظر آتا ہوں اب تو سودائی
عجیب دہشت و آوارگی کا عالم ہے
نہ شیو کرنے کی فرصت نہ استری کا خیال
میرے لباس کا بھی میرے جیسا عالم ہے
کہ جیسا کوئی مسافر ہو شہر میں بدحال
وفا کے ہاتھوں میرا خون بھی پسینہ ہے
بڑے سلیقہ کا جینا تمہارا جینا ہے

ترى يولے:-

---

[1] پروفیسر عنوان چشتی ''اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے'' صفحہ ۱۸۰ سنہ اشاعت جولائی ۱۹۷۵ء

تری یولے فرانسیسی صنفِ سخن ہے۔ اردو میں عام طور پر اس کو ترائیلے کہا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ نظم فرانسیسی میں مرثیہ لکھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں لیکن اردو میں اس صنف میں مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آٹھ مصرعوں والی اس نظم میں بنیادی طور پر ۵ مصرعے ہوتے ہیں لیکن پہلا مصرعہ، چوتھے اور ساتویں مصرعے میں دہرایا جاتا ہے اور دوسرا مصرعہ آٹھویں مصرعے میں دہرایا جاتا ہے۔

عطا محمد شعلہ ترائیلے کے تعلق سے کہتے ہیں ''تری یولے فرانسیسی شاعری کا ایک سانچہ ہے جس میں پانچ مصرعوں کے الٹ پھیر سے آٹھ مصرعے بنائے جاتے ہیں۔ گویا ایک طرح کا قطعہ ہے اس میں کوئی ایک خیال یا تجربہ لطیف و رنگین شعری سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔[۱]

ذیل میں حیدرآبادی شاعر رحمٰن جامی کا ایک ترائیلہ درج کیا جاتا ہے۔

عجب سی برہمی احساس میں ہے
میں خود ''اپنے'' سے ٹھوکر کھا گیا ہوں
میرے خوں کی کمی احساس میں ہے
عجب سی برہمی احساس میں ہے
پھر اب اپنی کمی احساس میں ہے
خدا جانے کہاں میں آگیا ہوں
عجب سی برہمی احساس میں ہے
میں خود ''اپنے'' سے ٹھوکر کھا گیا ہوں[۲]

ہائیکو:۔

ہائیکو جاپانی صنفِ شاعری ہے۔ جاپانی سے یہ انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں در آئی ہے۔ ہائیکو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسکے پہلے مصرعے میں پانچ جز (سلیبل) دوسرے مصرعے میں ۷ جز اور تیسرے مصرعے میں پانچ جز ہوتے ہیں۔ اس

۱۔ عطا محمد شعلہ ''شاعر'' ممبئی صفحہ ۳۵ سنہ اشاعت نومبر ۱۹۶۶ء

۲۔ رحمٰن جامی کا مجموعہ کلام ''قسطاط'' سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء، صفحہ ۲۰۰

طرح ایک ہائیکو ۱۷ اجزاء (سلیبلس) پر مشتمل ہوتی ہے۔ ''ہائیکو شارٹ سلیبل اور لانگ سلیبلس پر مشتمل ہوتی ہے۔ شارٹ سلیبل ''سبب'' اور لانگ سلیبل میں ''وتد'' کا استعمال ہوتا ہے''[۱]۔ ذیل میں رحمٰن جامی کا تحریر کردہ ایک ہائیکو جو شارٹ سلیبلس پر مشتمل ہے درج کیا جاتا ہے۔

مزدوری کر یار
مزدوروں کے دم سے ہی
چلتا ہے سنسار [۲]

اب اس کی تختی ملاحظہ ہو۔

مز / دو/ری / کر / یار
۱ ۲ ۳ ۴ ۵
فعلن فعلن فاع

مز / دو/ری / کے/دم / سے/ہی
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷
فعلن فعلن فعلن فع

چلتا/ہے / سن/سار
۱ ۲ ۳ ۴
فعلن فعلن فاع

ثلاثی:-

ثلاثی اسم با مسمی ہوتی ہے یہ تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے ماہیے اور تری یولے کے اوزان سے ہٹ کر جو بھی تین مصرعوں پر مشتمل صنف ہوتی ہے اس کو ثلاثی کہتے ہیں۔ ذیل میں رحمٰن جامی کی ایک ثلاثی بطور نمونہ درج ہے۔

تم عرب سے لٹ لٹا کر آئے ہو
پوچھتا ہے ہر کوئی
سچ کہو کتنا کما کر لائے ہو

---

۱ رحمٰن جامی کا مجموعہ کلام ''فسطاط'' سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء، صفحہ ۲۰۶
۲ رحمٰن جامی غیر مطبوعہ مقالہ از عائشہ خاتون صفحہ ۲۲۴

دوہے:-

اردو کے ارتقائی دور میں امیر خسروؒ اور عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ نے مقامی بولیوں میں دوہے کہے ہیں۔دوہے کے ہر مصرعہ میں چوبیس ماتریں ہوتی ہیں جنکی ترتیب تیرہ اور گیارہ ہوتی ہے۔حیدرآبادی شاعر رحمٰن جامی کا ایک دوہا ذیل میں نموتاً درج کیا جاتا ہے۔

مکّہ کی کیا شان ہے ، زندہ ہے اسلام
سب آکر اس پر جڑے ، ایک محمدؐ نام

سہرا:-

سہرا اردو شاعری کی ایک قدیم صنفِ سخن ہے جس کا ربط قصیدہ سے ہے۔عام طور پر شادی بیاہ کے موقع پر شاعر اپنے احساسات کو سہرے میں قلمبند کرتا ہے اور دولہا دلہن کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔چنانچہ حیدرآبادی شعراء نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ذیل میں حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار رحیم صاب میاں کا ایک سہرہ درج کیا جاتا ہے جو دکنی زبان میں لکھا گیا ہے جس سے اس میں مزید چاشنی پیدا ہوئی ہے۔

کیوں اکڑ کو بیٹھا ہے دلھا یہ مہماناں کے بیچ — زر کے تاراں دس رہے ہیں سہرے کے لڑیاں کے بیچ
مرزاں پلی کی ہیں ٹھیسن سے اتر جاتیں تمام — لوگاں پو لوگاں ہیں آتیں بیٹھ کو بنڈیاں کے بیچ
دیکھ کو مکھڑے کو دولھا بولیا دولن سے یہ بات — اب رہا پرواج نیں ہمنا اور تمناں کے بیچ
ایسا گاؤں اور ایسی بستی آج تلک کا نیں دسی — ہم بھی آخر پھر کو آئیں بھوت سے گاواں کے بیچ
ایک سے ایک ہے نوادر آکو شاعر آج یاں — تلے منڈی مار کو بیٹی ہیں سب فکراں کے بیچ
تونے کاسم صاب نیں مانیا علی صاحب کی بات — لکھنا چھوڑیا پڑھنا چھوڑیا پڑھ گیا بھٹیاں کے بیچ
منجے سب لوگاں ہیں بولیا کرئے رحیم صاب میاں — کیوں کہ مضموناں میں پھڑکاتا ہوں اشعاراں کے بیچ

رخصتی بھی ایک صنف شاعری ہے جس میں شمالی ہند کے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔حیدرآباد کے موقر روزنامہ سیاست کے مدیر اعلیٰ جناب عابد علی خاں صاحب مرحوم

کی صاحبزادی کی رخصتی کے موقع پر بیکل اتساہی نے رخصتی لکھی تھی۔

گیت:۔

گیت ہندی الاصل صنفِ سخن ہے۔ اِس کی کوئی ہئیت مخصوص نہیں رہی اس لئے یہ صنف نہ اپنے موضوع سے پہچانی جاتی ہے نہ کسی ہئیت سے بلکہ اسکی شناخت اس کی مخصوص تمدنی تہذیبی مزاج سے ہوتی ہے۔[1]

حیدرآبادی شعراء نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

[1] درسِ بلاغت تالیف ترقی اردو بیرو نئی دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۴۵

آزادی کے بعد حیدرآباد کے روایت پرست، ترقی پسند اور جدیدیت کے علمبردار شعراء

آصفِ سابع:

آصفِ سابع کی غزلیات کو پانچ دیوانوں میں مرتب کر کے ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۶ء میں دیوانِ آصفِ سابع کے نام سے شائع کروایا گیا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ''وسیلۂ نجات'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ سارے دیوان سالار جنگ لائبریری میں موجود ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں نظام ٹرسٹ کی جانب سے ''انتخابِ کلام آصفِ سابع'' شائع کروایا گیا۔ وہ روایتی شاعری کے محافظ اور پاسدار تھے۔ انکو فصاحت جنگ جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ انہوں نے اردو شاعری کی تقریباً سارے اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ حمد، نعت، منقبت اور غزل سے پہلے اکثر ایک قطعہ لکھا کرتے تھے۔ اپنی شاعری کے تعلق سے انہوں نے کہا ؎

الگ سب سے میرا رنگِ مشرب اے عثمانؔ　　مرید شیخ کا ہوں میں نہ بادہ خواروں کا

ان کی شاعری میں دبستانِ لکھنؤ کا رنگ بھی واضح نظر آتا ہے ؎

کسی نے دستِ حنائی سے پونچھ کر آنسو　　لگادی آگ میری اشک بار آنکھوں میں

انہوں نے اپنے کلام میں بعض الفاظ کو مسلسل استعمال کر کے انہیں ایک خاص معنی عطا کیے مثلاً خمِ غدیر، نجف، بوتراب، طٰہٰ، صدف، خمر، گلاب اور میخانہ وغیرہ۔

سقوطِ حیدرآباد کے بعد اقتدار سے سبکدوش کردئے جانے پر ان کے احساسات اور تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

کس نے ملایا بادہ میں سم کچھ نہ پوچھیے　　کیا کیا ہوئے ہیں ہم پہ ستم کچھ نہ پوچھیے

☆☆☆☆

نہ مئے رہی نہ وہ صحبت نہ یار باقی　　فلک کے جور سے سب لطف مٹ گئے عثماںؔ

امجدؔ حیدرآبادی:

امجدؔ حیدرآبادی بے بدل رباعی گو شاعر تھے۔ ان کے کلام سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ انکے کلام میں کیفیت اور اثر دونوں موجود ہیں۔ یوں تو امجدؔ حیدرآبادی نے اردو شاعری کی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن رباعیات لکھنے میں ان کا نہ کوئی ہمسر ہے نہ کوئی ثانی، اور اس فن میں وہ ''امام الفن'' کے درجہ پر فائز ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر رباعیات کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے۔ ان کی رباعیات میں عرفان، عشق، مذہب، فلسفہ اور اخلاق کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری قدیم دبستانِ اردو کا سلسلہ ہے۔ ان کی توجہ خاص سے آر۔ آر۔ سکینہ الہامؔ، دامودر ذکیؔ اور رگھویندر راؤ جذبؔ کی رباعی گوئی میں خاص نکھار پیدا ہوا۔ ذیل میں صوفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ان کی رباعی ملاحظہ ہو ۔

کس متن کی تفسیر ہوں معلوم نہیں　　کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں
صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں　　میں ہوں کہ مرے پردہ میں ہے اور کوئی

صفیؔ اورنگ آبادی:

صفیؔ اورنگ آبادی ارضِ دکن کے منفرد لہجہ کے شاعر گذرے ہیں۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ ابتداء میں اپنے والد حکیم منیر الدین کو اپنا کلام دکھاتے اور ان سے صلاح لیتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ضیاء گورگانی اور ظہور دہلوی سے استفادہ کیا ان کو داغؔ دہلوی سے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ داغؔ دہلوی کے انتقال کے بعد وہ کیفیؔ سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ قدیم دبستانِ شاعری کے وہ پاسدار تھے۔ اپنے کلام میں دکنی محاوروں کو دلکش انداز میں استعمال کرنے کیلئے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی لاابالی طبیعت کی وجہ سے انکا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے ۔

شائع جو آج تک مرا دیواں نہ ہو سکا　　میرے جنوں ہی کا نتیجہ ہے اے صفیؔ

انہوں نے اپنے شعری مجموعے "پراگندہ" پر کہا ہے۔

یہ "پراگندہ" ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی — میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

قدیم روایات کی انہوں نے اپنے کلام میں پاسداری کی ہے۔ انہوں نے دکنی محاوروں کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا اور اسطرح دکن کی عام بول چال کی زبان، محاورات اور استعارات کو مستند بنا دیا۔ ان کے کلام میں روایتی غزل کے سارے لوازمات ملتے ہیں۔ اسکے علاوہ انہوں نے شاعری میں دنیا کی بے ثباتی اور پند و نصائح کا احاطہ کیا ہے۔

حیرتؔ بدایونی :

حیرتؔ بدایونی کا شمار عصرِ حاضر کے استادانِ سخن میں ہوتا ہے۔ شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں صنائع اور بدائع تشبیہات، مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل اور بیشتر صنعتوں کا استعمال کر کے غزل کو مرصع بنایا۔ ان کا کلام ہر رنگ میں ملتا ہے۔ لیکن ان کا اپنا کوئی خاص رنگ نہیں تھا۔ ان کے شعری مجموعہ میں غزلوں کی ابتداء میں بحر اور اوزان لکھ دیئے گئے ہیں جس سے اس فن سے ناواقف لوگوں کو بھی ایک گونہ معلومات ہو سکتی ہیں۔ ان کی شاعری قدیم دبستانِ اردو کا سلسلہ ہے۔ انہوں نے غزل کے روایتی انداز میں محبوب کی شوخی کا ذکر کیا ہے۔

وقت جاتا ہے تو پھر لوٹ کے آتا ہی نہیں — بے وفا دیکھ نہ جا ٹھہر بھی جا آج کی رات

ابوزاہد سید یحییٰ حسینی قدرؔ عریضی :

ابوزاہد سید یحییٰ حسینی قدرؔ عریضی کو سید احمد علی زیرکؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ زیرکؔ قنوجی کا اپنے تلامذہ کو اصلاحِ کلام دینے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شعر و سخن کے تعلق سے معائب و محاسن کی برمحل تفہیم کرتے۔ مشقِ سخن کیلئے ہفتہ میں ایک بار اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد کرتے۔ کسی معروف شاعر کے دیوان سے ایسا پیش مصرعہ لیا جاتا جس میں قافیہ اور ردیف موجود ہوں۔ وہ اپنے تلامذہ کے اشعار کی برسرِ موقع اصلاح کیا کرتے تھے۔ اس طرح قلیل عرصے میں ان کے تلامذہ پرگو شاعر بن گئے۔ زیرکؔ قنوجی کے وصال کے بعد قدرؔ

عریضی نے نادر علی برتر سے فیضِ تلمذ حاصل کیا۔ انہوں نے علمِ عروض کی تعلیم ضامن کنتوری سے حاصل کی۔

قدر عریضی نے رباعی کے احیاء و ترویج کے لئے ادارۂ قدرِ ادب قائم کیا جو اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا جہاں پر صرف دوبیتی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ذیل میں روایتی شاعری کے اس پاسدار شاعر کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

دل میں درد آنکھوں میں آنسو لب پہ آہ رہ گیا ہے اب یہ سامانِ حیات

☆☆☆☆

کہو بندہ پرور ہو کس سوچ میں ابھی کیا کوئی امتحاں رہ گیا

الحاج مرزا شکور بیگ:

مرزا شکور بیگ کا شمار حیدرآباد کے روایتی شاعری کے ہمنواؤں میں ہوتا ہے۔ وہ طبعاً ظریف واقع ہوئے تھے۔ ان کی ظریفانہ شاعری سے اکبرالہ آبادی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ طنز اور مزاح کے پیرائے میں معاشرہ کی اصلاح انکا مقصد تھا۔ ان کی شاعری کا محور پند و نصائح اور حبِ نبوی رہا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

یہی زندہ دلی کا راز ہے مرزا کہ اپنوں کی بھلائی یاد رکھتا ہوں، برائی بھول جاتا ہوں

☆☆☆☆

دید کے قابل ہے ہمدم یہ تضادِ قول و فعل امن کا پرچار بھی جاری ہے بمباری کیساتھ

ان کے شعری مجموعے، منتخب مضامین اور انکا نعتیہ کلام ''خوشبوئے درد'' منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع:

شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع فطرتاً نکتہ رس، شگفتہ دماغ، لطیف اور موزوں مزاج واقع ہوئے تھے۔ علامہ نجم آفندی سے ان کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ وہ روایت پسند شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سلاست، شگفتگی اور نغمگی پائی جاتی ہے ان کو علمِ عروض پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں دنیا کی بے ثباتی، انقلاباتِ زمانہ، ہجر و فراق اور حسن و عشق

کی حکایتوں کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے چھوٹی بحر میں بہت ساری غزلیں رقم کی ہیں۔ان کی غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہت ان کے نقشِ قدم یاد آئے　　آج تنہا چمن میں گئے تھے انجیمؔ

☆☆☆☆

زندگی کی حقیقت نظر آگئی　　جو کلی مسکرائی وہ مرجھا گئی

☆☆☆☆

اور بھی ہر طرف تیرگی چھا گئی　　جب سویرا ہوا تیرے جانے کے بعد

☆☆☆☆

آج مہمان بنے بیٹھے ہیں　　کل اس گھر کے مکیں ہم تھے انجیمؔ

☆☆☆☆

سیرِ گلشن کو وہ جب تنہا گئے　　خود بہاریں ہوگئی حیراں انجیمؔ

علامہ رشید ترابی:

علامہ رشید ترابی بے مثل خطیب اور صاحب طرز شاعر تھے ان کا شعری مجموعہ ''شاہِ مرداں'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ان کو علی حیدر نظم طباطبائی سے تلمذ حاصل تھا۔غزل انکی پسندیدہ صنفِ سخن رہی ہے۔وہ روایت پسند شاعر تھے۔انہوں نے اپنے کلام میں سارے فنی لوازمات کو ملحوظ رکھا ہے۔علامہ اقبالؔ نے جب ''شکوہ'' لکھا تو ملک بھر میں دھوم مچ گئی۔رشید ترابی نے سب سے پہلے ''جوابِ شکوہ'' لکھا جو ۱۳۵۲ھ میں منظرِ عام پر آیا۔اس کے بعد علامہ اقبالؔ نے ''جوابِ شکوہ'' لکھا۔علامہ رشید ترابی کے کلام میں سلاست، شگفتگی، نغمگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ذیل میں ان کے جوابِ شکوہ کا ایک بند درج کیا جاتا ہے۔

صاف غیروں سے ملی جاتی ہیں راہیں تیری　　ہم خوشی چاہیں تو کس طرح سے چاہیں تیری
وقفِ رنج و غمِ دنیا ہوئیں آہیں تیری　　دل کہیں اور ادھر کو ہیں نگاہیں تیری
تجھ میں اگلی سی محبت نہیں وہ بات نہیں

پھر یہ کہتا ہے کہ، پہلی سی مدارات نہیں

سکندر علی وجؔد:

سراؔج اور ولؔی کی سرزمین اورنگ آباد سے سکندر علی وجؔد کا تعلق ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

دو سو برس میں وجد، سراؔج و ولؔی کے بعد　　اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

سکندر علی وجد نے قدیم دبستانِ شاعری کی روایات اور نظم کو جمالیاتی احساس دیا۔ انہوں نے اپنے شعری سرمائے کو فکر و نظر کی وسعتوں سے مالا مال کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے اور ساتھ ساتھ انہوں نے سماجی مسائل کا بھی اپنی شاعری میں احاطہ کیا۔ وجؔد کی شاعری اپنے دور کے سارے تقاضوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ان کی شاعری کسی بھی ازم سے متاثر نہیں ہے۔

الفاظ کے ذریعہ تصویر بنانا انکا وصفِ خاص ہے جس کو پیکر تراشی کہتے ہیں۔ سکندر علی وجؔد نے جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اس کے مزدوروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جنہوں نے اس تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے　　کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

تاج محل فن کا شاہکار ہے۔ عجائباتِ عالم میں اسکا شمار ہوتا ہے۔ تاج کے تعلق سے وجؔد کے احساسات ملاحظہ ہوں۔

جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا　　الفت کا خواب، قالب مرمر میں ڈھل گیا

سکندر علی وجد کے پانچ شعری مجموعے منصۂ شہور پر آچکے ہیں۔ ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے انہیں ۱۹۷۰ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا۔

اوؔج یعقوبی:

اوج یعقوبی نہ صرف منفرد لہجہ کے شاعر تھے بلکہ وہ شاعر گر بھی تھے صفؔی کی طرح انہوں نے بھی دکنی محاوروں کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کر کے محاوروں

کو معتبر بنایا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفؔی اورنگ آبادی کی شاعرانہ روایتوں کو انہوں نے زندگی بخشی۔ گو اوج یعقوبی کا تعلق قدیم دبستانِ شاعری سے ہے لیکن انہوں نے حسن و عشق، ہجر و فراق اور گل و بلبل کی حکایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید رجحانات اور مسائل کو بھی اپنے پیشِ نظر رکھا۔ سماجی مسائل پر انہوں نے بھرپور توجہ دی اور وہ مسائلی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اوج یعقوبی کے تین مجموعے کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام ''اوجِ عرش'' نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل ہے۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

وارثِ میکدہ ہم جو موجود تھے　　کیوں کرائے کے ساقی بلائے گئے

☆☆☆

رخ ہواؤں کے بدلتے نہیں لگتی دیر　　ڈوب جاتے ہیں سفینے کبھی ساحل کے قریب

☆☆☆

زندگی کے میداں میں کاش آپ ڈٹ جاتے　　حادثوں میں دم کتنا راستے سے ہٹ جاتے

☆☆☆

انسان میں بلندی کردار چاہیئے　　پابندِ وضع ہو تو غریبی وقار ہے

سعید شہیدی :

سعید شہیدی نے ادبی، علمی اور شعری ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کو میر محمد علی سرور سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ قدیم دبستانِ اردو کے پاسدار تھے۔ انہوں نے برق اور آشیانے کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری کے تعلق سے عاشور کاظمی رقم طراز ہیں۔ ''میری نظر میں سعید شہیدی غزل کے روایات کے تسلسل کا نام ہے۔'' ان کی غزلوں کے چند اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

زبان کا لطف نہ آجائے تو میرا ذمہ　　غزل سعید کی تو نے سنی نہیں اے دوست

☆☆☆

ہم اگر گلستاں میں آشیاں بناتے ہیں　　بجلیاں بھی گرتی ہیں زلزلے بھی آتے ہیں

☆☆☆

کبھی چڑھتے ہوئے دریا پہ ہنسی آتی ہے　　کبھی ٹوٹی ہوئی کشتی پر ترس آتا ہے

☆☆☆

آنکھ اُن کی بھی نم ہو گئی　　آج انتہائے غم ہو گئی

تہنیت النساء بیگم تہنیتؔ:

قدیم دبستانِ اردو کی پاسدار شاعرہ تہنیت النساء بیگم تہنیتؔ ڈاکٹر سید قادر محی الدین زورؔ کی اہلیہ تھیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی اصناف حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غلام داخلِ خلدِ بریں ہوئے ہوں گے　　نبیؐ کی مدح سرائی میں تہنیتؔ کتنے

☆☆☆

دن ہیں اب تیرے حاضری کے قریب　　تہنیتؔ ہجر میں ملول نہ ہو

بشیر النساء بیگم بشیرؔ:

بشیر النساء بیگم بشیرؔ کی آنکھ ادبی اور علمی ماحول میں کھلی۔ اِن کے تعلق سے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کہا تھا: ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے۔'' وہ روایتی شاعری کی پاسدار تھیں۔ انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی نظموں میں زیادہ نکھار نظر آتا ہے۔ انہوں نے غزلِ مسلسل لکھی ہے جن کو موضوع دے دیا جائے تو وہ موضوعاتی نظمیں کہلائی جا سکتی ہیں۔ صادق حسین غبارؔ، علی حیدر طباطبائی اور ابوظفر عبدالواحد ان کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''آبگینۂ شعر'' ۱۹۴۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ علامہ اقبالؔ سے ان کو والہانہ عقیدت اور روحانی وابستگی تھی۔ علامہ اقبالؔ کی رحلت پر ان کے احساسات ملاحظہ ہوں۔

تو سو گیا تو اب وہ ہوشیار ہو رہی ہے　　اقبالؔ تیری قوم بیدار ہو رہی ہے

اُٹھ دیکھ جوش تیرا ہر دل میں رونما ہے

قلب ونظر کی دولت اک آہِ صبح گاہی ‏ ‏ فقرِ غیور سے ہے پیدا جلالِ شاہی

مردِ فقیر ''شاہی مسجد'' جگا رہا ہے

وہ سیاسی بصیرت کی حامل تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے غیر یقینی سیاسی حالات سے متاثر ہوکر ''امید وبیم'' نظم تحریر کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا خبر صورت امروز کا کیا ہو انجام ‏ ‏ کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام

لیکن اتنا تو سمجھ سکتے ہیں اربابِ نظر ‏ ‏ زندگی عین دوراہے پہ کھڑی ہے ششدر

صبح نو زندگی کی پیامی ہوگی ‏ ‏ یا تو پھر اور بھی مضبوط غلامی ہوگی

ڈاکٹر علی احمد جلیلی:

استادِ سخن فصاحت جنگ جلیلؔ کے صاحبزادے ہیں۔ جلیل منزل جو ڈاکٹر جلیلی کا پیدائشی مقام ہے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کا حسین امتزاج کا مرکز رہا ہے۔ جہاں شعر وسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ نکاتِ شعر کے تجزیے کئے جاتے اور فن کے تعلق سے درس دیا جاتا تھا۔ ایسے شاعرانہ اورادبی ماحول میں انہوں نے پرورش پائی۔ انکی شاعری کے متعدد شعری مجموعوں کے علاوہ انکے تنقیدی مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ وہ روایتی شاعری کے پاسدار ہیں وہ کسی تحریک یارجحان سے متاثر نہیں ہوئے لیکن ان تحریکات اور رجحانات کی وجہ سے انکے ہاں موضوعات کا تنوع ضرور پیدا ہوااور انہوں نے اپنی شاعری میں عصری حسیت کا احاطہ کیا۔ اُن کے کلام میں قدیم دبستان اور جدید فکر ولہجہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ چند اشعار ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

وہ ترے خشک لبوں پر سکوتِ مجبوری ‏ ‏ وہ میری بھیگی نگاہوں میں حرفِ مجبوری

☆☆☆

فائدہ یہ بھی علی اک ہے غزل گوئی کا ‏ ‏ دردِ دل اس میں سلیقہ سے ادا ہوتا ہے

☆☆☆

یہ کیسی بزم میں ہم آج لائے جاتے ہیں ‏ ‏ جہاں چراغ نہیں دل جلائے جاتے ہیں

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید:

ڈاکٹر بانو طاہر سعید کی شاعری خیالات کی فراوانی، مشاہدات کی گہرائی اور جذبات کی تروتازگی پر مشتمل ہے۔ان کی شاعری روایتی شاعری کی پاسدار ہے لیکن ترقی پسند تحریک سے متاثر بھی ہے۔اس امتزاج سے ان کی شاعری جدید شاعری کا نمونہ نظر آتی ہے۔انہوں نے غزل، پابند نظم، آزاد نظم، معرئ نظم، نثری نظم رباعی کے علاوہ ہائیکو، سانیٹ اور قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے متعدد مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔چند اشعار جو ذیل میں درج ہیں ملاحظہ ہوں۔

اُن کے ہونٹوں پہ مسکراتی ہے مسکراہٹ ہزار پھولوں کی

☆☆☆

طاہرہ کتنا ہے وہ بدبخت انساں زر ملا، زور ملا، درد کی دولت نہ ملی

خواجہ شوقؔ:

خواجہ شوقؔ روایتی شاعری کے پاسدار شعراء میں استادانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ان کا مجموعہ کلام ''چشم نگراں'' ۱۹۸۴ء میں اور ان کی نعتوں، سلام اور منقبتوں کا مجموعہ ''صلِ علیٰ'' ۱۹۹۵ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔گسٹ ۲۰۰۰ء میں مخدوم ادبی ایوارڈ سے بھی ان کو نوازا گیا۔ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شوقؔ آنسو ہی زبانِ غم و آلام نہیں کچھ تبسم بھی یہ مفہوم ادا کرتے ہیں

☆☆☆☆

جہدِ پیہم کے سوا کیا ہے ہمارا جینا ایک طوفاں سے چلے دوسرے طوفاں کی طرف

☆☆☆

ان کے اندازِ کرم خاص ہوا کرتے ہیں دل بڑھانا ہو تو دل توڑ دیا کرتے ہیں

☆☆☆

کسی آئین کی پابند نہیں دین اُن کی چاہتے ہیں تو خطاؤں پہ عطا کرتے ہیں

صلاح الدین نیرؔ:

صلاح الدین نیر حیدرآباد کے مشہور شاعر، نثر نگار اور صحافی ہیں۔ان کو استادِ سخن

اوج یعقوبی سے تلمذ حاصل ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی تقریباً ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ صلاح الدین نیر روایتی شاعری کے پاسدار ہیں۔ اُن کے کلام میں عصرِ حاضر کا کرب، فرقہ وارانہ فسادات کے تذکرے، حسن وعشق کی حکایتیں اور حالات کے تقاضوں کے تحت نقلِ مکانی کا سلسلہ یہ سب کچھ ملتا ہے۔ انہوں نے نعتِ شریف بھی بہت ڈوب کر لکھا ہے۔ انکے ہاں علامتی شاعری بھی ملتی ہے۔ انکے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو اُن خاک نشینوں سے ملادے یارب جو محمدؐ کی نگاہوں میں رہا کرتے ہیں

☆☆☆☆

کیا کروں جا کے میں انصاف کے دروازے پر والئِ شہر بھی بیٹھا ہے گنہگاروں میں

☆☆☆☆

اک نئی صبح ضرور آئے گی اک دن نیر اپنی آواز کہاں قید ہے دیواروں میں

☆☆☆☆

میرے ہاتھوں سے قلم چھین کر اعزاز نہ دو ایسی بخشش بھی تو ایک طرح کی خیرات ہوتی ہے

رئیس اختر:

رئیس اختر حیدرآباد کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ جو قدیم دبستانِ اردو کی شاعری کے پاسدار ہیں۔ انہوں نے غزل کے متعلقہ الفاظ کو اس احتیاط کے ساتھ شاعری میں شامل کیا ہے کہ غزل کے مزاج کا بانکپن قائم رہتا ہے۔ انہوں نے متعدد مشاعرے ملک اور بیرونی ملک پڑھے ہیں۔ ان کا کلام جتنا حسین ہے ان کا ترنم بھی اُتنا ہی دلکش ہے۔ ۲۵ برس سے شنکر جی کل ہند مشاعرہ کے آغاز کی ذمہ داری ان ہی کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو دعائیں دو کہ گھر اپنا جلا دیا ورنہ تمھارے شہر میں تھی روشنی کہاں

☆☆☆☆

آپ کیوں رہتے ہیں مجھ جیسے گنہگار کے ساتھ کون سا رشتہ ہے گرتی ہوئی دیوار کے ساتھ

☆☆☆☆

عمر بھر ساتھ تو میرا دیتی رہی کس طرح تجھ کو اے بے کسی بیچ دوں

حلمی آفندی:

حلمی آفندی کو حیدرآبادی لوگ شاعرِ قوم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ روایتی شاعری کے پاسدار تھے۔ ان کو حکیم عابد علی غیور سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ اپنے ہم عصر شعراء میں صفؔی اورنگ آبادی سے زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے معاشرہ کی خرابیوں، حالاتِ حاضرہ کا کرب اور اسوۂ نبیؐ کے علاوہ اہلبیت اطہار کی مدحت میں گلفشانی کی ہے۔ ذیل میں ان کا ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

حیدرؓ اٹھا رہے ہیں جنازہ رسولؐ کا　　ماتم سرا بنا ہے مدینہ رسولؐ کا
سر کو جھکائے روتی ہے بابا کی سوگوار　　زہرہؓ کی موت ہوگئی مرنا رسولؐ کا

رحمن جامی:

حیدرآباد کے پر گو شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ یوروپی ممالک سے درآئی ہوئی اصناف مثلاً سانیٹ، ماہئیے، ہائیکو وغیرہ میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''خودنوشت''، ''سوانح عمری''، یہ جہانِ رنگ و بو''، ''پیوند'' کہانیوں کا مجموعہ اور ''نکاتِ ہنر'' جو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے شائع ہو کر منظرعام پر آچکے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

دریا چڑھا ہوا تھا مگر عزم تھا میرا　　کشتی میری حیات کی جو پار اتر گئی

ان شعراء کے علاوہ طالب رزاقی، شمس الدین تاباں، فیض الحسن خیال، عظمت عبدالقیوم، حکیم خورشید حسین مضطر، سہیل آفندی، یوسف یکتا، صاحبزادہ میر برہان علی خاں کلیم، حمید رونق، بشیر امجد، ناصر کرنولی اور مومن خاں شوق وغیرہ بھی حیدرآباد کے نامور روایت پسند شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں
عثماؔن آصفِ سابع

آصفِ سابع کی ولادت ۵/اپریل ۱۸۸۶ء کو پرانی حویلی میں ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت پرانے مشرقی طریقے پر ہوئی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ دینی و عربی تعلیم کے لئے، عماد الملک اور آغا حیدر علی شوشتری فارسی تعلیم کے لئے، مسٹر ایجرٹن انگریزی کے لئے اور فنونِ سپہ گری اور شہ سواری کے لئے افسر الملک مقرر کئے گئے تھے۔ آصفِ سابع کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا اردو اور فارسی میں انکے دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا۔[1]

آصف سابع نے اپنی غزلیات کو پانچ دیوانوں میں ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۶ء میں مرتب کیا جو دیوانِ آصفِ سابع نظام حیدرآباد کے نام سے شائع کئے گئے۔ اسی سلسلے میں ان کے نعتوں کا مجموعہ ''وسیلۂ نجات'' کے نام سے شائع کروایا گیا۔ یہ دیوان بڑے آب و تاب سے شائع ہوئے تھے جو سالار جنگ لائبریری میں موجود ہیں اس کے علاوہ آصفِ سابع کے انتقال کے آٹھ سال بعد نظام ٹرسٹ کی جانب سے ''انتخاب کلام آصفِ سابع'' جو اردو اور فارسی قطعات و غزلیات پر مشتمل ہے، ۱۹۷۵ء میں شائع کروایا گیا۔ آصفِ سابع نہ صرف سخن فہم تھے بلکہ نامور سخندان بھی تھے۔ وہ روایتی شاعری کے امین تھے اور روایتی شاعری کے محافظ اور پاسدار کی حیثیت سے ان کا نام یاد رکھا جائیگا۔ ان کے کلام میں تشبیہ و استعارہ، محاورہ اور زبان و بیان کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں جن کی مندرجہ ذیل اشعار سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔

---

[1] آصفِ سابع میر عثمان علی خاں اور انکا عہد از طیبہ بیگم تاریخ اشاعت نومبر ۱۹۳۰ء صفحہ نمبر ۳۷

نیا یہ ڈھنگ نکالا میری عیادت کا ۔۔۔ وہ دیکھ کے میرے زخموں کو مسکراتے ہیں
مئے گلرنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں ۔۔۔ بند کی ہے میرے ساقی نے پری شیشے میں
بات میں بات کیا نکالی ہے ۔۔۔ اس کی جو بات ہے نرالی ہے
رخسار و چشمِ یار کی تصویر دیکھنا ۔۔۔ نرگس کے پھول باندھ دےئے ہیں گلاب میں
اس قدر کھب گئی آنکھوں میں یہ صورت تیری ۔۔۔ اب کسی کو بھی نہ ہم تیرے سوا دیکھیں گے
تیری نظر سے تیرا مُدّعا سمجھتے ہیں ۔۔۔ نظر شناس تیری ہر ادا سمجھتے ہیں

یوں تو ۱۸۸۴ء میں آصفِ سادس نے اردو کو حیدر آباد کی سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا لیکن عہد عثمانی میں اردو بڑی تیزی سے ارتقائی منازل طئے کرنے لگی آصفِ سابع ۱۹۱۱ء میں تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہوئے ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ دارالترجمہ کی شروعات ہوچکی تھی ملک کے ممتاز شعراء، ادباء اور دانشوروں کو تراجم اور اصطلاحات کی وضع اور تدوین کے لئے ملک کے کونے کونے سے دارالترجمہ میں اکٹھا کیا گیا جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق' جوش ملیح آبادی اور عبداللہ عمادی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دارالترجمہ نے بے شمار علمی اور فنی اصطلاحات کو وضع کیا جس کی وجہ سے مختلف علوم وفنون کے علاوہ طِب' انجینئرنگ قانون اور علاج ومعالجہ کی کتابوں کے اردو میں ترجمے پیش کر کے اردو کو ایک علمی زبان کا درجہ حاصل ہوا جو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کا مرہون منت ہے۔ اردو زبان علوم وفنون کی کتابوں سے مالا مال ہوتی گئی۔ دائرۃ المعارف کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یہ تمام کارنامے آصفِ سابع کے دورِ حکومت کی یادگار رہیں۔

آصفِ سابع کو فصاحت جنگ جلیؔل سے تلمذ حاصل تھا۔ آصفِ سابع نے اردو شاعری کی تقریباً سارے اصناف حمد' نعت' منقبت' سلام اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ بالعموم حمد' نعت' منقبت اور غزل سے پہلے آصف سابع ایک قطعہ لکھا کرتے تھے۔ آصفِ سابع اپنی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں۔

الگ ہے سب سے میرا رنگِ مشرب اے عثماں ۔۔۔ مرید شیخ کا ہوں میں نہ بادہ خواروں کا

ذیل میں حمد ونعتِ شریف کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جو ایک قطعہ کے

ساتھ حسب طریق آصف سابع نے موزوں کیا ہے۔

قطعہ

مست نگاہِ ناز ہوں ساقی بے نیاز کا قبلہ گیا ہوں بھول میں رخ ہو کدھر نماز کا
دل کا نظارۂ حرم حدِ نظر ہے اے خدا سُرمہ نصیبِ چشم ہو گردِ رہ حجاز کا

حمد و نعتِ شریف

دل کو خدا نے اپنی محبت سے بھر دیا تسبیح کو زباں دی سجدے کو سر دیا
نازاں ہیں اس ادا پہ غلامانِ مصطفیٰؐ ہم کو دیارِ سولؐ تو خیر البشر دیا
ہر درد، ہر بلا سے بچانے کے واسطے تاثیر دی دعا میں دوا میں اثر دیا
گو میں گناہ گار تھا لیکن زہے نصیب رحمت نے ہر گناہ سے مجھے پاک کر دیا
عثماں یہ اس کا فضل ہے تجھ پر کہ بے سوال
نعمت سے اپنی دامنِ مقصود بھر دیا[1]

ذیل میں آصفِ سابع کی ایک غزل درج کی جارہی ہے حسب طریق انہوں نے غزل سے پہلے ایک قطعہ موزوں کیا ہے۔ آصفِ سابع کو حضرت علیؓ سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ محبت تھی جس کا قطعہ اور غزل میں بھی اظہار ہوتا ہے۔

قطعہ

پانچ حرفوں سے نگینہ بن گیا رفتہ رفتہ دیکھ زینہ بن گیا
خواب گاہِ احمدؐ مرسل ہے یہ واسطے دیں کے مدینہ بن گیا

غزل

علیؓ کی معنوی پیغمبری سمجھا تو میں سمجھا وفورِ عشق کی وارفتگی سمجھا تو میں سمجھا
نہیں آساں کہ واقف ہو کوئی اس رازِ پنہاں سے کہ دنیا میں مقامِ آدمی سمجھا تو میں سمجھا
سمجھنے میں صبا قاصر رہی کیا راز ہے اس میں ہنسی غنچوں کی گلشن میں کوئی سمجھا تو میں سمجھا

[1] انتخابِ کلام آصفِ سابع قطعات و غزلیات اردو و فارسی ۱۹۷۵ء صفحہ نمبر ۱

عجب ہے نور اس بابِ خراساں کی تجلی میں — شعاعِ شمس کی ہی روشنی سمجھا تو میں سمجھا
مٹا کر آپ کو عثمانؔ یہی کہتا ہے ہر اک سے — کوئی شاہِ نجف کی بندگی سمجھا تو میں سمجھا[1]

آصف سابع کی شخصیت میں کسر نفسی ہر لحاظ سے دولت وحشمت کی چوکھٹ پر فقیرانہ شان رکھتی تھی۔

تمہاری عمر یوں ہی رائیگاں گذری ہے اے عثماںؔ — نہ تم کو دستِ غیب آیا نہ تم کو کیمیاء آئی[2]

شعر کو عام طور پر دلی احساسات وجذبات کا وسیلہ بتایا جاتا ہے۔ دبی زبان میں آصف سابع کہتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں اس سے کہوں حالِ دل مگر — اظہارِ عشق لب پہ میرے آکے رہ گیا

اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ یہ کہتے ہیں۔

یہ حالت اپنے دل کی ہم سے اب دیکھی نہیں جاتی — تڑپنا' لوٹنا اور اس طرح مجبور ہو جانا

ذیل کے اشعار میں داغ دہلوی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

الٰہی خیر ہو بدلے ہوئے ہیں یار کے تیور — ستم آیا، غضب آیا، بلا آئی، فضاء آئی
بسر ہوئی تری رات کس کی محفل میں — یہ نیند کا ہے جواب تک خمار آنکھوں میں
ہماری جان گئی تیری دل لگی ٹھہری — سکھایا کس نے ادا کو تیری قضاء ہونا
شوخی بھی ہے، ادا بھی ہے شرم وحجاب بھی — کیا کیا بھرے ہیں سحر تمہاری نگاہ میں
نازو ادا سے آپ کا آنا تو دیکھیے — تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں

آصفِ سابع غزل گوئی میں وارداتِ قلب، اپنی خوشیاں، اپنے غم، اپنے اندیشے، اپنی محرومیاں، اپنا فلسفہ حیات اور دلی کیفیاتِ عشق ومحبت انتہائی شائستہ اور شریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

فرشِ زمیں پہ گرتے ہی دی اشک نے صدا — ایسی جگہ نہ جائیے جہاں آبرو نہ ہو

آصفِ سابع کی نظر کائنات اور انقلابات زمانہ پر کافی گہری تھی چنانچہ کہتے ہیں۔

کونسا دل ہے جس میں ذرد وغم نہیں — دیدۂ نرگس کو دیکھو باغ میں پرنم نہیں
دینے والا جسکو چاہے بخشتا ہے بے حساب — جود میں، لطف وادا میں اس کے بیش وکم نہیں

---

[1] انتخاب کلام آصفِ سابع قطعات در کلیات اردو وفارسی ۱۹۷۵ء صفحہ نمبر ۴۹
[2] " " " " ۱۲۶

ربِّ ذوالجلال کے عفو وکرم پر ان کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں چنانچہ اپنی خطا کاری پر رب کی عطا کے بارے میں کہتے ہیں۔

رحمت سے اس کی ہوگئی میری نجات گو میں گناہگار سراپا قصور تھا

آصف سابع کو فکر عقبٰی کا بھی پاس ولحاظ تھا اور وہ مذہبی خیالات کی پاسداری کرتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

ہر وقت ہے عثماں مجھے عقبٰی کا تصور جانا ہے پلٹ کر وہیں آئے ہیں جہاں سے

آصف سابع کو اہل بیت اطہار سے خاص لگاؤ وعقیدت تھی جس کا اظہار ان کے درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

یہ کرنا عرض اے بادِ صباء سبطِ پیمبر سے کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدۂ تر سے
مولا علیؑ کے لب پہ تھا مصحف رواں دواں سیکھا انہوں نے علم خدائے قدیر سے
آنکھ روتی ہے شہید کربلا کے واسطے دل تڑپتا ہے اسیرانِ کربلا کے واسطے

حرمتِ رسولؐ کا پاکیزہ تصور ان کے اشعار میں ملتا ہے۔ دربارِ رسالت مآبؐ میں وہ عرض کرتے ہیں۔

نہ باشت جائے من جز آستانِ مصطفیؐ عثماں سرایں جاں سجدہ ایں جابندگی ایں جا قرار ایں جا

زبان کی صحت اور آراستگی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کلام میں فکر، جذبہ اور تفہیم کا عنصر کم یا برائے نام ہو، جب بھی وہ محض حسنِ بیان کے اعتبار سے دل نشین ہو جائے۔ آصفِ سابع کا کلام بھی دل نشین ہے اس طرح کلام اور صاحب کلام دونوں قابل تحسین ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

آہوں میں کچھ کمی نہ تھی داغِ عشق میں تھا یہ عجب چراغ کہ روشن ہوا میں تھا
آتا ہے تو نہ جان نکلتی ہے ہجر میں تیری طرح سے بھول گئی ہے قضاء مجھے
نازو ادا سے آپ کا آنا تو دیکھئے تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں
ہمارے عشق کا افسانہ اکثر وہ سنتے ہیں رقیبوں کی زباں سے
جوابِ چشم جاناں کیوں نہ ہو تیری زباں عثماں اِدھر جادو نگاہی ہے اُدھر جادو بیانی ہے
خدا جانے کیا کیا کرے گی نہ رسوا یہ چاہت ہماری یہ صورت تمہاری

محبت خدا جانے کیا رنگ لائے — سنا ہے تمہیں بھی خبر ہوگئی ہے
سفرِ عمر میں تیری ہی بدولت اے عشق — ہم نے ہر منزل دشوار کو آساں دیکھا
اے شیخ بحث کیجئے لیکن ادب کے ساتھ — حضرت سے آپ، آپ سے تم، تم سے تو نہ ہو
میکشو عیش اٹھالو بہار آخر ہے — جلوۂ مئے ہے چراغ سحری شیشے میں
یہ تاثیر بھی دل دکھوں کی سنو — خموشی ہی دیکھو زباں ہوگئی

صنائع و بدائع اور دوسرے تکلفات ایک زمانے میں بالخصوص دبستانِ لکھنو میں اردو شاعری کا وسیلہ نہیں بلکہ مقصد سمجھے جاتے تھے۔ آصفِ سابع کے کلام میں دبستانِ لکھنو کا رنگ بھی واضح نظر آتا ہے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

کام تونے یہ عجب غیرت شمشاد کیا — داغ لالے کو دیا سرو کو آزاد کیا
سلجھتی ہی نہیں گتھی ہمارے بختِ خفتہ کی — تری زلفِ سیہ نے بھی بلا کے پیچ ڈالے ہیں
جبینِ یار کی افشاں سے صاف ظاہر ہے — قمر کے گرد ہے ہالہ کئی ستاروں کا
کسی نے دستِ حنائی سے پونچھ کر آنسو — لگادی آگ میری اشک بار آنکھوں میں

غزل گوئی میں شعراء غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ غزل کا اختتام مقطع پر ہوتا ہے جس میں شاعر اپنے زمانے، زندگی یا اپنے بارے میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتا ہے۔ آصفِ سابع نے اپنے مقطعوں میں اپنی فکر و نظر کا اظہار کیا ہے ان کے کچھ مقطعے درج ذیل ہیں۔

عثماںؔ بھی شاعری میں بڑا نام کرگیا — گوا کہ سے اک بڑھا ہوا خلقِ خدا میں تھا
عثماںؔ طمع رہی نہ کسی بات کی مجھے — سب کچھ ہے میرے پاس خدا کا دیا ہوا
مجھے شاہد پرستی سے نہیں انکار اے عثماںؔ — نہ عابد ہوں نہ زاہد ہوں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں

آصف سابع نے اپنے کلام میں بعض الفاظ کو مسلسل استعمال کیا ہے اس طرح انہیں ایک خاص معنی عطا کئے مثلاً خم، غدیر، نجف، بوتراب، طٰہٰ، صدف، خمر، گلاب اور مئے خانہ وغیرہ آخری تاجدارِ مغلیہ بہادر شاہ ظفر اور آصفِ سابع کی زندگیوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اول الذکر کے ہاتھ سے سلطنت مغلیہ نکل گئی اور ان کو سرزمین ہندوستان سے دور رنگون میں محروس رکھا گیا اور وہیں پر انکی رحلت ہوئی۔ انکا کلام حزن و ملال، نا

امیدی و ناکامی کی عکاسی کرتا ہے ذیل میں انکے دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن　　دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بد نصیب ظفؔر دفن کے لئے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

آصف سابع جو سلطنت آصفیہ کے آخری مطلق العنان بادشاہ تھے جن کی ریاست ملک کی دیسی ریاستوں میں سب سے بڑی تھی جس کا اپنا ٹپہ' سکہ' ریلوے اور ایرلائنس تھی اقتدار سے سبکدوش کردئے گئے اور ایک عرصہ تک اپنی ہی سرزمین پر بااقتدار کے بجائے مجبور شہری کی طرح زندگی گزاری۔ ان بدلے ہوئے حالات اور اس کے اثرات کی انہوں نے اپنے اشعار میں یوں عکاسی کی ہے۔

کس نے ملایا بادہ میں سم کچھ نہ پوچھئے　　کیا کیا ہوئے ہیں ہم یہ ستم کچھ نہ پوچھئے
زمانہ کے حالات کا ہے اثر　　میری زیست مجھ پر گراں ہوگئی
فلک کے جور سے سب لطف مٹ گئے عثماںؔ　　نہ مئے رہی نہ وہ صحبت نہ یار باقی ہے

بہادر شاہ ظفر اور آصف سابع ہر دو کو ٹھمریاں لکھنے کا بھی شوق تھا شاید اس طرح کی غمناک راگوں میں ان کو پناہ لینے سے تسکین ہوتی تھی۔

یہ محسنِ اردو زبان' شاعرِ بے مثل ۲۴ رفبروی ۱۹۶۷ء کو اپنے ان مٹ یادوں کو اہل دکن کے قلب و جگر پر نقش کر کے اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ مکہ مسجد میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور مسجدِ جودی (کنگ کوٹھی) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔[1] اعلیٰ حضرت کے جلوس جنازہ کو دیکھ کر میر سرفراز علی موظف مہتمم تعلیمات نے ذیل کی رباعی موزوں کی تھی۔

پُر سکوں اک وقار طاری ہے　　کس مسیحا کی یہہ سواری ہے
مرگِ عثمان علی ہے مرگ حیات　　ایک سیلابِ اشک جاری ہے

1۔ روزنامہ "سیاست" مورخہ ۲۵ رفبروری ۱۹۶۷ء

امجد حیدرآبادی

سید احمد حسین امجد ۱۶ ر فبروری ۱۸۹۱ء کو بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ امجد حیدرآبادی چالیس دن کے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہوگئے۔[۱] بیوہ ماں محترمہ صوفیہ صاحبہ نے انتہائی نامساعد حالات میں امجد حیدرآبادی کی پرورش کی اور ان کی تعلیم والدہ ماجدہ کی شخصی دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا انکی والدہ ان سے بارہا کہا کرتی تھیں ''بیٹا اگر جینا ہوتو کچھ ہو کر جیو، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مرجاؤ'' کہا جاتا ہے کہ مشاہیر حضرات کی کامیاب زندگی کا راز یہ ہے کہ ان کے پشت پر کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ مثل امجد حیدرآبادی پر صادق آتی ہے ان کی کامیابی اور ادب کے آسمانِ شہرت پر تابناک ستارے کی طرح چمکنے میں ان کی والدہ ماجدہ کا بڑا دخل ہے۔[۲]

حضرت امجد اوائلِ عمر سے شعر کہنے لگے تھے ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ میں طغیانی کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے امجد حیدرآبادی کہتے ہیں ''میرے بچپن کے زمانے کے اردو، فارسی رباعیات آج سے تقریباً بیس برس پہلے طبع ہو چکی تھیں لیکن کامل اشاعت سے قبل اکثر جلدیں طغیانی رودِ موسیٰ ۱۳۲۶ھ میں میرے تمام خاندان کے ساتھ دریا بُرد ہوگئیں کہ ''گفتہ اند''۔[۳]

امجد حیدرآبادی صوفی منش بزرگ تھے انکی شاعری وجدانی کیفیات کی حامل ہے ملک کے نامور نقادوں نے انکے کلام پر تقریظیں اور تنقیدیں لکھی ہیں جنمیں سے چند ذیل میں درج کی جاتی ہیں جس سے امجد حیدرآبادی کے کلام کی عظمت اور ادبی وقعت کا

۱۔ مقالہ از محمد یعقوب مطیب حیدرآبادی مرتب محمد الیاس سنہ اشاعت جنوری ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۱
۲۔ " " " " " صفحہ ۴۸
۳۔ " " " " " صفحہ ۲۱

اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) مولوی عبداللہ عمادی نے لکھا کہ معراجِ سخن میں شاہد معنی کو ہرہفت میں دیکھنا ہوتو رباعیاتِ امجد کو دیکھیے۔

(۲) پروفیسر مولوی عبدالقدیر صدیقی حسرت نے لکھا کہ ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت۔[1]

(۳) پروفیسر مولوی عبدالواسع یوں رقم طراز ہیں کہ انکی ہر رباعی مضامین کا ایک دفتر ہے اور ہر مصرعہ دلکشی کا ایک بے بہا گوہر۔

(۴) مولوی جمال الدین نوری نے لکھا کہ رباعیاتِ امجد بے مثل ہیں۔

(۵) مولوی علی حیدر نظم طباطبائی نے لکھا کہ امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے۔

(۶) پروفیسر مناظر احسن گیلانی نے لکھا کہ حضرت امجد ہندوستان کے ان شعراء میں ہیں جنکو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

(۷) مولوی محب الحق (پٹنہ) نے لکھا کہ ہر رباعی ضرب المثل ہونے کے قابل ہے۔

(۸) ڈاکٹر سر اقبال نے لکھا کہ ہر رباعی قابلِ داد ہے ان رباعیات کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

(۹) مولوی عبدالماجد دریابادی نے لکھا کہ رباعیاتِ امجد معنویت کی بلندی اور طرزِ ادا دونوں حیثیت سے قابلِ داد ہیں۔

(۱۰) عظمت اللہ خاں نے لکھا کہ رباعیاتِ امجد زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہے اور بہ لحاظ ادب خیال کا بہترین نمونہ ہے۔

(۱۱) مولوی الیاس برنی نے لکھا کہ ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔

(۱۲) مولوی وحید الدین سلیم نے لکھا کہ امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں۔

(۱۳) گلستانِ امجد پر علامہ سید سلیمان ندوی نے دیباچہ لکھا جس میں حکیم الشعراء (سعدیؔ دکنی) اور سعدی شیرازی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا کہ کہنے کو تو یہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہیں مگر حقیقت میں امجد کی تصنیف ہے اس میں امجد نے سعدیؔ کے خزانے پر اس

[1] مقالہ از محمد یعقوب مطیب حیدرآبادی مرتب محمد الیاس سنہ اشاعت جنوری ۲۰۰۰ء صفحہ ۴۴

طرح قبضہ کیا کہ وہ قابض کی ملک ہوگیا۔

(۱۴) نواب نذیر جنگ بہادر نے تو کمال کردیا لکھا کہ حق تو یہ ہے

ترا دیدہ وسعدی را شنیدہ شنیدہ کہ بود مانند دیدہ [۱]

(۱۵) مخدوم محی الدین نے ۱۹۳۵ء میں ٹیگور اور انکی شاعری پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں ٹیگور کے کلام کی خصوصیات کو بتاتے ہوئے لکھا ''موہومیت ٹیگور کے کلام کی خصوصیت ہے۔ اگر ہم اردو میں ایسے شاعر کو ڈھونڈیں جس میں ٹیگور کی سی روحانیت اور اس کا سا موہوم پن پایا جاتا ہو تو ہمیں ایک شاعر ملتا ہے اور وہ امجد حیدرآبادی ہے۔ امجد اور ٹیگور کے کلام کو ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک ہی روح دو مختلف زبانوں میں ہم سے کلام کر رہی ہے امجد نے اور شعرائے اردو کی طرح ٹیگور سے متاثر ہو کر یہ رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ خود ان کا اپنا رنگ ہے۔ یہی وجہ ہیکہ انکے کلام میں کیفیت اور اثر ہے۔ امجد اور اردو کے دوسرے شعراء نے جن پر ٹیگور کے اثر کا اطلاق ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ دوسرے شعراء کا مبداء فیض ٹیگور کے اصلی کلام کا انگریزی یا اردو ترجمہ ہے برخلاف اسکے امجد کا مصدرِ فیض وہی ہے جس سے خود ٹیگور استفادہ کرتے ہیں''۔ [۲]

امجد حیدرآبادی کو مشاعرے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ جلسوں میں شرکت کرتے مختصر سی تقریر کرتے اور کوئی رباعی یا نظم سناتے، سامعین واہ واہ میں مصروف رہتے اور یہ چلے جاتے۔ شہرِ فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے یومِ ولی کے موقع پر امجد حیدرآبادی نے یہ رباعی سنائی تھی۔

اڑ جائے گا جب زاغ تو عنقا ہوگا پتھر کھد جائے گا تو ہیرا ہوگا

مر کر شیطان بھی ولی ہوتا ہے پہلے سے جو ولی ہو وہ کیا ہوگا

امجد حیدرآبادی نے ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ کی قیامت خیز تباہی پر ''قیامتِ صغریٰ'' کے عنوان سے مسدس کی شکل میں نظم لکھی جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں

گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں وہ مانگنا ہر اک کا رو رو کے دعائیں

[۱] [۲] مقالہ از محمد یعقوب مطیب حیدرآبادی مرتب محمد الیاس سنہ اشاعت جنوری ۲۰۰۰ء صفحہ ۴۴، ۴۵

پانی کا وہ زور اور دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

امجد حیدر آبادی کا مختصر خاندان جو انکی والدہ، ان کی شریکِ حیات اور ان کی شیر خوار بیٹی پر مشتمل تھا جسے طغیانی کی زد سے بچنے کے لیے نقلِ مقام کرنا پڑ رہا تھا، سیلابِ بلا نے ایسا منتشر کیا کہ پھر نہ مل سکے اس کیفیت کو امجد حیدر آبادی نے مسدس کی شکل میں یوں بیان کیا ہے۔

مادر کہیں میں کہیں با دیدۂ پر نم　　بیوی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں ''نظر آتا تھا'' تاریکی کا عالم　　کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

انسان مرجائے تو تجہیز و تکفین و تدفین عمل میں آتی ہے عام طور سے متوفی کی قبر کا نشانِ رہتا ہے پسماندگان قبر کی زیارت کر کے تسلی حاصل کر سکتے ہیں لیکن عجیب المیہ ہے کہ امجد حیدر آبادی کی والدہ، بیوی اور بیٹی سپرد سیلاب ہونے کی وجہ سے شاعر اس تسلی سے بھی محروم رہا۔ اس احساسِ محرومی کو امجد حیدر آبادی یوں منظوم کرتے ہیں۔

کس جالے میں اب ڈوبی ہوئی نعشوں کو لاؤں　　بیٹی کا پتہ کیا ہے کہاں بیوی کو پاؤں
دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں　　ہے قبر کہاں پھول کہاں جاکے چڑھاؤں
ہے ہے ہدف رنج و محن کر گئی اماں
افسوس کہ بے گور و کفن مر گئی اماں

بہرحال اس سانحۂ عظیم میں امجد حیدر آبادی مرنے سے بچ گئے اُس اندوہناک کیفیت ارکانِ خاندان کی ناگہانی موت اور خود کے بچ جانے پر وہ کہتے ہیں۔

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا　　عرفات محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد　　غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

اس تباہی کے ۶ سال بعد ۱۹۲۳ ف میں ان کی شادی سید نادر علی صاحب کی صاحبزادی جمال النساء (جنکا دوسرا نام سلمیٰ تھا) انجام پائی۔ حسن اتفاق سے سلمیٰ بی بی

شاعرہ تھیں اور کافی ذی فہم خاتون تھیں ایک دفعہ کسی کے استفسار پر انہوں نے مرشد کی صفت یہ بتائی ''مرشد کی خاص صفت یہ ہو سکتی ہے کہ مرشد بننا اس شخص کے لیے جائز ہو سکتا ہے جس کا پہلا مرید اس کا نفس ہو'' [1]

۱۳۴۷ھ میں سلمیٰ بی بی امجد حیدرآبادی کو داغِ مفارقت دے گئیں اس سانحہ سے متاثر ہو کر سلمیٰ بی بی کے انتقال پر انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کو منظوم شکل دی۔ نظم ملاحظہ ہو۔

سُن کتھا میری اچھی سہیلی — رات میں سو رہی تھی اکیلی
آئی خوش بو، مجھے عطر کی سی — چھو گئی سانس مجھ کو کسی کی
چھا گئی مجھ پہ بدلی کرم کی — بند آنکھوں میں بجلی سی چمکی
محو دیدِ رخِ یار ہوں میں — خواب میں ہوں کہ بیدار ہوں میں
غم کدے میں میرے عید ہوگئی — اب تو آٹھوں پہر دید ہوگئی
میں تو اس وجد میں جھومتی تھی — اپنی قسمت کا منہ چومتی تھی
ناگہاں ایک ذرا آنکھ جھپکی — کڑکڑا کر گری غم کی بجلی
ہائے تقدیر نے رنگ بدلا — پھر یہ دیکھا کہ اس کو نہ دیکھا
اس نے جلوہ دکھایا ہی کیوں تھا — جانے والا پھر آیا ہی کیوں تھا؟
اب وہ ہم ہیں نہ وہ ہم نشیں ہے — ہائے سب ہو کے پھر کچھ نہیں ہے

مدینہ منورہ کی گلیوں سے انکی بے پناہ عقیدت کا اظہار انکی مشہور نظم سے ہوتا ہے۔

کس چیز کی کمی ہے آقا تیری گلی میں — دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جامِ سفال اس کا تاجِ شہنشہی ہو — آجائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ مرے ہنستے ہیں عقل والے — تری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں — بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
موت و حیات میری دونوں ترے لئے ہیں — مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں
اک آفتاب وحدت ہے جلوہ بخش کثرت — نکلی ہوئی ہیں گلیاں صدہا تری گلی میں

---

[1] حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی مقالہ از محمد یعقوب منظیب حیدرآباد صفحہ نمبر ۵۸

امجؔد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے　　لیکن مقام اس کا دیکھا تیری گلی میں

یوں تو امجد حیدرآبادی نے اردو شاعری کی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن رباعیات لکھنے میں انکا کوئی ثانی نہیں اور اس فن میں ''امام الفن'' کے درجہ پر فائز ہیں۔ امجد حیدرآبادی کی اکثر و بیشتر رباعیات کا ماخذ قرآن اور حدیث ہیں انکی رباعیات میں عرفان، عشق، مذہب، فلسفہ اور اخلاق کا پہلو ہوتا ہے۔ امجد حیدرآبادی نے اپنی رباعیات کیلئے فارسی شعراء کے کلام سے خیالات کے عرق کی کشید کی ہے۔ فارسی میں عمر خیام کی رباعیات عالمی شہرت رکھتی ہیں۔ اردو میں بھی انیؔس، فاؔنی، جوؔش اور فراؔق جیسے نامور رباعی گو شعراء گذرے ہیں لیکن ان تمام شعراء میں امجؔد حیدرآبادی کو اردو رباعی گوئی کے امام کا درجہ حاصل ہے۔ امجد حیدرآبادی کو انکے عہد میں ہر لحاظ سے شہرت حاصل ہوئی۔ انکی ایک صوفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی رباعی ملاحظہ ہو۔

کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں　　کس متن کی تفسیر ہوں معلوم نہیں
میں ہوں کہ مرے پردے میں ہے اور کوئی　　صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

ہر دور میں صاحب اقتدار طبقہ نے شعراء کی قدردانی کی ہے چنانچہ ڈاکٹر گوپال ریڈی وزیرِ فینانس حکومتِ آندھرا پردیش نے امجد حیدرآبادی کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ ہری شال اور کیسہ زر پیش کیا یہ خبر اخبارِ ''رہنمائے دکن'' مورخہ ۲۲؍دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی کو اردو زبان سے گہرا لگاؤ تھا اور کلام غالؔب کے وہ شیدائی تھے۔ امجد حیدرآبادی نے ڈاکٹر گوپال ریڈی کی قدردانی سے متاثر ہوکر ذیل کی رباعی موزوں کی۔

غریبوں کا غم کھائیں گوپال ریڈی　　کرم ہم پہ فرمائیں گوپال ریڈی
خدا کی عنایت کا ہے یہ کرشمہ　　فقیروں کے ہاں آئیں گوپال ریڈی

گو امجؔد حیدرآبادی اولادِ صلبی سے محروم رہے لیکن ان کی معنوی اولاد خوبصورت کلام موجود ہے جو اردو ادب میں انکو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ انکے متعدد شعری مجموعے جمالِ امجد، حجِ امجد، گلستانِ امجد، ریاضِ امجد وغیرہ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہ درویش منش، صوفی مزاج، شہنشاہِ رباعیات شاعر اس دارِ فانی سے ۲۹؍مارچ ۱۹۶۱ء کو

کوچ کر گیا ان کی نمازِ جنازہ حیدرآباد کی تقدس مآب شخصیت حضرت عبداللہ شاہ صاحبؒ نے پڑھائی اور انکی احاطہ درگاہ حضرت شاہ خاموش صاحبؒ میں تدفین عمل میں آئی ۔[1] ہر سال ان کے ارادت منداور عقیدت مند حضرات بڑی عقیدت اور اہتمام سے انکا عرس کرتے ہیں ۔ایسی ہستیوں کے گذر جانے پر مرزا غالب کا یہ شعر وردِ زبان ہوتا ہے ۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی سو وہ بھی خموش ہے

امجد حیدرآبادی کی توجہ خاص سے آر۔آر۔ سکسینہ الہامؔ ، دامودر ذکیؔ اور رگھو بندر راؤ جذبؔ آسمانِ رباعیات پر تابندہ ستارے بن کر چمکے۔ حضرت امجدؔ کی چند رباعیات نمونتاً درج ذیل ہیں ۔

بے خود رہوں تو وہ قریں آتا ہے　　پردے ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں　　میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

☆☆☆☆

ہر چیز مسببِ سبب سے مانگو　　منت سے،خوشامد سے،ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو　　بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

☆☆☆☆

اس پھول کا رنگ اُڑ کے بُو رہ جائے　　سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات　　میں اتنا مٹوں کہ صرف تو رہ جائے

☆☆☆☆

پیاسوں پہ کرے گا مہربانی پانی　　آتش پہ کرے گا حکمرانی پانی
کیا نارِ سقر جلا سکے گی واعظ　　خود شرم سے ہو رہا ہوں پانی پانی

☆☆☆☆

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے　　بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی　　دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

☆☆☆☆

---

[1] ماہنامہ "سب رس" امجد نمبر مئی۔جون ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۷

صفیؔ اورنگ آبادی

صفیؔ اورنگ آبادی ۲۵؍ رجب ۱۳۱۰ھ م ۱۴؍ فبروری ۱۸۹۳ء بروزِ پیر جونا بازار اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔[1] چنانچہ اپنے یوم پیدائش (پیر) کے تعلق سے خود وہ یہ کہتے ہیں۔

کون بے پیرا کہے گا اے صفیؔ
روزِ پیدائش ہی میرا پیر ہے

صفیؔ اورنگ آبادی کے والد حکیم منیر الدین اورنگ آبادی نے ان کا نام بہاء الدین رکھا تھا لیکن صفیؔ نے اپنے لئے بہبود علی نام پسند کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ صفیؔ اورنگ آبادی کے والد حکیم منیر الدین اورنگ آبادی بہ عہد آصف سادس اپنے مختصر خاندان جو ایک بیوی اور دو چھوٹے بچوں پر مشتمل تھا اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے اور پھر حیدرآباد ہی کے ہو کر رہ گئے۔ جب صفیؔ اپنے والدین کے ساتھ حیدرآباد آئے تو ان کی عمر سات برس کی تھی۔ ان کی والدہ ان کو بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ اگر کبھی وہ گھر سے نکل جاتے تو ان کو ڈھونڈنے کے لئے مردانہ کپڑے پہن کر باہر نکل جاتی تھیں۔ شومئی قسمت صفیؔ دس برس کی عمر میں سایہ مادری سے محروم ہوگئے۔[2] صفیؔ کے والد کا ذریعہ معاش طبابت و حکمت تھا۔ وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے صفیؔ کی تربیت کی طرف خاص توجہ نہ دے سکے۔ والدہ کی بے پناہ محبت اور لاڈ و پیار نے صفیؔ کو ضدی اور لاپرواہ بنادیا تھا اور انکی طبیعت میں لا اُبالی پن پیدا ہوگیا تھا۔ والد کی عدم توجہی کی وجہ سے ان کی تربیت پر مزید خراب اثر پڑا اور وہ اکثر مکان سے بھی غائب رہنے لگے۔

۱۔ امجد سے شاذ تک پیشکش روزنامہ سیاست اپریل ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۱۰۷

۲۔ سوانح عمری صفیؔ اورنگ آبادی مولف محمد نور الدین خاں ۱۸۸۹ء صفحہ نمبر ۲

ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں جہاں قیام و طعام کا مفت انتظام تھا ہوئی مگر ادھوری۔ والدہ کا انتقال، والد کی بے پناہ مصروفیات اور ان کے عقدِ ثانی یہ ایسے واقعات تھے کہ صفی سوائے شاعری کے کسی اور میدان میں کوئی جوہر نہیں دکھا سکے۔ انہوں نے مدرسہ طبیہ میں داخلہ لیا طبی نصاب کی تکمیل تو کی لیکن امتحان میں شرکت نہیں کی۔

صفی اورنگ آبادی بڑوں کا لحاظ اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ طبیعت میں بلا کی جلد بازی تھی بات بھی کرتے تو اونچی آواز میں اور جلد جلد۔ غزل تحت اللفظ میں سنایا کرتے تھے۔ آواز بلند اور موٹی اور پھر جلد جلد سنایا کرتے کبھی داد کے منتظر نہیں رہتے۔

صفی اورنگ آبادی بڑے نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ بعض موقعوں پر ان کی نازک مزاجی بدماغی تک پہنچ جاتی تھی۔ میر تقی میر کو اپنی نازک مزاجی اور بدمزاجی کا پورا پورا احساس تھا چنانچہ وہ خود اپنا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

حالات تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ
ہے مجلسوں میں نام مرا میر بد دماغ

از بسکہ بدماغی نے پایا ہے اشتہار

صفی اورنگ آبادی خود اپنے پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

صفی بھی اب گنا جانے لگا نازک مزاجوں میں — نہیں معلوم کیا کرتا اگر ظالم حسین ہوتا

صفی اپنے ایک شعر میں اپنی نازک مزاجی کا اعتراف کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ زمانے کی ناقدری کا شکوہ بھی۔

صفی کے کام میں خوبی کہاں سے آئیگی — بُرے مزاج کا تھا پھر برا زمانہ ملا

وہ بڑے زود رنج واقع ہوئے تھے۔ خفگی بڑھ جاتی تو فحش گالی کا نکل جانا بھی امکانی بات رہتی تھی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے خسر رفعت یار جنگ کے بنگلہ پر ایک محفل مشاعرہ آراستہ کی تھی جس کی صدارت جناب غلام محمد صاحب (سابق وزیر مال حکومت حیدرآباد و سابق گورنر جنرل پاکستان) نے کی تھی۔ مشاعرے میں صفی

بھی مدعو تھے۔ صفی غزل سرائی کر رہے تھے کہ کسی منچلے نے بے تکا فقرہ کسا صفی آپے سے باہر ہو گئے اور ایک موٹی سی گالی دے کر شہ نشین سے اتر گئے لوگوں نے روکنا چاہا لیکن وہ کہاں رُکتے۔[۱]

صفی غیر معمولی خوددار اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے کبھی انہوں نے دستِ سوال کسی کے آگے نہیں پھیلایا۔ جب وہ بیمار تھے اور دوا خریدنے کے موقف میں نہیں تھے اس وقت بھی انہوں نے کسی سے کچھ نہیں طلب کیا۔ بلکہ وہ اپنے قیمتی کلام کو متشاعروں میں حسب ضرورت پیسوں میں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے حالات کو انہوں نے شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

اے صفی ہم ان کو اب تو خط بھی لکھ سکتے نہیں　　آج کل کچھ ہاتھ ہی ایسا ہمارا تنگ ہے

ایک اور جگہ اپنی تنگدستی اور عُسرت کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو آپ مکاں اس غریب کا　　بستر یہاں نصیب نہیں ہے مکاں کہاں

صفی ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا پسند کرتے تھے۔

شکر ہے دل اس نے دیا اے صفی　　اور نہایت خوش و خرم دیا

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صفی اورنگ آبادی نے کبھی کسی کی مدح سرائی نہیں کی لیکن یہ صحیح نہیں ہے وہ اپنے محسنوں جیسے نواب معین الدولہ جن کے دربار سے وہ وابستہ تھے اور نواب صاحب کا ان کے ساتھ شریفانہ برتاؤ اور حسنِ سلوک تھا ان کی تعریف و توصیف میں مدحیہ کلام لکھا جب نواب تراب یار جنگ سعید تحت مفادِ جاگیر دارانِ مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہوئے تو صفی نے مدحیہ قطعہ لکھا جو ذیل میں درج ہے۔[۲]

ہے آج مقننہ میں اس بات کی دھوم　　یعنی ہوئے منتخب سعید مخدوم

تئیس میں جو ملے ان کو چودہ ووٹ　　بے شک ہیں مدد پہ ان کے چودہ معصوم

صفی غیر معمولی غیور اور خوددار شخصیت کے مالک تھے۔ ناصر الدین احمد مہتمم آبکاری گلبرگہ صفی کے مداحوں میں سے تھے۔ وہ ان کی مدد کے لئے تانڈور کے ایک تاجر ''صندل یلیا'' سے کہہ کر ایک سو روپے بذریعہ منی آرڈر بھجوایا گو صفی سخت ضرورت مند تھے

---

۱ سوانح عمری صفی اورنگ آبادی مولف محمد نور الدین خاں سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء　صفحہ نمبر ۲۴

۲ 　" 　" 　" 　" 　" 　صفحہ نمبر ۲۷، ۲۸

لیکن ان کی غیرت نے قبول نہیں کیا کہ وہ ایسے آدمی کی منی آرڈر قبول کریں جن سے وہ واقف تک نہیں تھے چنانچہ انہوں نے منی آرڈر کی رسید کی پشت پر یہ لکھ کر منی آرڈر واپس کردی کہ وہ منی آرڈر کرنے والے سے واقف نہیں ہیں۔[1]

صفیؔ کی زندگی میں شاعری اور مئے نوشی دو اہم مشاغل تھے۔ غروب آفتاب کے بعد مئے خواری کا سلسلہ شروع ہوتا۔ شراب کے تعلق سے صفیؔ کہتے ہیں۔

اتنی شوخی صفیؔ کسی میں کہاں ۔۔۔ رنگ میں رنگ تو شراب کا رنگ

شیخ صاحب زندگی پانی سے ہے ۔۔۔ آدمی کو چاہئے پینا بہت

شام آئی میرے ساقی جامِ شراب نکلا ۔۔۔ اک آفتاب ڈوبا اک آفتاب نکلا

لیکن بادہ نوشی کے بعد وہ شائستگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ صفیؔ کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور وہ ستار سے بھی شوق کیا کرتے تھے۔ صفیؔ اورنگ آبادی غیر متاہل تھے اس طرح ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد تھے لیکن انکو تنہائی کا شدید احساس رہتا تھا۔

تنہا ہوں گھر میں اور شبِ انتظار ہے ۔۔۔ مجھ کو چراغِ خانہ چراغ مزار ہے

صفیؔ اورنگ آبادی رمضانِ شریف میں خرابات کے قریب نہیں جاتے تھے اور زندگی کے آخری زمانے میں انہوں نے مئے نوشی بھی ترک کردی تھی اور پنج وقتہ نماز مسجد میں ادا کرتے تھے۔ تراویح مکہ مسجد میں پڑھا کرتے تھے اور عیدین کی نماز وہ مکہ مسجد میں ادا کرتے تھے۔ بزرگانِ دین سے ان کو غیر معمولی عقیدت تھی اور وہ اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس کو سمجھو نہ ڈھیر مٹی کا ۔۔۔ لوگ ہوں جس مزار کے صدقے

صفیؔ نے بچپن ہی سے شعر گوئی شروع کردی تھی چنانچہ صفیؔ کے والد حکیم منیر الدین جو اردو اور فارسی ہر دو زبان میں شعر گوئی کرتے تھے ان ہی کو وہ اپنا کلام دکھاتے اور ان سے صلاح لیتے۔ بعد میں انہوں نے ضیاءؔ گورگانی اور ظہورؔ دہلوی سے استفادہ کیا داغ دہلوی سے بھی ان کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ داغ دہلوی کے انتقال کے بعد وہ کیفیؔ سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔[2]

---

[1] سوانح عمری صفیؔ اورنگ آبادی مولفہ نور الدین خاں سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۲۸

[2] " " " " " صفحہ نمبر ۲۳۵، ۲۳۶

صفؔی اورنگ آبادی اپنے کلام میں دکنی محاوروں کے استعمال کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں ان کا مطالعہ وسیع تھا عربی اور فارسی پر وہ عبور رکھتے تھے اور ان کو عروض پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک منفرد غزل گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی لاأبالی طبیعت کی وجہ ان کا مکمل کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک دیوان ان کے کسی دوست نے غائب کردیا دوسرا دیوان ان کے کوئی دوست اشاعت کے بہانے لے کر چلتے بنے۔[1]

ان کی طبیعت کے لاأبالی پن سے ان کا دیوان زیورِ طباعت سے محروم رہا جس کا صفؔی یوں ذکر کرتے ہیں ۔

مرے جنوں ہی کا نتیجہ ہے اے صفؔی ۔۔۔ شائع جو آج تک مرا دیواں نہ ہو سکا

اپنے شعری مجموعہ ''پراگندہ'' کے تعلق سے وہ کہتے ہیں ۔

یہ ''پراگندہ'' ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفؔی ۔۔۔ میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

ان کا حلقہ تلامذہ بے حد وسیع تھا ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ شمس الدین تاباںؔ جو صفؔی کے حلقہ تلامذہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے ان کے کلام کی اشاعت کی کوششوں میں سرگرم رہے۔ ان کی ناتمام کوششوں کو ان کے فرزند روف رحیم نے پورا کیا اور ۱۹۸۷ء میں صفؔی کے کلام کے مجموعہ کو ''گلزارِ صفؔی'' کے نام سے شائع کیا اس طرح ایک پر گو شاعر کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ کلام منظرِ عام پر آسکا۔[2] اس سے قبل ان کے شعری مجموعے ''پراگندہ'' اور ''انتخاب صفؔی'' منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

قدیم روایات کی انہوں نے اپنے کلام میں پاسداری کی ہے انہوں نے دکنی محاوروں کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا اور اس طرح دکن کی عام بول چال کی زبان، محاورات اور استعارات کو مستند بنادیا۔ صفؔی اورنگ آبادی کو اپنی شاعرانہ عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ صفؔی کی غزل گوئی میں روایتی غزل کے سارے لوازمات ملتے ہیں۔ انہوں نے عاشقی کے تمام مراحل وعناصر کا ذکر بھی کیا ہے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور حقائق کا ذکر کیا ہے۔ صفؔی راسخ العقیدہ انسان تھے۔ فکرِ معاش میں پریشاں وسرگرداں رہتے لیکن اپنے معبودِ حقیقی کی رزاقیت پر کامل ایمان رکھتے

[2,1] امجد سے شاذ تک روزنامہ سیاست اپریل ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۱۰۸

تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

کسی کا رزق رک سکتا نہیں خلاقِ اکبر سے صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

اگر حصولِ رزق میں ناکامی ہوتی تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ قناعت پسندی اور توکل کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔

ہم کو یہ توکل نے پڑھایا ہے سبق مل جائے تو روزی ہے نہیں تو روزہ

صفی کو اس بات کا احساس تھا کہ زمانہ ان کی اہمیت اور مقام کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا۔ اپنے اس احساسِ ناقدری کا ان کو شدت سے احساس تھا۔

صفی بھی کیوں قدر کا طالب ہوا ہے اس زمانے میں اے لوگوں سے جیتے جی امیدِ قدر دانی ہے

بنیادی طور پر صفی رجائیت پسند تھے وہ قانع مزاج کے آدمی تھے۔ رات کی تاریکی سے وہ مایوس نہیں ہوتے اور سحر ہونے پر یقین رکھتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ زمانے سے شاکی بھی ہیں۔

قدر کرتا ہوں اپنی آپ صفی ہائے تجھ کو بھی کیا زمانہ ملا

انہوں نے کبھی بھی ہار نہیں مانی، ہمیشہ وہ ہر شکست کے بعد ایک اور مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ ذاتِ باری کی قوتِ کاملہ پر ان کو کامل بھروسہ تھا۔

ہے زندگی تو پائیں گے ایک دن گلِ مراد اب کے بہار گر نہیں اب کی بہار پر

وقت اور زمانے کی شکایت، اردو کے ہر شاعر نے مختلف انداز سے کی ہے لیکن وقت کو برا نہ کہنے کا صفی کا انداز ہی جداگانہ ہے وہ کہتے ہیں۔

وقت کو اے صفی برا نہ کہو
وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

صفی نے ۶۱ برس کی عمر میں رحلت کی۔ اس طویل عرصہ حیات میں مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔ روایتی غزل گوئی پر اعتراضات ہوئے اور شعر گوئی اور نثر نویسی کے انداز بدلے لیکن صفی نے غزل کی روایات کی تا زیست پاسداری کی لیکن خود کسی تحریک کی مخالفت نہیں کی۔ وہ مختلف الطبع لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے لیکن انہوں نے کسی تحریک کے اثر کو قبول نہیں کیا۔

ہے تقاضائے احتیاط یہی
سو میں بیٹھو نہ چھوڑو اپنا رنگ

چنانچہ شاعری میں صفؔی ایک خاص رنگ کے حامل ہیں۔ صفؔی کے تعلق سے ڈاکٹر حفیظ قتیل یوں رقمطراز ہیں "داغ کے برخلاف صفؔی کی شخصیت صاف گوئی، صاف دلی، صاف معاملگی، بے تکلفی، احساسِ کمال سے پیدا ہونے والی بے دماغی اور طبیعت کی بے اعتدالی جیسی خصوصیات سے عبارت تھی۔ اس انفرادی شخصیت کے ساتھ وہ صفؔی بن سکتے تھے اور صفؔی ہی بنے۔" [1]

صفؔی کی شاعری محض گل وبلبل کی داستان نہیں ہے بلکہ ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی ملتی ہے۔ ان کی شاعری مقصدی شاعری ہے انہوں نے اپنے کلام میں زندگی کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں تلخیوں کا ذکر ملتا ہے وہیں پر پُرمسرت زندگی گذارنے کے راز بھی ملتے ہیں۔

ذیل میں صفؔی کے چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

کس قیامت کی تیری انجمن آرائی ہے
بزم کی بزم ہے تنہائی کی تنہائی ہے

آپ جو مل لیں صفؔی تو عنایت ہوگی
رحم فرمایئے، اک شخص تمنائی ہے

سب کی عنایتیں ہیں صفؔی اس کے فضل سے
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

صفؔی کا کمال یہی ہے کہ وہ باتوں باتوں میں "پتہ کی بات" کہہ دیتے ہیں اور وہ جس رویے کے علمبردار ہیں دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے ہے

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

اب دوست سے غرض ہے نہ دشمن سے کام ہے
دونوں کو دونوں ہاتھوں سے اپنا سلام ہے

---

[1] سب رس جنوری ۱۹۶۷ء صفحہ نمبر ۲۱

ہم کیا ہیں تہمتوں سے پیمبر نہیں بچے
نادان کیا زمانے کے منہ کو لگام ہے

تسلسل، روانی، ایمائیت اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر صفی کو خوب آتا ہے۔ وہ لفظوں سے کیفیت کو نمایاں کرنے پر بڑی قدرت رکھتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب کبھی تیری دید ہوتی ہے
ہم غریبوں کی عید ہوتی ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
اچھے گن دیکھ، اچھی شکل نہ دیکھ
سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

غزل مسلسل کی روایت کے فروغ میں صفی کو کمال حاصل ہے۔ قافیہ کو گرمانے اور ردیف کو قافیہ سے پیوست کر کے خیال کو نمایاں کرنے کا فن صفی کی شاعری میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گھٹا گھنگور چھائے، خوب گرجے، ٹوٹ کر برسے
مرے اللہ وہ جانے نہ پائیں مرے گھر سے
ملے عقبیٰ عبادت سے تو دنیا زور سے زر سے
یہ سب سچ ہے مگر معشوق ملتا ہے مقدر سے
اگر منظورِ خاطر سختیاں ہی جھیلنی ہوتیں
تمہارے بدلے کرتے دوستی ہم ایک پتھر سے
ارے ناداں سچا چاہنے والا نہیں ملتا
وہ لیلیٰ تھی کہ جس کو مل گیا مجنوں مقدر سے
ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنالیتے ہیں پتھر سے

صفی کو مسکرا کر دیکھ لو غصے سے کیا حاصل
اسے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

آدمی کی حیثیت اور دنیا میں اس کے موقف کو ظاہر کرنے کے لئے بھی صفی نے اپنے کلام کا استعمال کیا ہے۔ یہ دو اشعار اس حقیقت کی دلالت کرتے ہیں ۔

صفی تم نے سنا تھا حشر میں اعمال کا تلنا
قیامت ہے جہاں انسان تلتے ہیں ترازو میں

بڑی تعریف سنتے تھے نمائش گاہِ عالم کی
یہاں تو کوئی چیز ایسی نہیں ہاں آدمی کچھ ہے

صفی احباب پرور طبیعت کے آدمی تھے ہمیشہ دوست و احباب میں گھرے ہوئے رہتے اور ان کی قدر کیا کرتے ۔

بس جو ہر کام ہے، موقوف اسی پر اپنا
دوست کو ہم تو سمجھتے ہیں مقدر اپنا

احباب پرستی کو صفی نے اپنا شعار بنالیا تھا۔ ان کی دوست نوازی کا ثبوت اس شعر سے بھی ملتا ہے۔

جو دوست کی خوشی ہو وہ اپنی خوشی رہے
ہے تو یہی ہے ایک طریقہ نباہ کا

ہر بڑے قلم کار کی طرح صفی کو اپنی شاعرانہ عظمت کا بھرپور احساس تھا۔ صنفِ غزل اور دکن کی سرزمین سے صفی کی محبت کا اندازہ کیجئے۔

غزل کا صنفِ سخن میں وجود ہے جب تک
رہے گا یاد ہر ایک کو دکن میں نامِ صفی

صفی کے مزاج میں خوفِ خدا' خداوندِ کریم پر کامل بھروسہ' قناعت پسندی' توکل پسندی اور قلندری رچی بسی ہوئی تھی چنانچہ وہ کہتے ہیں ۔

صفی بندے جو ہوتے ہیں خدا کے
بھروسہ ان کو ہوتا ہے خدا پر

خدا کی یاد کو ہر دم وردِ زباں کرنے کو انہوں نے ترجیح دی۔ وہ بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں ؎

میں اس بندہ نواز و بندہ پرور کے تصدق ہوں　　جو بھولوں عیش میں تو یاد آتا ہے مصیبت میں

خدا کو یاد کرنے کی انسانی فطرت کو صفی خوب سمجھتے ہیں اور بڑے ہی لطیف انداز میں کہتے ہیں ؎

بیہودہ صفی نے عمر کھوئی اپنی　　جب کچھ نہ ملا تو پھر خدا کو ڈھونڈا

صفی کو اپنی معصیت کا احساس تھا۔ اور اپنے گناہوں کی معذرت خواہی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

الٰہی بند مٹھی کا بھرم رکھ لے قیامت میں
نہ کھلوا دشمنوں کے سامنے گٹھری گناہوں کی

صفی کو اندازہ تھا کہ دنیا میں انسان کی قدر دشوار ہے البتہ اس دنیا سے گذرنے کے بعد اہل دنیا اس کی قدردانی کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

مرنے پر ہماری قدر ہوگی
دشمن کو بھی یاد آئینگے ہم

صفی نے زندگی گذارنے کے لئے جس مسلک کو اختیار کیا اس کی نمائندگی ان کے اشعار میں بھی ہوتی ہے۔ انکا شعر خود انکے مسلک کی نمائندگی کرتا ہے اور صفی اپنے احباب سے اپنا آخری مدعا یوں بیان کرتے ہیں ؎

دوستوں سے یہ التجا ہے مری
مغفرت کے لئے دعاء کرنا

یہ منفرد مزاج کا پرگو قلندر صفت شاعر ۲۱ رمارچ ۱۹۵۴ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ احاطہ درگاہ سردار بیگ صاحبؒ واقع بھوئی گوڑہ حیدرآباد میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ [1]

☆☆☆☆☆

---

[1] امجد سے شاذ تک پیشکش روزنامہ سیاست اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۰۸

علامہ نجم آفندی

علامہ نجم آفندی کا پورا نام مرزا تجمل حسین آفندی ہے وہ ۱۸۹۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔[۱] انکے اجداد کا تعلق وسط ایشیاء سے تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ مرزا جعفر علی فصیح کو امجد علی شاد اودھ کے دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انہوں نے مکہ معظمہ میں زائرین حج کے قیام کیلئے ایک دومنزلہ عمارت تعمیر کروائی تھی اور خود وہیں فروکش ہوگئے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) نے ان کی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں آفندی کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ نجم آفندی کے والد کا نام مرزا عاشق حسین بزم تھا۔ گو نجم آفندی کے والد لکھنوء میں رہتے تھے لیکن نجم آفندی کی تعلیم و تربیت انکے ننھیال (آگرہ) میں ہوئی۔ نجم آفندی کو اپنے والد مرزا عاشق حسین بزم سے تلمذ حاصل تھا۔ مدرسہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ریلوے کی ملازمت حاصل کرلی لیکن نجم آفندی کی کھدر پوشی ریلوے کے انگریز عہدداروں کو پسند نہ تھی اور اس مسئلہ پر ان میں اور عہدارانِ بالا میں اکثر جھڑپ ہوا کرتی تھی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔[۲] ملازمت سے مستعفی ہونے کے ایک عرصہ بعد وہ اپنے والد کیساتھ حیدرآباد پہنچے۔ انکے حیدرآباد آنے پر شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کیا اور اپنے کلام کی اصلاح کی ذمہ داری سونپی۔ شہزادہ کے اصرار پر نجم آفندی نے اپنے متعلقین کو حیدرآباد بلوالیا اور پھر انہوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی اسطرح حیدرآباد انکا وطن ثانی بن گیا۔[۳] شہزادہ معظم جاہ بہادر خود اچھے شاعر تھے اور شاعروں کی قدر کیا کرتے تھے چنانچہ انکے دربار سے وابستہ شعراء میں جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، شاہد صدیقی صدق جائسی، اور خمار بنکوی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

۱،۲،۳،۴ انجم سے شاذ تک پیش کش روزنامہ 'سیاست' اپریل ۱۹۸۸ء

علامہ تجم آفندی کے شعری مجموعے ’’ تہذیب مودت‘‘ اور ’’لہو خطرہ خطرہ‘‘ منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے ان کے کلام کی خصوصیات زبان اور بیان کا برمحل استعمال ہیں انہوں نے تمام اصنافِ سخن، مرثیہ، قصیدہ، نعت، منقبت، نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جو برِ صغیر میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کا کلام رومانیت، جمالیات، اخلاقیات اور موجودہ عصری مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ انہوں نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جس میں چار پشت سے مدح اہلِ بیت کا سلسلہ قائم تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ مرزا فصیح مرحوم نامور مرثیہ نگار خلیقؔ، ضمیرؔ اور دلگیرؔ کے ہمعصر تھے۔ انکی شاعری کی ابتدا مدح اہلِ بیت سے ہوئی۔ الہٰ آباد میں یتیم خانہ کے لیے انکے رقت انگیز کلام سے چار ہزار روپئے چندہ جمع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں مافوق الفطرت، حالات اور معجزات کے بجائے ممدوحین کے اسوہ حسنہ کا احاطہ کیا ہے اسطرح انکا کلام جو مدح اہلِ بیت اور عزاء سید الشہداء سے مملو ہے اُردو ادب میں اضافہ کا باعث بنا۔ مرثیہ سے اُردو ادب میں رزمیہ شاعری کا اضافہ ہوا۔ قصائد نے شوکت الفاظ، بلند پروازی اور ندرت خیال سے ادبی خزانے کو مالا مال کیا لیکن نہایت اہم گوشہ اسوہ حسینی پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس کمی کو پورا کرنا علامہ نے اپنا مقصدِ حیات بنالیا اور شعری تخلیقات میں ان پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ اپنے شعری مجموعے ’’تہذیب مودت‘‘ میں انہوں نے واقعات، تجربات اور حقائق کو شعری روپ میں ڈھالا۔ علامہ تجم آفندی کے صاحبزادے علامہ سہیل آفندی نے راقم سے دورانِ انٹرویو فرمایا کہ الہ آباد میں علامہ تجم آفندی کی شاعری کی دھوم ان کے ذیل میں درج نعتیہ شعر سے ہوئی ۔

صورت گرِ ازل نے تیرے اعتبار پر اک مشتِ خاک تھی جسے انسان بنا دیا

یہ شعر اتنا مقبول و عام ہوا کہ آگرہ کی گلیوں میں بھی لوگ اس شعر کو گنگناتے تھے ، شاید اس شعر کو بارگاہِ رسالتؐ میں شرفِ قبولیت حاصل ہوئی اس کے بعد ہی ان کی شاعری کی شہرت سارے ملک بھر میں پھیل گئی۔ ان کے مرثیہ کا ذیل میں درج شعر بھی آگرہ میں مقبول عام ہوا ۔

غُل ہے فوجِ شام میں عباسؑ کو پانی نہ دو ان کے تیور کہتے ہیں دریا اٹھا لے جائیں گے

ان کے چند قطعات ذیل میں بطورِ نمونتاً درج کیے جاتے ہیں۔

دل میں بھی نماز جلوہ گر ہے کہ نہیں
روزے کی حقیقت پہ نظر ہے کہ نہیں
اللہ کے حق کی فکر رکھنے والے
بندوں کے حقوق کی خبر ہے کہ نہیں

☆

قرآت کی یہ ہنگامہ طرازی کیسی
یہ شانِ نماز اے نمازی کیسی
سرسجدے میں گردن پہ دو عالم کے حقوق
اللہ سے یہ شعبدہ بازی کیسی

☆

افطار کے سامان سے مطبخ بھر جائے
جو زیرِ گلو جائے وہ لقمۂ تر جائے
ہوتی نہیں ایسے روز داروں کی خبر
فاقہ ہے اگر کوئی پڑوسی مر جائے

☆

افطار و سحر کے وقت کچھ کھا لیتا
تاویل سے احباب کو سمجھا لیتا
دولت ہوتی اگر تو اجرت دے کر
روزہ کسی مزدور سے رکھوا لیتا

☆

مایوسِ شفا کو آسرا دیتے ہیں
آیات کو تعویز بنا دیتے ہیں
ہوشیار تو لیتے ہیں قرآں سے سبق
بے ہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

☆

اسلام کا یہ نظامِ دستوری دیکھ
یہ عہدِ قدیم و طرزِ جمہوری دیکھ
اے آج کی اشتراکیت پہ نازاں
سلمان کی گورنری و مزدوری دیکھ

☆

علامہ نجم آفندی زیارتِ مقاماتِ مقدسہ کے بڑے آرزومند تھے۔ پھر ہوا یہ کہ انکو شہزادہ مُعَجِّع کی اعانت سے شرفِ زیارت حاصل ہوئی۔ مقاماتِ مقدسہ پر جہاں جہاں انہوں نے حاضری کا شرف حاصل کیا اپنے جذبات و تاثرات کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ بصرہ سے نجف تک سفر کے دوران انکے تاثراتِ قلبی ملاحظہ ہوں ۔

بصرہ تا نجف وہ قیامت کی رات تھی
پایانِ اشتیاق زیارت کی رات تھی
کتنی مرے خیال سے ہے دور کائنات
یہ ساری کائنات میں فرصت کی رات تھی

☆

تسبیح بندگانِ مودت کی رات تھی　　ہر سانس میں درود تھا، ہر سانس میں سلام
طوفانِ انتظار و ارادت کی رات تھی　　جیسے مئے غدیر کا دریا چڑھا ہوا

نجفِ اشرف پر حاضری دیتے وقت ان کے احساسات و جذبات ملاحظہ ہوں۔

توقعاتِ کرم کا اسیر حاضر ہے　　کھڑا ہے در پہ گناہوں کی بیڑیاں پہنے
توہمات کی یہ داروگیر حاضر ہے　　تیقنات کا احساس بخشنے والے
درِ امیر سلامت فقیر حاضر ہے　　نجف میں شاعرِ گردوں حصیر حاضر ہے

میدانِ کربلا میں جب تجمل آفندی پہنچتے ہیں تو وارداتِ قلبی کا اظہار یوں کیا۔

اے سراپا حسن اے حُسنِ آفرینِ کربلا　　السلام اے جلوہ آرائے زمینِ کربلا
اللہ اللہ میرے بوسے اور جبینِ کربلا　　اللہ اللہ میری نظریں اور یہ ایوانِ بلند

وفا کے پیکر حضرت عباسؑ کی بارگاہ پر حاضر ہونے پر تجمل آفندی نے اپنے جذباتِ قلبی کا یوں اظہار کیا ہے۔

کیسی لپیٹ رہی ہے قدموں سے بادشاہی　　کیسی برس رہی ہے بالیں سے بے نیازی
دنیا بدل رہی ہے از ماہ تابہ ماہی　　تجھ سے ہے جن کو نسبت وہ اہلِ دل نہ بدلے

حضرت موسیٰ کاظمؑ کے مدفن پر بوقت حاضری تجمل آفندی کے احساسات ملاحظہ ہوں۔

جن کے آستاں پر مشرقین و مغربین　　موسیٰ کاظمؑ کے مشہدِ مدفن پاک تقی
آپ دردِ قوم کے ہیں شاہدینِ عادلین　　اپنے نانا سے خدارا کچھ سفارش کیجئے

بقول صدق جائسی، علامہ تجمل آفندی کی شعر پہ داد دینے کی ادا بڑی نرالی تھی" پہلے مصرعہ پر تجمل آفندی داہنا ہاتھ اُٹھا کر چہرے پر تاثیر کی لکیریں پیدا کرتے، دوسرے مصرعہ پر وہی اُٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں اسی طرح گھماتے گویا انہوں نے کسی پر ڈھیلہ کھینچ مارا ہو"۔[1] علامہ کی طبعیت میں حق گوئی اس طرح رچ بس گئی تھی کہ وہ مصلحت پسندی پر غالب آگئی تھی اور مزاج شاہانہ سے وہ جوڑ نہ سکے۔ استاد فصاحت جنگ اعلی حضرت آصف سابع کے استاد تھے وہ آصف سابع کے کلام کی اصلاح پر تا زیست مامور رہے حضرت جلیلؔ غیر معمولی فریس اور مصلحت پسند شخصیت کے حامل تھے اگر آصف سابع کے کلام میں

1۔ دربارِ دُربار اشاعت دوم ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۴۱ مصنف صدق جائسی

اصلاح مقصود ہوتی تو یوں لکھتے ''سرکار کا شعر لاجواب ہے مگر خانہ زاد کی ناقص رائے میں ایک صورت یہ بھی ہے، اب سرکار جسے چاہے پسند فرمائیں'' [۱]

نجم آفندی اس قول کو ''ایاز قدر خود شناس'' فراموش کر بیٹھتے تھے اور ان کا رویہ پرنس کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک کلاس ٹیچر کا طالبِ علم کے ساتھ۔ ایک بار کسی شعر میں پرنس اور علامہ میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ علامہ شدت سے اپنے موقف پر اڑے ہوئے تھے پرنس نے معاملہ کو استاد جلیؔل سے رجوع کیا استاد جلیؔل نے واقعات کی تفصیلات دریافت کر کے بہ تقاضہ مصلحت پرنس کی رائے کو صحیح قرار دیا۔ دربار میں پرنس نے فاؔنی بدایونی کو مخاطب کیا اور کہا کہ ''استاد جلیؔل نے انکی رائے سے اتفاق کیا ہے'' مگر نجم آفندی اپنی بات پہ اڑے رہے اور کہا جو میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ جلیؔل کی بات کو آپ آیت و حدیث سمجھیں میں نہیں سمجھتا'' [۲] اس طرح کی باتوں کی وجہ بالآخر علامہ نجم آفندی کو پرنس کے دربار سے علحدہ ہونا پڑا اور ان کی معاشی مشکلات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ [۳]

بنیادی طور پر علامہ نجم آفندی غزل گو شاعر تھے۔ ذیل میں ان کے چند اشعار بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں جس سے ان کا رنگِ تغزل، قادر الکلامی، فصاحت اور شگفتگی نمایاں ہوتی ہے۔

بچا کر گوشۂ دامن گزر جا دورِ ہستی ہے — لپٹ جاتی ہے دامن سے تو رسوائی نہیں جاتی
وہی لفظوں کی خوش نظمی وہی ترتیب کے تیور — جنابِ نجم کی لفظوں سے رعنائی نہیں جاتی

☆☆☆

محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی — یہ بجلی ہر خس و خاشاک سے ٹکرا نہیں سکتی
محبت کے عوض ان سے محبت بھی نہ چاہوں گا — میری غیرت کبھی دستِ طلب پھیلا نہیں سکتی

وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیٹی داماد سے ملنے پاکستان گئے وہیں پر شعر و سخن کے فن کے آسماں پر مانند تابندہ ستارہ دمکنے والا شاعر اس دارِ فانی سے ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو کوچ کر گیا۔ [۴]

۱۔ دربارِ دُربار اشاعت دوم ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۴۶ مصنف صدق جائسی
۲۔ '' '' '' صفحہ ۱۴۷ ۳۔ '' '' '' صفحہ ۱۵۰
۴۔ امجد سے شاذ تک پیش کش روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد دکن اشاعت اپریل ۱۹۸۸ء

حیرتؔ بدایونی

عصر حاضر کے شعراء میں حیرتؔ بدایونی کا شمار استادانِ سخن میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۴ء بدایوں کے قاضی محلّہ میں پیدا ہوئے۔۱ ان کے والد کا نام محمد حسن صاحب اور والدہ کا نام افضل النساء صاحبہ تھا۔ ان کے دادا محمد عظمت علی صاحب خلیفہ اول کے بڑے فرزند کی اولاد سے تھے۔ ان کے نانا عزیز الدین صاحب خلیفہ اول کے دوسرے فرزند کی اولاد سے تھے۔ اس طرح وہ طرفینی صدیقی تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ عرب سے ایران آئے اور چند پشتوں کے بعد ایران سے دہلی ہوتے ہوئے بدایوں پہنچے۔۲ ان کے جداعلیٰ قاضی محمد جلیس عالمگیر کے دربار میں ذی وقار عالم تھے۔ اورنگ زیب نے ان سے فتاویٰ عالمگیر مرتب کروائی تھی۔ حیرتؔ بدایونی کے اجداد قاضی محمد جلیس کی اولاد سے ہیں۔۳ ان کو اور ان کے خاندان کے لوگوں کو لوگ قاضی زادے کہتے تھے اور بدایوں کے جس محلّہ میں وہ لوگ رہتے تھے وہ قاضی محلّہ کے نام سے موسوم تھا۔ انہوں نے مدرسہ شمس العلوم اور مدرسہ قادریہ بدایوں سے عربی تعلیم حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے مُلّا کا اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم، منشی، فاضل اور مولوی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور امبالہ، بدایوں اور کانپور کے فوقانیہ مدرسہ میں بہ حیثیت مدرس خدمت انجام دی۔ ۴

تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تحریکات میں ان کی سرگرمیوں اور گرمجوشانہ تقاریر سے ان کی گرفتاری کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ ڈسمبر ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد پہنچے ۵، اور حیدرآباد ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ابتداء میں مدرسہ آصفیہ اور مدرسہ اعزہ میں بہ حیثیت مدرس خدمات انجام دیں۔

۱، ۲، ۳، ۴ امجدؔ سے شاذؔ تک ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد صفحہ نمبر ۶۹

۵ حیرتؔ بدایونی کے غزلوں کا مجموعہ کلام ''آئینہ'' اکتوبر ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ج

نواب صاحب کلیانی کے اتالیق بھی مقرر کئے گئے تھے۔ ان کو مہاراجہ کشن پرشاد کی مصاحبت کا بھی شرف حاصل تھا۔ مہاراجہ نے ان کا محکمہ امورِ مذہبی میں تقرر کیا اور وہ وظیفہ تک وہیں پر کارگزار رہے۔ [۱]

شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا ان کے دادا منصف عظمت علی ضیاؔ، والد محمد حسن اثرؔ، چچا محمد حسین سحرؔ، بڑے بھائی محمد محسن محسنؔ اور چھوٹے بھائی سلطان حسن ابر بدایوں کے نامور شعراء میں گنے جاتے تھے۔ ان کو دہلوی ولکھنوی ہردو مکاتبِ خیال کی تنگ نظری پسند نہ تھی البتہ وہ محاسنِ شعری کی ضرور داد دیتے تھے۔ ان کی مخصوص افتادِ طبع کی وجہ انہوں نے کسی کے سامنے بھی زانوادب تہہ نہیں کیا۔ نہ انہوں نے کسی سے تلمذ حاصل کیا اور نہ ان کا اپنا کوئی حلقہ تلامذہ ہے۔ انہوں نے داغؔ، ذوقؔ، امیرؔ، غالبؔ، میر تقی میر اور بہت سارے شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ انہیں کے مخصوص رنگ، زبان اور تصورات کو اپنی غزلوں میں پیش کریں۔ ان کی غزلوں میں جہاں اردو محاورے اور روزمرہ کی زبان پائی جاتی ہے وہیں پر انہوں نے اپنی غزلوں میں صنائع اور بدائع، تشبیہات، مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل اور بیشتر صنعتوں کا استعمال کر کے غزل کو مرصع بنایا ہے۔ ان کا کلام ہر رنگ میں ملتا ہے لیکن ان کا اپنا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔

وہ کسی غلط محاورہ یا لفظ کو رواجِ عام پا جانے پر اس لفظ کو صحیح یا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا واضح نقطہ نظر یہ تھا کہ گناہ اور غلطی کتنی ہی طور پر رواج پا جائے وہ گناہ اور غلطی ہی رہے گی۔ عام طور سے لوگ غلط العام اور غلط العوام کو فصیح کہتے ہیں لیکن اس کو وہ دھوکہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں غلطی عوام کی ہو یا خواص کی غلطی غلطی ہی رہیگی اور غلطی ہی کہلائیگی۔

وہ اپنے مجموعہ کلام میں غزلوں کی ابتداء میں بحر اوراوزان بھی لکھ دیتے تھے جس سے موزوں طبع لوگ جوفن سے واقف نہیں ہیں ان کی معلومات میں ایک گونا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ابتداء میں وہ حسن تخلص کیا کرتے تھے بعد میں انہوں نے حیرت تخلص اختیار کیا۔ اردو کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ ان کا فارسی کلام ''ابریق'' اور اردو کلام کا مجموعہ ''آئینہ'' شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لئے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ حیرت بدایونی وضعدار، خوش گو اور بذلہ سنج بزرگ

۱۔ امجد سے شاذ تک ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد صفحہ نمبر ۶۹

شاعر تھے جو حیدرآباد کے علمی اور ادبی محفلوں میں اپنی ان مِٹ یادوں کے نقوش چھوڑ کر ۱۵ر فبروری ۱۹۷۵ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور ۱۶ر فبروری کو احاطہ درگاہ یوسفین میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔[1]

ان کی غزلوں کا محور حسن وعشق ہے اور وابستگی ووارفتگی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔اس کے باوجود بھی وہ مسائل پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں لیکن اس وقت بھی غزل کی نزاکتوں پر نظر ہوتی ہے چنانچہ عصر حاضر کے سیاسی حالات اور عصر حاضر کے سیاسی قائدین کی جھوٹی تسلیوں کے تعلق سے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

تسلی پر تسلی دیئے جا رہے ہیں باغباں پھر بھی چمن میں رہنے والوں کی پریشانی نہیں جاتی

ذیل کے شعر میں گرچہ ایک پامال مضمون کو نظم کیا گیا ہے جس کو بیشتر شعراء نے اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے۔محبوب کے جور و ستم اور دل کی نادانی کا حیرت بدایونی نے اپنے انداز میں ذکر کیا ہے۔

اسی کو چاہتا ہے جس نے ٹکڑے کر دیئے دل کے نہیں جاتی دلِ ناداں کی نادانی نہیں جاتی

محبوب کا فریب دینا اور چاہنے والے کا جانتے ہوئے بھی فریب کھانا، اس مضمون کو قدما نے بھی باندھا ہے لیکن حیرت بدایونی جس دلکشی اور سلاست کے ساتھ اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ملاحظہ ہوں۔

ہمیں خبر ہے کہ ظالم فریب دیتا ہے ہمارے دل کو ہے عادت فریب کھانے کی

حیرت بدایونی نے غزلوں میں تصوف کے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ان مواقعوں پر وہ روایت سے وابستگی اور خیال کی بلند پروازی پر وہ خاص توجہ دیتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

مری ہستی ہے ترے موجود ہونے کی دلیل میری زیبائی سے تری جلوہ آرائی ہوئی

حیرت بدایونی کی بعض غزلیں بے حد مترنم بحور کی نشاندہی کرتی ہیں، ذیل کے شعر میں محبوب سے ملاقات اور ملاقات کے بعد خود فراموشی کی کیفیت کو انہوں نے انتہائی مترنم بحر میں شعر کے سانچہ میں ڈھالا ہے۔

ہائے وہ پہلے پہل ان سے ملاقات کی رات خود فراموشی وطغیانی جذبات کی رات

---

[1] امجد سے شاذ تک ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد، صفحہ نمبر ۶۹

میخوار، وجود خداوندی کا قائل رہتا ہے اور مدہوشی کے بعد بھی خدا کے وجود کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے علامہ حیرت نے ایک نرالے خیال کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شامِ میخانہ تھی تسبیح و مناجات کی رات ... یاغفوری کی صدا آتی ہے ہر گھونٹ کے بعد

استاد شاعر نے ترکیب ''یاغفوری'' باندھا ہے جبکہ صحتِ زبان اور ترکیب لفظی کے اعتبار سے ''یاغفور'' مناسب ہے عشق کی مختلف کیفیات میں دن گذر ہی جاتا ہے لیکن رات بڑی مشکل سے کاٹی جاتی ہے۔ یہ ساری آزمائشیں محبت کے لوازمات ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع

دن ہو تو گذر جائے رات آئی تو مشکل ہے

اسی مضمون کو حیرت بدایونی نے یوں باندھا ہے۔

بسر ہوتی ہے کہاں، مردِ خوش اوقات کی رات ... دن تو کٹ جاتا ہے، مسجد میں مگر یہ مت پوچھ

محبوب کے ناز، ادا، شعبدہ اور آنکھوں کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

انجمن تھی کہ تماشائے طلسمات کی رات ... ناز، تسخیر، ادا، شعبدہ، آنکھیں، جادو

غزل کو مسلسل بنا کر اسکے اشعار میں دلی کیفیات کو سمونے میں علامہ حیرت کو بڑا کمال حاصل ہے۔ اور انکے انداز میں محبوب کا آنا بڑا خوش کن ہوتا ہے لیکن اس کے رخصت کا تصور غمناک ہوتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

بے وفا دیکھ نہ جا ٹھہر بھی جا رات کی رات ... وقت جاتا ہے تو پھر لوٹ کے آتا ہی نہیں

ان اشعار سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کے روایتی انداز اور خاص طور پر محبوب سے شوخی کو علامہ حیرت بدایونی نے اپنے کلام میں کس طرح استعمال کیا۔ جس میں رومانیت اور جمال پرستی خاص طور پر محسوس کی جاسکتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ حیرت بدایونی اردو غزل کو اس کے ابتدائی مفہوم یعنی ''عورتوں سے باتیں کرنا'' حد تک محدود رکھتے ہیں اسی لیے ان کی غزلوں میں حُسن و عشق کی بے شمار کارفرمائیوں کا ذکر لطیف انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جمالیاتی اور رومانی خیالات سے علامہ حیرت بدایونی کی فطری وابستگی ہے اور یہی فطری وابستگی سے انکی شاعری عبارت ہے اور وہ اردو غزل کے جمالیات اور رومان پرست شاعر کی حیثیت سے وہ انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

نواب میر حمایت علی خاں

(ولی عہد بہادر):-

نواب میر حمایت علی خاں بہادر آصفِ سابع کے فرزندِ اکبر تھے جنکو آعظم جاہ بہادر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے انکی تاریخِ پیدائش ۸ر محرم ۱۳۲۵ھ ہے۔[1] شاعری کا ذوق انکو ورثہ میں ملا۔ انکا کلام نہیں معلوم کن وجوہات کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ انکی غزل کے دو اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

جان دینا ہی پڑا مجھکو قضا سے پہلے — مار ہی ڈالا مجھے ناز و ادا سے پہلے
کام یاں ہو ہی گیا اپنا دوا سے پہلے — نہیں امید کہ ہو دستِ مسیحا سے شفاء

انکا انتقال ۹ر اکٹوبر ۱۹۷۰ء بروز جمعہ کو حیدرآباد میں ہوا اور تدفین مکہ مسجد میں عمل میں آئی۔[2]

۱۔ "سخنورانِ دکن" (عہدِ عثمانی کے اردو شعراء کا تذکرہ) مرتبہ تمکین عابدی سنہ اشاعت ۱۹۳۹ء صفحہ ۷

۲۔ کتبہ برمزار آعظم جاہ بہادر (نواب میر حمایت علی خاں)

صدقؔ جائسی

صدقؔ جائسی کا نام مرزا تصدق حسین تھا وہ یوپی کے مردم خیز موضع جائس میں پیدا ہوئے جو ضلع بریلی کا قصبہ ہے۔[۱] بصد کوشش اور تلاش کے انکی تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالاتِ زندگی جو پردہ خفاء میں ہیں، معلوم نہ ہوسکے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ شمالی ہند کے روساء اور امراء یعنی نواب صاحب پریاوان، نواب صاحب دوجانہ، نواب صاحب بھوپال اور راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کی مصاحبت اور درباداری میں گذارا۔ حیدرآباد میں ان کا قیام لگ بھگ چھبیس برس رہا۔ حیدرآباد میں ۱۹۲۳ء میں وارد ہوئے۔[۲] ابتداء میں ان کا قیام فصاحت جنگ جلیلؔ کی رہائش گاہ "جلیل منزل" میں رہا۔

صدقؔ جائسی نے حیدرآباد میں اہل علم، وزیرانِ حکومت اور اعلی عہدیداروں میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ فانیؔ بدایونی نے شہزادہ معظم جاہ بہادر کو صدقؔ جائسی کا ایک شعر سنا کر ان کا غائبانہ تعارف کروایا تھا۔

ان کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول　　اور میں کمبخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

اس تعارف کے بعد شہزادہ کو صدقؔ جائسی سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور انہوں نے صدقؔ کو پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا اور اپنے شبانہ دربار سے وابستہ کرلیا۔ صدقؔ خوش گو، خوش فکر شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ برصغیر کے نامور جریدوں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ حیدرآبادی مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ان کی شرکت بالالتزام ہوا کرتی لیکن ادب فراموشی کی یہ انتہا ہے کہ ادبی دنیا نے ان کو یکسر فراموش کردیا ہے۔ ان کے

۱. صدقؔ جائسی مرتب محمد نورالدین خاں صاحب، جنوری ۱۹۹۴ء، صفحہ نمبر ۱۲
۲. " " " " صفحہ نمبر ۱۷، ۱۸

حالات زندگی اور شاعرانہ عظمت کے تعلق سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ دربار شہزادہ معظم جاہ میں ان کی رفاقت فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی اور معز قادری الملتانی وغیرہ کے ساتھ تھی لیکن جوش ملیح آبادی جنہوں نے اپنی کتاب ''یادوں کی بارات'' میں مختلف ادبی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ صدق جائسی کو بھول بیٹھے۔ حالانکہ صدق جائسی نے ''دربارِ دُربار'' میں جوش کے تعلق سے اپنی بے پناہ محبت اور چاہت کا ذکر کیا ہے ؎

بہت آتی ہے یاد اے جوش تیری　　　خدا خوش رکھے تجھ کو تو جہاں ہے

ماہر القادری کے صدق جائسی سے برادرانہ تعلقات تھے لیکن انہوں نے ''یادِ رفتگان'' کے عنوان سے اپنے رسالہ ''فاران'' میں متعدد علما، فضلاء اور شعراء کے انتقال پر تعزیتی مضامین لکھے ہیں لیکن صدق جائیسی کو انہوں نے بھی فراموش کر دیا۔ ۱۹۸۸ء میں ''حیدرآباد میں بیرونی شعراء'' کے زیر عنوان مقالے پروفیسر سیدہ جعفر کی نگرانی میں شائع ہوئے لیکن اس میں بھی صدق جائسی کا کوئی ذکر نظر نہیں آتا۔ سید علی جواد رضوی نے ۱۹۷۵ء میں ۴۲۴ شعراء کا تذکرہ ''قصیدہ نگارانِ اتر پردیش'' کے نام سے تالیف وطبع کیا ان شعراء کی فہرست میں صدق جائیسی کا نام اور تاریخِ وفات کے سوا اور کوئی تفصیلات درج نہیں ہیں۔[1]

ان کے نثری سرمایہ میں ان کی تصنیف ''دربارِ دُربار'' جس کے تعلق سے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں ''آپ کی کتاب ''دربارِ دُربار'' ایک نادر چیز ہے آپ نے جس خوبی سے شہزادہ کے دربار اور وہاں کے امراء کے حالات اپنی دلکش نثر میں بیان کئے ہیں ان کو تاریخی حیثیت حاصل ہو جائیگی۔ یہ آخری دربار تھا اب نہ ایسے شاہ زادے ہونگے اور نہ ایسے دربار، نہ آپ جیسے لکھنے والے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول ہوگی اور اردو ادب میں اسے خاص مقام حاصل ہوگا''[2] خاص اہمیت کی حامل ہے۔ گو اس کے علاوہ ان کے دیگر نثری شاہ کار پند نامہ، حدیثِ دوست اور جواہر الصدق بھی قابل ذکر تصانیف ہیں۔[3]

صدق جائسی تلاش روزگار میں حیدرآباد آئے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے

---

[1] صدق جائسی مرتب محمد نورالدین خاں صاحب، جنوری ۱۹۹۴ء صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱　[3] " " صفحہ نمبر ۲۸

[2] دربارِ دُربار، مصنف صدق جائسی، ناشر حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۲۰۰۱ء صفحہ نمبر ۱۰

دربار میں بھی ان کی حاضری ہوا کرتی تھی چنانچہ چودہ برس بعد جب مہاراجہ کشن پرشاد دوبارہ صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو صدق جائیسی نے ایک قطعہ تہنیت مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا جس کا ایک شعر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔[۱]

چودہ برس کے بعد وہی چودھویں کا چاند   پرتو فگن ہے پھر شرفِ آفتاب میں

مہاراجہ نے قطعہ تہنیت سن کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ مہاراجہ نے ان کی ملازمت کے تعلق سے مدد فرمانے کا وعدہ کیا تھا لیکن عملی طور پر کوئی صورت گری نہیں ہورہی تھی اور صدق جائسی کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا انہوں نے اپنے ان احساسات کو منظوم شکل میں مہاراجہ کو سنایا۔

شرم آتی ہے جو احباب کبھی پوچھتے ہیں   آج تیرے لئے کیا کوئی بھی نکلی نہ سبیل
دم ہے سینے میں خفا اتنی بھی تاخیر ہے کیا   گویا تاخیر ہے مقصد پہ درستی کی دلیل
شوق بے تاب اِدھر اور تمنا بے تاب   مدتِ وعدۂ جاں بخش اُدھر طول طویل
ایسے وعدہ کو ہے درکار حیاتِ الیاس   اس سے سربسر نہیں ہوسکتی میری عمرِ قلیل

اس طرح انہوں نے اپنی منظوم شکایت سے مہاراجہ کو متوجہ کیا اور ان کا مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم پر اردو مدرس کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ وہ مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ پر بھی برسرکار رہے اور طلباء ان سے ادبی استفادہ حاصل کرتے رہے پھر انکا تبادلہ اورنگ آباد ہوگیا اور کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے اور اپنے وطن جائس لوٹ گئے۔[۲] جس طرح ان کی ابتدائی زندگی کے حالات پردۂ خفاء میں ہیں اسی طرح حیدرآباد سے انکی روانگی کے بعد کے حالات بھی پردۂ گمنامی میں ہیں۔ ۲؍جنوری ۱۹۶۷ء کو یہ خوشگو، خوش فکر، بذلہ سنج اور ظریف شاعر جو متاخرین شعراء میں نمایاں مقام کا حامل تھا اپنی اکلوتی صاحبزادی اور اپنا کلام جو انکی معنوی اولاد ہے اور جسکی وجہ سے اردو ادب میں انکا نام باقی رہے گا، تنہا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔[۵]

صدق جائسی بلا کے ذہین تھے اور ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ فصاحت جنگ جلیل سے ان کو تلمذ حاصل تھا وہ اپنی تازہ غزل حضرت جلیل کو بغرض اصلاح سنا رہے تھے کہ انکے

۱۔ صدق جائسی مرتب محمد نورالدین خاں ۱۹۹۳ء صفحہ نمبر ۱۷
۲۔ " " " صفحہ نمبر ۱۷، ۱۸

کسی شعر میں لفظ'' کارگر''، مستعمل ہوا تھا، حضرت جلیل نے فرمایا کہ اردو شاعری میں لفظ '' کارگر''، مستعمل نہیں ہوتا اس کو'' پُراثر'' سے بدلنا مناسب ہوگا۔ صدق جائسی نے سودا کا مطلع حضرت جلیل کے روبرو پیش کیا۔

جی تک تو دے کے لوں میں جو ہو کارگر کہیں　　اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں

حضرت جلیل نے ان کے حافظہ کی تعریف فرمائی۔

صدق جائسی قدیم دبستان شاعری کے پاسدار تھے۔ انہوں نے اپنی غزلیات میں روایتی حسن وعشق کی واردات، ہجر و وصل کی لذتیں، فراق کی دردناک کیفیتوں کو پُراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، شوخی، طراری اور درد کی کسک کے سارے لوازمات ملتے ہیں۔ وہ زبان وبیاں پر کامل گرفت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تشبیہات، استعارے اور محاوروں کا برجستہ استعمال کیا جس کی وجہ ان کی غزلوں میں حسن اور دلکشی دوبالا ہوگئی ان کی ساری غزلیں مرصع ہیں ذیل میں ان کی غزلیات کے چند منتخب اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

کم سنی جب تھی تو کیا کم تھا ترا حسن و جمال　　فرق اتنا ہے کہ اب قاتل ہے جب قاتل نہ تھا

شمع مضطر تھی نظر آتے تھے پروانے اداس　　رات محفل میں جو تو اے رونقِ محفل نہ تھا

وحشت کدۂ دل کا مرے حال نہ پوچھو　　کیا تم نے کوئی خانۂ ویراں نہیں دیکھا

نیچی نظریں تھیں کہ آنکھوں میں نہاں تیر دو تھے　　اک جگر میں چبھ گیا ایک دل کے اندر آگیا

اپنے مریضِ عشق کی حالت نہ پوچھئے　　بالیں سے آپ اُٹھے تھے کہ کہرام ہوگیا

تمہیدِ التفات ہے ان کی یہ بے رُخی　　شوخی کے دن بھی آئیں گے شرم وحیاء کے بعد

کہا میں نے وہ قول تم نے سب بھلا ڈالے　　کہا سہو و خطا سے کون خالی ہے بشر ہوکر

چپ تھے سوالِ بوسۂ لب پر جب سے وہ　　میں کاش انتظار نہ کرتا جواب کا

صدق جائسی کی غزلیات کی طرح ان کی نظموں میں بھی عشقیہ جذبات کی فراوانی ملتی ہے انہوں نے اپنی نظموں میں درد وغم کی دل سوزی اور وصال کی لذتوں کو مخصوص اسلوب میں پیش کرکے اپنے کلام کو بے حد دلکش اور اثر انگیز بنادیا ہے۔ ان کی نظموں کے چند اشعار نموناً پیش ہیں۔

ادھر چمکے ہوئے تاروں کی جھرمٹ میں مہ تاباں ادھر پھولوں کی نازک سیج پر جانِ جہاں ہوگا
کبھی ہنس ہنس کے ذکر آغازِ ایام محبت کا کبھی رو رو کے اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوگا
کبھی دونوں طرف ایک آگ سی بھڑکی ہوئی ہوگی کبھی اک شرم کا ہلکا سا پردہ درمیاں ہوگا

☆☆☆

کچھ نہ پوچھو چشم کیوں پرنم ہیں رخ کیوں زرد ہے کیا سناؤں داستاں میری بہت پردرد ہے

☆☆☆

وہ حسن پہ مغرور ہے ہم عشق پہ نازاں بے وجہ خوشامد کسی عنواں نہ کریں گے
اے وحشتِ دل موسم گل آئے کہ جائے پھر اب کے برس چاک گریباں نہ کریں گے

صدقؔ جائسی کے ہاں موضوعاتی نظموں کی بھی کثرت ہے اس کے علاوہ انہوں نے خمسے بھی کہے ہیں کسی شاعر کی غزل کے مصرعہ یا شعر پر تین مصرعہ اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ تینوں مصرعے ماقبل مصرع یا شعر کے مفہوم ومنشاء سے متعلق ہوجاتے ہیں ذیل میں فصاحت جنگ جلیلؔ کی نعت شریف پر لکھی صدقؔ جائسی کی تضمین پیش کی جاتی ہے (جو خمسے کی شکل میں ہے) جو محمد نورالدین خان صاحب مرتب صدقؔ جائیسی کے مطابق ''اپنے استاد حضرت جلیلؔ کی مندرجہ ذیل نعت کی جناب صدقؔ جائیسی نے تضمین کی ہے وہ بڑی ہی پراثر ہے جس سے عشقِ رسول اللہ ﷺ کے والہانہ جذبات کی نہایت کیف آور ترجمانی ہوتی ہے جو مصرعے اس پر لگائے گئے ہیں اتنے برجستہ اور موزوں ہیں کہ اس نعت شریف کا جز لاینفک معلوم ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مصرعوں کے بغیر اصل نعت کا مفہوم تشنہ رہ جاتا''[1]

جذبِ صادق کب دکھائے گا اثر یا مصطفٰے
شوقِ کامل کب بنے گا راہبر یا مصطفٰے
خاکِ یثرب ہوگی کیا کحل البصر یا مصطفٰے
خواب ہی میں ہوں کسی دن جلوہ گر یا مصطفٰے
ڈھونڈتی ہے تم کو آنکھوں میں نظر یا مصطفٰے

اردو کے نامور شاعر مومن خاں مومن کے ایک شعر پر مرزا غالبؔ اپنا دیوان

[1] صدقؔ جائسی مرتب محمد نورالدین خاں، ۱۹۹۴ء، صفحہ نمبر ۴۷

دینے تیار تھے، صدقؔ جائسی ان کے بڑے پرستار تھے۔ مومن خان مومن نے ایک غزل بہ طرزِ واسوخت کہی تھی ان کی غزل کا مقطع ہے

مومن اُسے سنائیں گے ہم   لکھ اور غزل بہ طرزِ واسوخت

اس غزل کے اشعار پر صدقؔ جائیسی نے بڑی عمدگی سے مومن کی لے میں لے میں ملا کر تضمین کہی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

کیا اس سے باز آئیں گے ہم
اس کی قسم نہ کھائیں گے ہم
ہاں ضد پہ یہ کردکھائیں گے ہم

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

دل پر شبِ غم جو ہوگی بھاری
بہلائیں گے کرکے آہ و زاری
چھوڑیں گے نہ پاسِ وضع داری

گرتری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

پوچھیں گے نہ اب کہ کیوں خفا ہو
اچھا نہیں بولتے نہ بولو
ہم بھی ہیں غیور یادرکھو

دل دے کے اک لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

آنکھوں پہ رہا نہ قابو
پی لیں گے نظر بچا کے آنسو
شوخی سے کسی دن اے ستم جو

گر دیکھ کے ہنس دیا اگر تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

خاتم میں نگیں سہی ترا گھر
تجھ سا ہی حسین سہی ترا گھر
فردوسِ بریں سہی ترا گھر

بُت خانہ چیں سہی ترا گھر
مومؔن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

ذیل میں مومؔن کے ایک مشہور زمانہ مقطع پر صدقؔ جائسی کی تضمین درج کی جاتی ہے۔

عیش و نشاطِ محفل رندانہ چھوڑ کر
کیف و سرور شیشہ و پیمانہ چھوڑ کر
آب وہوائے کوچہ جاناں نہ چھوڑ کر

اللہ رے گم رہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومؔن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

متقدمین شعراء میں سوداؔ ہجو یہ قصیدہ کے نقشِ اول کہلاتے ہیں۔ ان کا مشہور قصیدہ ''تضحیک روزگار'' اردو ادب عالیہ میں خاص مقام کا حامل ہے مابعد انشاؔء اور مصحفی نے بھی اس صنف میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ متاخرین شعراء میں صدقؔ جائسی ہجو یہ قصیدے لکھنے میں بے مثل ہیں ان کے ہجو یہ کلام کی زبان سشتہ اور شائستہ تھی جس کا خاکہ اڑایا گیا ہے وہ بھی سنے تو لطف اندوز ہونے اور داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

صدقؔ جائسی ظریف الطبع، ذہین، صاف گو اور شاعر ہونے کی وجہ سے بڑے ذکی الحس تھے۔ جن حضرات کی کج خلقی ان پر گراں گذرتی وہ ان کی ہجو کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے شاعرانہ حسن، تشبیہ واستعارات کے برمحل استعمال، عام فہم زبان اور اپنے مخصوص طنز وظرافت کی وجہ سے ہجو یہ قصائد کو متاثر کن بنا دیا اس طرح یہ ہجویں اردو ادب میں ''ہجو ملیح'' کی اعلی نمونہ قرار پاتی ہیں۔

نواب مہدی نواز جنگ سے وہ اپنے تبادلہ کے تعلق سے مدد کے خواست گار

ہوئے تھے۔ بارہا صدق جائسی کی یاد دہانیاں اور نواب صاحب کی بھولنے کی عادت ثانیہ نے صدقؔ جائسی کو نواب صاحب کو متوجہ کرنے کیلئے منظوم شکایت پیش کرنے پر مجبور کیا۔ اس منظوم شکایت نامہ کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

آپ کے موروث نے وعدہ پہ دیا ہے اپنا سر — آپ کے وعدہ کی ضامن ہے شرافت آپ کی
چھ مہینے ہوگئے وعدہ کو گستاخی معاف — آرزو میری ہے محروم عنایت آپ کی
قدر کا خوگر ہوں نا قدری سے جی گھبرا گیا — شکر ہے لب تک نہیں آتی شکایت آپ کی
مستعد ہجرت کو میں بھی ہوں مگر ہجرت کے بعد — صدقؔ سے خالی نظر آئیگی صحبت آپ کی

صدقؔ جائسی مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم میں بہ حیثیت اردو مدرس کارگر تھے اسی زمانہ میں شیخ ابوالحسن صاحب اس مدرسہ کے پرنسپل تھے جو اپنے شاگردوں کو تعلیم سے زیادہ باغبانی کی طرف رغبت دلاتے صدقؔ جائسی نے انتہائی پرلطف انداز میں انکا منظوم خاکہ پیش کیا ہے جس میں طنز و مزاح اور ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے سنجیدہ لبوں پر بھی تبسم رقصاں ہوتا ہے۔ چند اشعار نموناً درج ہیں۔

افسوس کس عذاب میں مالی کی جان ہے — تگنی کا ناچ اس کو نچاتے ہیں شیخ جی
گرما کی تیز دھوپ میں آسیب کی طرح — سر پر سوار بید ہلاتے ہیں شیخ جی
انسان ہی ہیں پورے نہ بالکل ہی جانور — کھاتے ہیں دھان پان چبھاتے ہیں شیخ جی
لیلائے زر کے عشق نے مجنوں بنادیا — خاک افسروں کے در پہ اڑاتے ہیں شیخ جی
معمول بعد ظہر ہے حضرت کی سیر کا — افسر ہیں مطمئن کہ پڑھاتے ہیں شیخ جی

صدقؔ جائسی ایک عرصہ تک اے سی گارڈ میں سکونت پذیر رہے۔ تلاش بسیار کے بعد انکو ایک ماما ملی جو حبشن تھی اس کے تعلق سے انہوں نے درجہ ذیل رباعی کہی ہے۔

بہ شیفتہ گلاب و چمپا جوہی — شاکی ہے اگر فضول کہہ دے تو ہی
ماما بھیجی یارب تو نے — مگر عجیب کل موہی

جامعہ عثمانیہ میں اردو کی پروفیسری کیلئے صدق جائسی نے مقدور بھر کوشش کی لیکن اعلی ڈگری کے حامل نہ ہونے کی وجہ سے انکا تقرر عمل میں نہ آسکا اور اس جائیداد پر میرٹھ کے سید سجاد کو منتخب کیا گیا جبکہ بہ اعتبار علمی قابلیت صدقؔ جائسی ان سے کئی گنا بہتر

تھے۔ یہ بات صدق جائسی کو ناگوار گذری اور انہوں نے پچپن اشعار پر مشتمل ایک ہجو لکھی جسکو پرنس معظم جاہ بہادر نے اپنے دربار میں فرمائش کر کے سنی اور فرمایا کہ ''میری رائے میں اس ہجو سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے''۔[1]

اس ہجو کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

بھاڑ ایک زمانے تک دلی میں اگر جھونکا　اس سے کہیں اردو کا جلوہ نظر آتا ہے
میرٹھ کا لب و لہجہ چھپتا ہے چھپائے کب　ہر لفظ ہر ایک فقرہ بھونڈا نظر آتا ہے
خلوت ہو کہ جلوت ہو وحدت ہو کہ کثرت ہو　سفلے کو جہاں دیکھو سفلہ نظر آتا ہے
مقصود ریاکاری ہر بات میں رہتی ہے　کمبخت تصنع کا پتلا نظر آتا ہے
پلے تو نہیں رائی اظہار ہے پربت کا　کمبخت طبیعت کا اوچھا نظر آتا ہے
نواب کی نظروں میں عالم ہو کہ علامہ　یاروں کو تو اُلّو کا پٹھا نظر آتا ہے
شاعر کا ہے مطلب کچھ سمجھے ہیں وہ کچھ معنی　اب شعر ہے کیا گورکھ دھندہ نظر آتا ہے
لکھوایا جنہیں تھیس وہ ہو گئے پی ایچ ڈی　پر خود وہی کورے کا کورا نظر آتا ہے
ایام جہالت میں تھا مولوی گل خیرو　فیشن زدہ اب مسٹر چڈھا نظر آتا ہے
ہر چند رگڑتا ہے صابون سے چہرہ کو　اس پر بھی وہی کالا کوا نظر آتا ہے
تہذیب نشست اس کی موٹر میں کوئی دیکھے　انگریز بہادر کا کتا نظر آتا ہے
اک آنے میں ایک بوسہ لے لیتے ہیں مالن کا　سیب زقن ان داموں سستا نظر آتا ہے
ہوتے ہیں بڑے بھائی جب واک پر ساتھ انکے　بندر کی معیت میں بکرا نظر آتا ہے

صدق جائسی نہ صرف خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے بلکہ ان کی بذلہ سنجی، ظرافت، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ ''دربارِ دُربار'' میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک دن انکے روبرو شہزادہ کے شبانہ دربار میں ایک ایرانی نژاد بیٹھے ہوئے تھے پرنس نے ان سے فرمایا ''صدق تمہارے سامنے یہ فلاں آغا (نام مجھے یاد نہیں رہا) جو بیٹھے ہیں یہ بیس برس سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ کمال ان کا یہ ہے کہ اس مدت میں اردو ایسی صاف بولنے لگے ہیں کہ تم سن کر حیرت کرنے لگو گے۔'' یہ سن کر صدق

---

1. دربارِ دُربار: مصنف: صدق جائسی ناشر حسامی بک ڈپو اشاعت دوم: ۲۰۰۱ء صفحہ نمبر: ۲۰۹

جائسی کی رگ ظرافت پھڑ کنے لگی اور انہوں نے دس بستہ عرض کیا ''سرکار کے ارشاد میں فدوی کسی شک وشبہ کو دخل دے تو کافر' لیکن ترک ادب نہ ہو اور سرکار اجازت دیں تو فدوی کسی قدر جناب آغا صاحب کا امتحان بھی لے لے۔'' پرنس نے فرمایا ''بہ خوشی اجازت دیتا ہوں' تمہارا جو جی چاہے آغا سے پوچھ سکتے ہو'' صدق جائیسی نے عرض کیا ''زیادہ نہیں صرف ایک مصرعہ کو وہ اپنی زبانِ فیضِ ترجمان سے دہرائیں۔''

کھاوں کِدھر کی چوٹ' بچاوں کِدھر کی چوٹ

پرنس ،صدق جائسی کی شرارت کو سمجھ گئے اور بے اختیار ہنسنے لگے ادھر فانی بدایونی بھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے کچھ دیر بعد سارے درباری بھی بے تحاشہ ہنسنے لگے وہ سمجھ گئے تھے کہ آغا صاحب ''چوٹ'' کی مٹی کس طرح خراب کریں گے اس طرح پورا دربار زعفران زار بن گیا۔[1]

صدق جائسی اولاد نرینہ کی نعمت سے محروم تھے لیکن ان کا کلام اولاد معنوی ہے جو ان کے نام کو اردو ادب میں زندہ رکھے گا۔شاید ان ہی حالات کے پیش نظر ذوق نے کہا ہے:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق　　اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

[1] دربارِ دُربار مصنف صدق جائسی ناشر حسامی بک ڈپو اشاعت دوم ۲۰۰۱ء صفحہ نمبر ۱۵۸،۱۵۷

ابوزاہد سید یحییٰ الحسینی قدر عریضی

قدر عریضی ۱۹۰۱ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے جامعہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کی اور مولوی عالم کا امتحان کامیاب کر کے محکمہ آبرسانی میں ملازمت اختیار کی۔ ان میں بدرجہ اتم علمی ذوق تھا۔ انہوں نے دوران ملازمت منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔[۲] اپنی شاعرانہ زندگی کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔ ''مجھے فطری طور پر کم سنی ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ چنانچہ فارسی اور اردو کلام سننے کی خاطر' میں اکثر قوالی کی محفلوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ خالق کونین نے اپنے کرم سے مجھے موزوں طبیعت پیدا کی اسلئے سترہ سال کی عمر سے میری شاعری کا آغاز ہوا۔''[۳] انہیں سید احمد علی زیرکؔ قنوجی سے تلمذ حاصل تھا۔ زیرکؔ قنوجی کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔ ''میرے استاد میں آلِ رسول مقبول ﷺ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اپنے تلامذہ سے تحفہ یا نذر لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ بوقتِ ضرورت تلامذہ کی ممکنہ مدد فرماتے۔''[۴] زیرکؔ قنوجی کا اپنے تلامذہ کو اصلاحِ کلام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شعر و سخن کے تعلق سے معائب و محاسن کی برمحل تفہیم کرتے۔ مشقِ سخن کیلئے وہ ہفتہ میں ایک بار اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد کرتے۔ کسی معروف شاعر کے دیوان سے ایسا پیش مصرع لیا جاتا جس میں قافیہ اور ردیف موجود ہو۔ وہ اپنے تلامذہ کے اشعار کی برسرِ موقع اصلاح کیا کرتے تھے۔ اس طرح قلیل عرصہ میں انکے تلامذہ پُرگو شعراء بن گئے۔ ان کا حلقہ تلامذہ کافی وسیع تھا۔ اس طرح قدرؔ عریضی کی شعری صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ زیرکؔ قنوجی کے وصال کے بعد قدرؔ عریضی نے نادر علی برترؔ سے فیض تلمذ حاصل کیا۔[۵] قدرؔ عریضی نے اردو فارسی اور عربی ہر سہ زبانوں میں شعر کہے۔ ان کا شعری

۱تا۵ قدر سخن از قدر عریضی ۱۹۶۷ء صفحہ نمبر ۵

سرمایہ چار مجموعاتِ کلام پر مشتمل ہے۔ "قدرِ سخن" حصہ اول حمد و نعت پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۷ء میں طبع ہوا۔ "قدرِ سخن" حصہ دوم منقبتوں پر مشتمل ہے اس کی طباعت ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ چوتھا مجموعہ کلام "شانِ قدرِ سخن" فارسی کلام پر مشتمل ہے۔[1] انہوں نے علم عروض کی تعلیم ضامن کنتوری سے حاصل کی جو علم عروض میں مہارت رکھتے تھے۔[2]

دبستانِ لکھنو کی جانب سے اردو غزل گوئی میں سراپا اور فرضی عشق کی حکایتیں وغیرہ کے مضامین باندھے جانے سے غزل پر جو اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے اردو غزل گوئی پر نکتہ چینیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سرسید احمد خاں کی اصلاحی کوششوں کا بھی اردو غزل پر اثر پڑا اور ان کی ایماء پر الطاف حسین حالی، مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے شعراء کو نظم گوئی کی طرف متوجہ کیا اس طرح اس عہد میں نظم گوئی کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ صنفِ رباعی میں بہت کم شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ قدرؔ عریضی نے حالیؔ نے جس طرح صنفِ نظم کی آبیاری کی ہے اُسی طرح اس صنف رباعی کی بقا و احیاء کیلئے ادارۂ قدرِ ادب قائم کیا جو اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا جہاں پر صرف دوبیتی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ ادارہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ ادارہ قدرِ ادب نے ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکینہ الہام کو جنہوں نے اپنی رباعیات میں اردو کے خوبصورت اور برجستہ محاورات کو رباعی کی انگشتری میں مرصع کیا۔ انکے مجموعے کلام جو رباعیات "الہام اول"، "ثانی" اور "کشکول" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں کو "ماہتابِ رباعی" کے خطاب سے نوازا۔[3]

قدرؔ عریضی نے ۱۹۵۹ء میں بزم سعدی کی بنیاد ڈالی۔ قمر ساحری نے اس بزم کی معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ قدرؔ عریضی کا حلقہ تلامذہ وسیع تھا۔ ان کا حمدیہ اور نعتیہ کلام ان کی خدا اور رسول اللہ سے عقیدت، بے پناہ محبت اور وابستگی کا غماز ہے۔ ان کو علم عروض پر دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں جن بحور کا استعمال کیا ہے اس کا انہوں نے اپنے کلام کے ابتداہی میں ذکر کر دیا ہے۔ خدائے برتر کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور خداوند کریم نے خود قرآن مجید کے تحفظ کی

۱،۲ قدرِ سخن از قدرؔ عریضی ۱۹۶۷ء صفحہ نمبر ۵

۳ مقالہ "آزادی کے بعد حیدرآباد میں غیر مسلم شعراء اور ادبا کا اردو کی ترقی میں حصہ" برائے ایم۔ فل جامعہ عثمانیہ صفحہ نمبر ۸۸

ذمہ داری لی ہے۔ لوگ کلام اللہ کو حفظ کر کے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اسی مضمون کو اپنے حمد یہ کلام میں بحر رمل ہشت رکنی میں باندھا ہے۔

تیرے احکام مٹانے سے نہیں مٹ سکتے قلبِ حفاظ پہ منقوش ہے قرآں تیرا

ربّ العالمین اپنی ساری مخلوقات کو رزق پہنچاتے ہیں۔ اس شانِ رزاقی کو انہوں نے اپنے حمد یہ کلام میں بحر مضارع ہشت رکنی میں باندھا ہے۔

تو قاسمِ ازل ہے تو ساقیٔ ابد ہے ہر اک کے ہاتھ میں ہے لبریز جام تیرا

خداوند کریم ستار العیوب بھی ہیں۔ وہ اپنے مخلوق کی عیب پوشی کرتے ہیں اس مضمون کو انہوں نے بحر رمل مثمن الارکان میں باندھا ہے۔

یوں تو ہے شرمندگی مجھ کو مرے کردار سے عیب پوشی کی مجھے امید ہے ستار سے

باری تعالیٰ کی ایک صفت بے نیازی بھی ہے اس لئے اس کا ایک اسم ''صمد'' ہے اس مضمون کو انہوں نے اپنی حمد میں بحر رمل مثمن الارکان میں باندھا ہے۔

خالقِ کونین ہے تو اے خدائے کارساز تجھ سے وابستہ دو عالم سب سے تو ہے بے نیاز

ذاتِ باری کا احاطہ کرنا ممکن نہیں وہ ظاہر بھی ہے باطن بھی۔ ہر شئے میں اس کا جلوہ موجود ہے۔ رگِ جاں سے زیادہ وقریب ہے گو نظروں سے مستور ہے اس مضمون کو انہوں نے اپنے حمد یہ کلام میں باندھا ہے جو بحر رمل مثمن الارکان میں لکھی گئی ہے۔

تو محیطِ کل بھی ہے اور ہر جگہ موجود ہے دہر کی ہر شئے سے ساجد اور تو مسجود ہے

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ اپنی صفات سے انسان کو متصف کیا اور ساری کائنات اس کو بخش دی۔ اس مضمون کو انہوں نے اپنے حمد یہ کلام میں یوں بیان کیا ہے۔

کر دیئے تو نے عطا انساں کو سب اپنی صفات کر لیا اپنا خلیفہ بخش دی کل کائنات

رسالتماب کی خدمت اقدس میں نعتیہ کلام پیش کرتے ہوئے وہ اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ سرکارِ دو عالم جو سرتاپا مجسم نور تھے ان کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ جو بحر انہوں نے استعمال کی ہے جو بحر ہزج سالم ہشت رکنی ہے۔

رسولؐ اللہ کی بے سائیگی معجز نمائی تھی کہ تھا خود ابر بن کر سر پہ سایہ آپ کے قد کا

اپنی ایک نعتِ شریف میں جو بحرِ رمل مثمن الارکان میں لکھی گئی ہے انہوں نے معراج کی منظر کشی کی ہے۔

دونوں خود مختار ہی آئے نظر معراج میں　　سامنا جب ہوگیا مجبور اور مختار کا

معجزہ شق القمر کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

معجزہ شق القمر کا صاف کہتا ہے یہی　　کام کرتا ہے اشارہ وقت پر تلوار کا

دنیا کی بے ثباتی کا قدؔر عریضی ذکر کرتے ہیں۔

جہاں کارواں کا ہوا تھا قیام　　وہاں کارواں کا نشاں رہ گیا

مکتب عشق کا دستور عاشق سے امتحان لینا ہوتا ہے۔ اس منزل سے فرہاد اور مجنوں وغیرہ بھی گذرے ہیں۔ قدؔر عریضی اپنی غزل کے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

کہو بندہ پرور ہو کس سوچ میں　　ابھی کیا کوئی امتحاں رہ گیا

قدؔر عریضی کہتے ہیں کہ آنسو غم کی زکوٰۃ ہیں اور دردِ حیات سے رحم کے طالب ہیں۔

میرے آنسو ہیں میرے غم کی زکوٰۃ　　رحم فرما اب تو اے دردِ حیات

راہِ عشق میں گم اور منزل سے بے خبری لوازماتِ عشق ہیں۔ قدؔر عریضی کا شعر ملاحظہ ہو۔

کس طرف جانا ہے ناواقف ہوں میں　　پہنچی ہے ایسے دوراہے پر حیات

عشق میں آدمی سب کچھ کھو کر غم کی دولت پاتا ہے اور اس کی آنکھیں نم اور ہونٹوں پر آہ و فغاں ہوتی ہے۔

دل میں درد، آنکھوں میں آنسو، لب پہ آہ　　رہ گیا ہے، اب یہ سامانِ حیات

اپنے اس شعر میں قدؔر عریضی وقت کی قدر کے تعلق سے نصیحت کرتے ہیں۔

وقت پر لے زندگی سے اپنے کام　　کر نہ بعد از وقت تو قدرِ حیات

موجودہ عہد میں رہبروں کی کمی کا وہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ دن گئے کہ راہ نما تھے یہ ہر جگہ　　ملتے ہیں اب نقوشِ صداقت کہیں کہیں

وفا کے تعلق سے قدؔر عریضی کہتے ہیں کہ بھول کر بھی محبت کرنے والے کو اپنے محبوب سے اپنی وفا کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ محبت میں پاسِ وفا لازم ہے۔

کر بھول کے تو اس سے نہ ذکر اپنی وفا کا　　محبوب کو احسان جتایا نہیں جاتا

عشق ایسا روگ ہے اگر وہ لگ جائے تو جان کی گھات ہو جاتا ہے۔

جاں ساتھ لئے جاؤں گا کہتا ہے غمِ عشق آیا ہوں اکیلا میں اکیلا نہیں جاتا

قدؔر عریضی کے کلام میں سلاست، شگفتگی اور تلمیحات کا برمحل استعمال ہے جو انکی شاعری میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ ۱۸ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۸۷ء کی درمیانی شب کو ایک مسالمہ پڑھ کر مکان واپس ہو رہے تھے کہ قلب پر شدید حملے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔[1]

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

---

[1] امجد سے شاذ تک پیشکش روزنامہ سیاست اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۱۸

حلمی آفندی

حلمی آفندی کا نام محمد عباس اور تخلص حلمی ہے۔ وہ ترکی النسل تھے اس لئے انکے نام کے ساتھ آفندی لکھا جاتا ہے۔ انکو اپنے ترکی النسل ہونے پر فخر بھی تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

کیوں نہ ترکی بہ ترکی وہ بولے
ہو جو حلمی رگوں میں ترکی خون

ہزار کوشش کے باوجود انکی تاریخ پیدائش سے واقفیت نہیں ہوسکی۔ انکے ہم عصر شعراء اور خود انکے صاحبزادے رضا آفندی نے بھی اس تعلق سے عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ البتہ انکی تاریخ وفات اہلِ حیدآباد مشکل سے بھول سکیں گے۔ انکا نام عباس تھا اور وہ بارگاہِ ابوالفضل میں برسرِ منبر ۱۹رصفر ۱۳۹۷ھ م ۸رفبروری ۱۹۷۷ء کو رحلت کر گئے۔

قافلۂ حسینیؑ جب لٹ لٹا کر کوفہ سے مدینہ روانہ ہوا تو یہ قافلہ بشیر ابنِ ہزلم کی نگرانی میں مدینہ منورہ روانہ کیا گیا۔ حضرت بشیر محبِّ اہلبیت تھے۔ جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو انہوں نے اہلِ مدینہ کو سانحہ کربلا اور شہادتِ امامِ عالیؑ مقام اور رفقا قافلہ حسینیؑ پر ڈھائے گئے ظلم وستم کی داستان سنائی۔ ۱۹رصفر ۱۳۹۷ھ کو اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے چپ تعزیے نکالے جاتے ہیں اور بارگاہِ ابوالفضل میں حضرت بشیر کی شبیہ میں پچاس برس تواتر سے حلمی آفندی یہ فریضہ بجالاتے تھے۔ حسبِ معمول وہ ۱۹رصفر ۱۳۹۷ھ کو عربی لباس میں ملبوس حضرت بشیر کی شبیہ میں منبر پر آئے اور صدا دی۔ مجلس عزاء میں ماتم برپا ہوا اور وہ لڑکھڑا کر گر گئے اور انکی روح پرواز ہوگئی۔ اسطرح انکی تمنا بر آئی۔ شاید اسی دن کیلئے انہوں نے کہا تھا۔

دم بھی نکلا تو شان سے نکلا اور کس آن بان سے نکلا
روح جس وقت جسم سے نکلی یا محمدؐ زبان سے نکلا

انتقال کے وقت انکی عمر ۷۵ سال بتائی جاتی ہے۔ انکے اہلِ خاندان، احباب اور عاشقانِ اہلبیت شریکِ جنازہ رہے۔ انکی تدفین دائرہ میر مومن میں عمل میں آئی۔

انکے دادا ڈاکٹر حاجی محمد طالب آفندی اور انکے والد محمد جعفر آفندی جو انجینئر تھے ۱۳۱۱ھ میں قسطنطنیہ سے حیدرآباد وارد ہوئے اور حیدرآباد کے محلے ترپ بازار میں سکونت اختیار کی۔ حلمی آفندی، محمد جعفر آفندی کے فرزندِ اول تھے۔ انکی ابتدائی تعلیم حسبِ دستور انکے گھر پر ہوئی۔ سٹی ہائی اسکول سے انہوں نے میٹرک کامیاب کیا۔ انکی شادی ۱۹۳۸ء میں احمد مرزا صاحب منصب دار کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے ہوئی۔[1]

حلمی آفندی خوش نویس بھی تھے۔ محکمہ بابِ حکومت کے صیغہ فرمان سے وابستہ تھے[2] لیکن انکو ملازمت میں کوئی ترقی نہ مل سکی چنانچہ وہ کہتے ہیں

عقل و ہوش و ہنر ہوا باشد وقت بہ زور و زر ہوا باشد
ریس چلتی ہے جب سفارش کی جونیئر سینئر ہوا باشد

سقوطِ حیدرآباد کے بعد وہ مصائب کا شکار ہو گئے۔ ملازمت سے بغیر وظیفہ علحدہ کر دیئے گئے۔ آصفِ سابع کی کرم نوازی سے انکو پرائیوٹ اسٹیٹ صرفِ خاص میں ''صیغہ کارخانہ جات'' ملازمت مل گئی۔ حالات کے انقلاب سے وہ بڑے دل برداشتہ تھے۔ آصفِ سابع بے دست و پا ہو گئے تھے اور انکی حکومت کنگ کوٹھی تک محدود ہو گئی تھی۔ ان حالات کو انہوں نے منظوم پیرایۂ میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو

اب برائے نام اپنی وضع داری رہ گئی دل کو بہلانے کی خاطر شہر یاری رہ گئی
رہ گیا باقی معلق اقتدارِ آصفی کارخانے رہ گئے نگران کاری رہ گئی

حلمی آفندی کو ابتدائی عمر سے شاعری کا شوق تھا۔ حکیم عابد علی غیور کو وہ اپنا کلام بغرض اصلاح بتایا کرتے تھے۔ انکا مجموعہ نوحہ جات ''ساغرآن بنی'' زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے اسکا تیسرا ایڈیشن ۱۴۰۸ھ م ۱۹۸۷ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اسکے علاوہ انکے نوحہ جات کا ایک مجموعہ ''نذرانہ'' ۱۹۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ہم عصر شعراء میں وہ

---

[1] تاریخ وادب مصنف محمد نورالدین خاں سنا شاعت اپریل ۱۹۹۲ء صفحہ ۲۰۳ [2] '' '' صفحہ ۲۰۲

صفی اورنگ آبادی سے زیادہ متاثر تھے۔[۲] انکی توصیف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

شاعرانِ دکن میں اے حلمی مجھکو مرغوب ہے صفی کا رنگ

ایک بار آصفِ سابع نے انکے کلام میں اصلاح فرمائی وہ اس بات کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے اور اپنے نام کے آگے شاگردِ شاہ لکھتے تھے۔ انکا ایک خمسہ ملاحظہ ہو۔

دکن میں کس لئے رتبہ نہ بڑھے حلمی کا
خدا کے فضل سے شاگرد شہر یار کا ہے
کہاں سے دیکھ کہاں تک سخن نے پہنچایا
بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بادشاہِ وقت کے اصلاحِ شعر کا ایک اور واقعہ یوں پیش آیا کہ آصفِ سادس اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں نے یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ایک شعر میں اصلاح کی مہاراجہ نے اس اصلاح کو اپنے لئے باعثِ افتخار قرار دیا اور خود کو شاگرد شاہ کہتے ہوئے فخر کیا کرتے تھے۔[۱]

حلمی آفندی نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، نظم، قصیدہ، قطعات، نعت، مرثیہ، سلام اور نوحہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ طنز و مزاح کے نشتر بھی انکی شاعری میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان نشتروں سے انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی برائیوں اور مغربی تہذیب کی خرابیوں پر نشتر آزمائی کی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار نموناً درجِ ذیل ہیں

حُسن بھی ہے نقاب کے پیچھے مہر ہے ماہ تاب کے پیچھے
ہو گئی عمر رائیگاں اپنی ایک خانۂ خراب کے پیچھے

انہوں نے غالب کی متعدد غزلوں پر خمسے لکھے ہیں۔ ذیل میں ایک خمسہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے

شیشۂ دل میں مئے عشق بھری کس کی ہے
کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بے خبری کس کی ہے
حُسن کس کا ہے یہ جادو نگری کس کی ہے

---

[۱] شاعری میں مہاراجہ شاد کے استاد مضمون از محمد نور الدین خاں اخبار روزنامہ منصف صفحہ۲ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

طنز و مزاح سے پُر اشعار وہ اپنے مخصوص انداز میں سناتے تھے جسکا مقصد معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ اہلِ حیدرآباد انکو "شاعرِ قوم" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ انکا طنز و مزاح سے پُر شعر ملاحظہ ہو۔

شکل دیکھو ہمارے لڑکوں کی   یہ زنانی ہے نہ مردانی

حلمی آفندی ہندو مسلم اتحاد کے نقیب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حسب سابق ہر دو شیر و شکر کی طرح رہیں اور سیاسی مقاصد کے تحت انتشار برپا کرنے والی قوتوں کے شر سے محفوظ رہیں۔

آج پھولوں میں جو پیدا کر رہے ہیں انتشار   ایسے کانٹوں کو چمن سے دور کرنا چاہیئے

ذیل میں انکے چند نعتیہ اشعار درج کئے جاتے ہیں جس سے انکی حضورؐ سے والہانہ عقیدت، محبت اور انکی شفاعت پر کامل یقین کا اظہار ہوتا ہے

کملی اوڑھے ہوئے حبیبؐ آئے   میرے مولا مرے قریب آئے
میں نے آقا کو جب سلام کیا   مجھ سے مولا نے یوں کلام کیا
رُخ پہ سب موت کا پسینہ ہے   غرق ہونے کا اب سفینہ ہے
وقتِ آخر ہے رو رہا ہے تو   منہ کو اشکوں سے دھو رہا ہے تو
ہے یہاں سے وہاں ترا جانا   ہم شفاعت کو ہیں نہ گھبرانا

معراج النبیؐ کے تعلق سے ان کا شعر ملاحظہ ہو۔

فرشِ زمیں سے عرش پہ جانا نہیں کمال   عرشِ بریں سے فرش پہ آنا کمال ہے

میدانِ کربلا میں جنابِ حسینؓ پر جو جور و ستم ہوئے انہیں مسکراتے ہوئے سہا اس مظاہرے پر وہ کہتے ہیں۔

دیکھ اے بے صبر دنیا دیکھ اُس کے صبر کو   صبرِ ایوبیؑ بھی جسے خود دیکھ کر خاموش ہے

نبی کریم اور اہلبیت سے انکی والہانہ محبت نے ان کے کلام میں بلا کا سوز اور گداز پیدا کر دیا ہے۔ رسالتماب کی وفات کا انہوں نے موثر انداز میں نقشہ پیش کیا ہے۔

ملاحظہ ہو

حیدرؓ اٹھا رہے ہیں جنازہ رسولؐ کا ماتم سرا بنا ہے مدینہ رسولؐ کا
سر کو جھکائے روتی ہے بابا کی سوگوار زہرا کی موت ہوگئی مرنا رسولؐ کا

اسوۂ نبیؐ کے تعلق سے انکی فکر ملاحظہ ہو۔

پیٹ پر پتھر بندھے ہیں خشک ہونٹوں کی قسم آمنہؓ کا لعل بھوکا ہے مگر خاموش ہے

نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مردِ مسلم دلیر ہوتا ہے اس میں کب ہیر پھیر ہوتا ہے
وہ نہیں چلتا چالِ روباہی شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے

آج کل ہے اسی کا نام اسلام
خیریت خیریت سلام سلام

اسلام نے مساوات کا درس دیا۔ بہ وقتِ نماز آقا اور خادم ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں چنانچہ شاعرِ مغرب نے کہا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

لیکن تاسف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بسا اوقات یہاں بھی امتیاز برتا جاتا ہے۔

حلمی آفندی اُس تعلق سے کہتے ہیں۔

صفِ اول میں ملتی ہے جگہ سرمایہ داروں کو خدا کے گھر میں جاکر بھی تو دیکھو عید کس کی ہے

ہندو مسلم اتحاد کے تعلق سے وہ بڑے متفکر رہتے تھے چنانچہ انہوں نے ''ایک ہو جاؤ'' کا درس دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو

ہندو مسلم سے ہے مرا کہنا مثلِ شیر و شکر کے تم رہنا
کام دیگی نہ آڑ مذہب کی کیوں لگاتے ہو باڑ مذہب کی
بربریت ہی بربریت ہے ایسی جمہوریت پہ لعنت ہے

نیک دل ہو تو نیک ہو جاؤ
مختصر یہ کہ ایک ہو جاؤ

خواجہ حسن نظامی دہلوی نے حلمی آفندی کے کلام کے تعلق سے رقم طراز ہیں۔

''جناب حکیم محمد عباس حلمی آفندی کو میں نے ایامِ قیام حیدرآباد میں کئی بڑے جلسوں میں نظم خوانی کرتے ہوئے سنا۔ حیدرآباد کے ہندو مسلمان انکی نظموں کو بہت شوق سے سنتے ہیں۔ انکو حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام آصفِ سابع انکو شرفِ ہم کلامی عطا فرماتے ہیں۔ اگرچہ حیدرآباد میں سیاسی انقلاب ہوگیا لیکن علوم وفنون کے لحاظ سے حیدرآباد اب تک اس اونچے مقام پہ ہے جس پر وہ صدیوں سے تھا۔ حلمی آفندی ترکی نسل سے ہیں۔ انکے مشاعرے پڑھنے کا انداز بڑا دلکش ہوتا ہے اور وہ فنی جذبات وخیالات کی بہت اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ میں اگر شاعر ہوتا تو انکی شاعری کی خوبیوں کو بھی یہاں لکھتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ انکا مجموعہ کلام شائع ہونے کے بعد ایسا مقبول خاص وعام ہوگا جیسا کے عام جلسوں میں انکی نظم خوانی مقبول ہوتی ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ حلمی آفندی کا یہ مجموعہ کلام حیدرآباد میں ہمیشہ نیک نام اور مقبولِ خاص وعام ہوگا''۔[1]

حیدرآباد میں عوامی طور پر مقبول اس شاعر کی یہ خوبی رہی کہ حلمی آفندی نے اپنے کلام کو موضوعات سے وابستہ رکھا۔ خمسہ، مسدس اور برجستہ اشعار کے ذریعہ محفلوں میں سماں باندھنے پر وہ بڑے قادر تھے۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں نے ان کے کلام پر توجہ نہیں دی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس برجستہ اور موضوعاتی کلام کہنے والے شاعر کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تاکہ شعروادب میں اس کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا جاسکے۔

1. تاریخ وادب مصنف محمد نورالدین خاں سنہ اشاعت اپریل ۱۹۹۲ء صفحہ ۲۰۷

الحاج مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۷ء کو حیدر آباد کے قدیم محلہ فتح دروازہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۳۲ء ۱۹۳۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۳۴ء ر ۱۹۳۵ء میں اسی جامعہ سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ایل۔ ایل۔ بی میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ حیدر آباد کے ضلع ورنگل منتقل ہو گئے اور تقریباً ربع صدی انہوں نے ورنگل میں وکالت کی۔ وہ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے ریاست بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ ؎۲

وکالت کے ساتھ ساتھ انہوں نے عوامی زندگی میں بھی بھر پور حصہ لیا۔ ۱۹۵۲ء میں کانگریس کی جانب سے انتخابات میں حصہ لیا اور عوام کی اکثریت نے انکو منتخب کیا۔ دوسرے انتخابات میں بھی ان کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اس طرح دس سال تک ریاستی اسمبلی کے رکن رہے۔ وہ نہ صرف صاحبِ طرز شاعر تھے بلکہ اپنے زمانے کے مشہور نثر نگار بھی تھے۔ انکی مزاحیہ تقاریر اور مضامین، انکی مزاحیہ شاعری کے مجموعے اور منتخب مضامین کے علاوہ انکا نعتیہ کلام ''خوشبوئے درد'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

دورانِ طالب علمی میں وہ کالج کی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اسکول ڈے اور کالج ڈے کے مواقع پر ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ان کو ڈرامے میں ''شیطان'' کا پارٹ دیا گیا تھا۔ ڈرامہ میں شکور بیگ کے پارٹ کا وقت قریب آرہا تھا اور وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ منتظمین ان کی تلاش میں سرگرداں تھے اور دریافت کر رہے تھے ''شیطان کہاں ہے'' اسی دوران کسی نے مرزا شکور بیگ کو بحالتِ نماز دیکھ کر اطلاع دی کہ ''شیطان نماز پڑھ رہا ہے۔'' ؎۳ بچپن ہی سے ان

؎۱، ؎۲ خوشبوئے درد (نعتیہ مجموعہ کلام) از مرزا شکور بیگ صفحہ نمبر ۱۴

؎۳ شخصی انٹرویو از مرزا فیاض بیگ صاحبزادے مرزا شکور بیگ بتاریخ ۲۷ نومبر ۲۰۰۱ء

کی تربیت اس انداز سے ہوئی تھی کہ وہ مذہبی مزاج کے حامل ہو گئے تھے اور سونے پہ سہاگہ ان کو قابلِ فخر اساتذہ مولانا مناظر احسن گیلانی' مولانا الیاس برنی اور مولانا عبدالقدیر حسرت کے زیرِ تربیت رہنے کا موقعہ ملا۔

ابتداء میں مرزا شکور بیگ مزاحیہ مضامین لکھتے اور مزاحیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ طبیعتاً وہ ظریف واقع ہوئے تھے۔ ان کی تحریروں سے پطرس بخاری اور ان کی ظریفانہ شاعری سے اکبر الہ آبادی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ طنز اور مزاح کے پیرائے میں معاشرے کی اصلاح ان کا مقصد تھا۔ ان کی شاعری کا محور پند و نصائح اور حُبِ نبیؐ رہا ہے۔

اردو زبان ان کو بے حد عزیز تھی۔ وہ گالیاں سننے بھی تیار رہتے تھے شرط یہ تھی کہ گالیاں اردو میں ہوں چنانچہ وہ اپنے اس خیال کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

عشق میں سختیاں بھی جھیلی ہیں　　کچھ نہ کچھ ہم نے نیکیاں کی ہیں
گالیاں کھا کے اسلئے خوش ہیں　　اس نے اردو میں گالیاں دی ہیں

ان کی ظرافت طبع کا اندازہ ذیل کے شعر سے کیا جا سکتا ہے۔

صحت نے ساتھ چھوڑا' پینا مگر نہ چھوٹا　　بستر پہ لیٹے لیٹے چمچے سے پی رہے ہیں

انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کے مقصد کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

یہ مانا طنز کی تلخی شکر رنجی کی حامل ہے　　ظرافت کی مدد لے کر میں روٹھوں کو مناتا ہوں

قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بھلائی کو یاد رکھنا اور برائی کو بھول جانا خوشیوں کا راز ہے۔

یہی زندہ دلی کا راز ہے مرزا کہ اپنوں کی　　بھلائی یاد رکھتا ہوں' برائی بھول جاتا ہوں

ان کی شاعری کا محور پند و نصائح ہے قوم کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ اعلانِ حکمت نہ اظہار فن ہے　　ظرافت کے پردہ میں دل کی جلن ہے
مری شاعری دعوتِ فکر بھی ہے　　کہیں اس میں فن ہے کہیں اس میں پن ہے

موجودہ دور کے رہنماؤں پر وہ طنز کرتے ہیں۔

ہر وقت جن کو اپنے ہی چارے کی فکر ہے　　ایسے تو زندگی میں کوئی چارہ گر ملے

آج کے زمانے میں تصنع عام ہے۔ ہر جگہ پر یہ لعنت نظر آتی ہے۔

رنگ مصنوعی، چال مصنوعی　　　دانت مصنوعی، زبان مصنوعی
دودھ جب دودھ ہی نہیں یارو　　　دودھ کا ابال ہے مصنوعی

معاشرے کی متعدد خرابیوں کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں اور اپنے مخصوص طنز سے اس کی اصلاح کرنا ان کا مقصد ہے۔ لوگ ہوٹلوں میں دولت لٹاتے ہیں اور گھر کی ضروریات سے لاپرواہ رہتے ہیں۔ ان تلخ حقائق کو انہوں نے اپنے ظریفانہ اسلوب میں یوں احاطہ کیا ہے۔

کٹی جو عمر کسی جگمگاتے ہوٹل میں　　　سقیم ہوگئی حالت غریب خانہ کی

موجودہ بین الاقوامی سیاسی حالات اور طاقت کے جبر کا کس عمدگی سے ذکر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

دید کے قابل ہے ہمدم یہ تضادِ قول و فعل　　　امن کا پرچار بھی جاری ہے بمباری کے ساتھ

اپنی گرتی ہوئی صحت کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

اب تو مرنے کے سوا مرزا کوئی چارہ نہیں　　　صلح نامہ کرلیا صحت نے بیماری کے ساتھ

☆☆☆☆

وہ بھی کیا زمانہ تھا، ہر لحاظ سے ''فٹ'' تھے　　　آج کل یہ حالت ہے، چول چول ڈھیلی ہے

آج کل کی خواتین کے پردہ کے تعلق سے ان کا طنز ملاحظہ ہو۔

قائم ہے تانک جھانک بھی پردہ کے ساتھ ساتھ　　　اس سے یہی ہے ٹھیک کے پردہ نہ کیجئے

دعوتوں میں بعض حضرات کی بسیار خوری کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

پیٹ پر سے جان صدقہ کیجئے گا شوق سے　　　یہ گذارش ہے کہ اپنا گھر سمجھ کر کھایئے

شاعری میں ایک دور میں غم جاناں کا ذکر رہا اور پھر غمِ روزگار بھی موضوعِ سخن ہوا۔ شکور بیگ اس موضوع پر کہتے ہیں۔

وہ دن گئے کہ ہم تھے اور یار کا تصور　　　اس کے سوا ضروری کچھ اور کام بھی ہے

موجودہ عہد میں دوستی اور رشتہ داری میں اخلاص باقی نہ رہا۔ اس نکتہ کو انہوں نے ظریفانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔

دوست آیا نہ رشتہ دار آیا　　　وقت پر کام ساہوکار آیا

شکور بیگ اپنے کلام کے تعلق سے جسمیں طنز کے ساتھ ساتھ خوش کلامی بھی ہے کہتے ہیں۔

مرزا میں ہم نے بے شک یہ خاص بات دیکھی لیتے ہیں چٹکیاں بھی اور خوش کلام بھی ہیں

شکور بیگ نے تقریباً ربع صدی وکالت کی۔اپنے دور کے وہ کامیاب وکیل رہ چکے ہیں اور وکالت ان کا ذریعہ روزگار رہا۔ مشاعروں میں شاعروں کو بھی فیس بعنوان سواری خرچ عموماً دیا جاتا ہے۔ وکالت کے بعد ان کو مشاعرے میں فیس پیش کئے جانے پر وہ کہتے ہیں۔

مبارک ہو غزل پڑھنے کی مرزا فیس لیتے ہیں کہ اب تو شاعری میں بھی وکالت ہوتی جاتی ہے

علم وعمل کے تعلق سے وہ اپنی فکر کا اظہار کر۔تے ہیں۔

علم کے واسطے عمل چھوڑا رہ گئیں فقط مناجاتیں

مرزا غالب سے پہلے کی شاعری کے دور میں ''غم جاناں'' شاعری کا موضوع ہوا کرتا تھا۔ غالب نے غم روزگار کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ مرزا شکور بیگ غمِ روزگار پر اپنی فکر کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

اب ہجر کا ملال نہ فکرِ وصال ہے عاشق کے زیرِ غور غذائی سوال ہے

موجودہ سیاسی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ سیاسی قائدین کے معاندانہ رویہ پر ان کا بھرپور طنز ملاحظہ ہو۔

خبر نہیں ہے کہ لیڈر یہ سن کے کیوں بگڑے عوام لڑتے نہیں ہیں لڑائے جاتے ہیں

جب تک انسان زندہ رہتا ہے عام طور پر اس کے تعلق سے لوگ کم غور کرتے ہیں لیکن بعد از مرگ لوگ ان کے اوصاف کے گن گاتے ہیں۔ مرزا شکور بیگ نے ظریفانہ اسلوب میں اس مضمون کو باندھا ہے۔

پوچھا نہ کسی نے جیتے جی دکھ درد کے ماروں کو مرزا جب جان گئی بے چاروں کی مرحوم بنے مغفور ہوئے

عہدِ جوانی کی لغزشوں کا ذکر کرتے ہوئے شکور بیگ پختہ عمر میں صحیح اور غلط کی تمیز کے تعلق سے کہتے ہیں۔

جوانی میں جانا کہ سب کچھ روا تھا مگر اب تو عیب و ہنر دیکھتا ہوں

ذیل میں ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس میں حق گوئی اور اس کے شاعر پر

اثرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

عمر بھر سب کی نگاہوں میں کھٹکتا رہا　　جرم اتنا تھا کہ حق گوئی میرا مسلک تھا

اسی مضمون کو مرزا شکور بیگ نے ظریفانہ انداز میں باندھا ہے۔

اظہارِ حق میں ہوگیا گستاخ اس طرح　　جیسے کسی کے باپ کا مرزا کو ڈر نہیں

مرزا شکور بیگ نے متعدد قطعات بھی لکھے ہیں لیکن انداز وہی ظریفانہ ہے۔ ذیل کے قطعہ میں مرزا شکور بیگ اپنی وکالت اور طنزیہ شاعری کا ظریفانہ انداز میں ذکر کرتے ہیں۔

قفس میں بھی جو آزادی کے گن گائے وہ طائر ہوں
بس اتنا ہے زیارت گاہِ علم وفن کا زائیر ہوں
حقیقت میں پلیڈر ہوں، زبردستی کا شاعر ہوں
مگر میں ہنستے ہنستے چٹکیاں لینے میں ماہر ہوں

وقت کسی کے روکے نہیں رکتا اگر گھڑی بند بھی ہو جائے تو وقت نہیں تھمتا گو سحر کے وقت مرغ کی بانگ سنائی دیتی ہے اگر کسی وجہ سے مرغ بانگ نہ دے تو سحر پھر بھی نمودار ہوتی ہے۔ اس مضمون کو انہوں نے ظریفانہ اسلوب میں باندھا ہے۔

عمرِ جمہور کی غربت میں بسر ہوتی ہے　　یوں تو گذرے گی اب جیسی گذر ہوتی ہے
رو زمانے کی تو روکے نہیں رکتی مرزا　　مرغ گر بانگ نہ دے بھی تو سحر ہوتی ہے

دورِ غلامی کی تباہ کاریوں کا شکور بیگ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں آزادی کے بعد بھی جان مشکل میں پڑی ہوئی ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو۔

فصلِ گل نے گلشن میں آگ سی لگائی ہے
اب جنوں میں اپنوں کی خنجر آزمائی ہے
غیر کی غلامی میں ہم تباہ تھے لیکن
اپنی حکمرانی میں جان پر بن آئی ہے

طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے بعد شکور بیگ کی شاعری نے کروٹ بدلی ۱۹۶۰ء میں وہ حج کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اس کے بعد سے ان کی شاعری کا رخ نعت

گوئی کی طرف ہوگیا۔ ۱۹۶۷ء سے ان کے انتقال تک وہ ہر سال پابندی سے حج اور زیارت کی سعادت سے مشرف ہوتے رہے۔ اپنے اس مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

میں جھوٹ نہ بولوں گا مُلّا کے ڈرانے سے　　جاتا ہوں مدینہ کو میں حج کے بہانے سے

مرزا شکور بیگ میلادالنبیؐ کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے اور رسولِ کریمؐ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کر کے سامعین کے قلوب کو عشقِ نبی سے گرماتے تھے ۱۹۹۳ء میں ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''خوشبوئے درد'' منصۂ شہود پر آیا۔ وہ اپنی نعتیہ شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں۔

مرزا نے دل کا درد بھرا ہے کلام میں　　بے درد شاعری میں یہ لطفِ سخن کہاں

انہوں نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اپنے احساسات اور تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے۔

ضعیفی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے مگر مرزا　　مدینہ میں طبیعت کچھ جواں معلوم ہوتی ہے

مرزا شکور بیگ کو ذاتِ نبیؐ سے والہانہ عشق تھا جس کا اندازہ ان کے اشعار سے کیا جاسکتا ہے اشعار میں انکی سرکارِ نامدارؐ سے عقیدت، وارفتگی اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یوں مدینے میں آئے مستانے　　شمعِ روشن پہ جیسے پروانے

ذاتِ مآبؐ کی عظمت کا وارفتگی سے اظہار کرتے ہیں۔

ہر بڑے نے بڑا کہا ہے انہیں　　ہیں وہ کتنے بڑے خدا جانے

مدینہ جانے کی کیفیت کو الحاج شکور بیگ نے بڑے ہی نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔

جب دور سے گنبد کے مینار نظر آئے　　قیدی کو رہائی کے آثار نظر آئے

مدینہ سے اپنے وطن مالوف کو واپسی پر وہ اپنے مغموم جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

چھوٹا درِ حبیبؐ تو محسوس یوں ہوا　　جنت ہمارے ہاتھ میں آکر چلی گئی

ان کے اشعار میں نہ پُرشکوہ الفاظ ملتے ہیں نہ انشاء پردازی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی شاعری میں کمال نظر آتا ہے۔ ان کا کلام پُر اثر ہے۔ سامع ہو یا قاری ان کے کلام

۱؎ ''خوشبوئے درد'' سنہ ۱۹۹۳ء صفحہ نمبر ۱۵

سے اس پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل پر اثر کرتی ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو۔

اشعار میں تاثیر کا یہ راز ہے ورزش یہ دماغی نہیں یہ دل کی لگی ہے

آخری زمانہ میں ان کی آواز پہ ضعف غالب آ گیا تھا لیکن ان کے شوق، وارفتگی اور عشق نبویؐ سے ان کے کلام پر شباب پہ شباب آ رہا تھا۔ ان کی زندگی کا مطمع نظر زیارتِ درِ اقدسؐ رہا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

خوشی نہیں ہے مگر آرزو ہے جینے کی زہے نصیب زیارت ہو پھر مدینہ کی

آتشِ عشق میں جلنے والی اور دوسروں کے قلوب میں آتشِ محبت بھڑ کانے والی شخصیت جسے دنیا مرزا شکور بیگ کے نام سے جانتی ہے ۲۲ ر اگست ۲۰۰۰ء کو رحلت کر گئی۔[1] شائد ایسی ہی ہستیوں کی موت پر کسی شاعر نے کہا ہے۔

تمام لفظ پریشاں حرف ساکت ہیں خزاں رسیدہ ہے طرزِ سخن تمہارے بعد

☆☆☆☆
☆☆
☆

[1] شخصی انٹرویو از مرزا فیاض بیگ صاحبزادہ مرزا شکور بیگ مرحوم مورخہ ۲۷ ر ستمبر ۲۰۰۱ء

شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع

سرزمینِ دکن کے حکمرانوں نے ہمیشہ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں ادب اور خصوصاً شاعری کو ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ یہاں کے حکمرانوں نے شاعروں اور ادبا کی نہ صرف سرپرستی کی ہے بلکہ خود انھوں نے بھی شعری ادب میں قابل لحاظ اضافہ کیا ہے۔ قطب شاہی دور میں بادشاہ وقت قلی قطب شاہ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کو اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آصف جاہی عہد حکمرانی میں سلاطینِ مملکت نے شاعروں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ وہ خود بھی شعر گوئی کو شعار بنایا اور ان کے کلام کے مجموعے شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو زبان کی ترقی کیلئے بادشاہ وقت (آصف سابع) نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام اُسی کی ایک کڑی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدرآباد ملک کے مشہور اور قابل شعرا اور ادبا کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسے علمی اور ادبی ماحول میں پرنس معظم جاہ بہادر شجیع نے آنکھ کھولی وہ ۲۱ رڈسمبر ۱۹۰۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ [۱]

پرنس فطرتاً نکتہ رس، شگفتہ دماغ، لطیف اور موزوں مزاج واقع ہوئے تھے۔ ایسے ادب پرور ماحول میں انہوں نے دکن میں موجود سارے نامور شعراء سے اکتسابِ علم وفن کیا۔ ان کے شبانہ دربار میں نامور شعراء اور ادباء شریک رہتے تھے۔ جوشؔ، فانیؔ، صدقؔ جائسی، خمارؔ اور شاہد صدیقی وغیرہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے دربار سے منسلک رہے۔ علامہ نجم آفندی کے حیدرآباد آنے پر۔ پرنس نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کیا اور اپنے کلام کی اصلاح کی ذمہ داری سونپی۔ شہزادہ کے اصرار پر نجم آفندی نے اپنے متعلقین کو

۱۔ شخصی انٹرویو از شہامت جاہ فرزند معظم جاہ بہادر شجیع مورخہ ۶ رنومبر ۲۰۰۳ء

حیدرآباد بلوالیا اور انہوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اس طرح حیدرآباد ان کا وطنِ ثانی بن گیا۔ تجم آفندی اپنے دور کے استادانِ سخن میں شمار کئے جاتے تھے۔ آگرہ میں انہوں نے ایک نعتیہ مشاعرے میں یہ شعر پڑھا تھا۔

صورت گرِ ازل نے تیرے اعتبار پر　　اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنادیا

یہ شعر اتنا مقبول عام ہوا کہ آگرہ کی گلیوں میں لوگ اس شعر کو گنگناتے تھے۔ شائد اس شعر کو بارگاہِ رسالت میں بھی شرفِ قبولیت حاصل ہوئی اسکے بعد ہی ان کی شاعری کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔ انکے مرثیہ کا ایک شعر بھی بڑا مقبولِ عام ہوا۔

غُل ہے فوجِ شام میں عباسؑ کو پانی نہ دو　　ان کے تیور کہتے ہیں دریا اٹھالے جائیں گے

تجم آفندی کا حلقہ تلامذہ بے حد وسیع تھا۔ ان کے شعر کی اصلاح کا طریقہ نایاب تھا۔ وہ شعر میں ہلکا سا ردو بدل کر کے شعر کو بلندی عطا کرتے تھے۔ ایسے لائق استادِ سخن کی رہنمائی اور پرنس کی ذاتی محنت اور لگن نے ان کے کلام کو چار چاند لگادیئے اور کلام کی اشاعت سے پہلے ہی ان کا کلام ملک بھر میں مقبولِ عام ہوگیا تھا۔

خمار بارہ بنکوی پرنس کے کلام کے تعلق سے کہتے ہیں۔ ''ساری کی ساری غزلیں ندرتِ بیان اور ادبی محاسن کی آئینہ دار ہیں۔ جو شعر جس مخصوص کیفیت کے تحت کہا گیا ہے وہ مخصوص کیفیت' زبان و بیان کے حسین امتزاج سے قاری اور سامع پر پوری طرح طاری ہوجاتی ہے۔ حضرت تجمیع کو یہ مہارت حاصل ہے کہ وہ وارداتِ قلبی کی گہرائی تک پہنچ کر مناسب ترین الفاظ کے استعمال سے اس صداقت کی ترجمانی اتنے دلکش انداز میں فرمادیتے ہیں کہ سننے والا اور پڑھنے والا بذاتِ خود اس واردات کا شاہد بن جاتا ہے۔ شاعری میں یہ مقام بڑی جگر سوزی اور مشق مُزاولت کے بعد حاصل ہوتا ہے اس میں سادگی اور تاثیر' محاکات کی فراوانی' اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر کامل عبور جیسی خصوصیات نے سونے پر سہاگا جیسا کام کیا ہے۔ پورا کلام فلسفہ اور بوجھل خیالات سے پاک ہے جو دل پر گذری ہے اس کو من وعن شاعرانہ انداز میں نظم فرمادیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت تجمیع کی آواز ہر شخص کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔''[1]

پرنس کے کلام میں سلاست' شگفتگی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ ان کو علم عروض پر

[1] جذباتِ تجمیع اظہارِ عقیدت' صفحہ نمبر' ۹

عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری قدیم دبستان کی روایات کا تسلسل ہے۔ تجمیع ایک جمال پرست اور حُسن آفرینی کے جوہر دکھانے والے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں احساسات کی گرمی اور تعلقات کے تسلسل کی شدت ہے جسکے ذریعہ وہ محبوب پر فریفتہ اور وارفتہ نظر آتے ہیں۔ معظم جاہ اپنے محبوب کی رفاقت کے چھوٹ جانے پر اپنے احساسات و جذبات کو بیان کرتے ہیں۔

تجمیع آج تنہا چمن میں گئے تھے ۔۔۔ بہت ان کے نقشِ قدم یاد آئے

تجمیع کے جذبات نہ صرف انسانی ہیں بلکہ انکا محبوب بھی گوشت پوست کا انسان ہے چنانچہ اپنے عشق کو زمینی رکھکر تجمیع وابستگی اور چاہت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات بہت کم شاعروں کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ تجمیع دنیا کی بے ثباتی کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

جو کلی مسکرائی وہ مرجھا گئی ۔۔۔ زندگی کی حقیقت نظر آ گئی

معظم جاہ تجمیع نے محبوب کی رفاقت اور عدم رفاقت کا موازنہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں نمودِ سحر روشنی بکھیرتی ہے لیکن محبوب کی رخصتی سے روشنی نہیں بلکہ تیرگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جب سویرا ہوا تیرے جانے کے بعد ۔۔۔ اور بھی ہر طرف تیرگی چھا گئی

انقلاباتِ زمانہ کے تعلق سے ان کا تلخ مشاہدہ جو حقیقت پر مبنی ہے ملاحظہ فرمایئے۔

کل اس گھر کے مکیں ہم تھے تجمیع ۔۔۔ آج مہمان بنے بیٹھے ہیں

درج ذیل شعر میں زمانے کی بے ثباتی کے تعلق سے ان کا نظریہ ملاحظہ ہو۔

فاصلہ ہے اک تبسم کا کلی اور پھول میں ۔۔۔ پھول بننا پھر بھی لازم ہے کلی کے واسطے

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ شب اگر گذر جائے اور سحر نمودار ہو تو فراق کی گھڑیاں وقتی طور پر ختم ہو جاتی ہیں اس لئے عاشق سحر کا منتظر رہتا ہے لیکن سحر ہوتی ضرور ہے لیکن اپنے وقتِ مقررہ پر۔ تجمیع نے اس مضمون کو نہایت دلکش انداز میں باندھا ہے۔

رات باقی ہے سو بھی جاو تجمیع ۔۔۔ انتظارِ سحر سے کیا ہوگا

عام طور پر یہ شاعرانہ تخیل ہے کہ محبوب بے وفا ہوتا ہے اور سخت دل ہوتا ہے لیکن

اگر اپنے کئے ہوئے جور و ستم پر محبوب کی آنکھ نم ہو جائے تو تجمیع اس کو زمانے کے مزاج کا تغیر خیال کرتے ہیں۔

تجمیع ان کی آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں　　زمانہ ہے کچھ آج بدلا ہوا سا

شب کے تھکے ہوئے ستاروں میں سحر سے قریب روشنی مدھم نظر آتی ہے۔ محبوب کی آمد کے انتظار میں شب کا بڑا حصہ گذر جاتا ہے اور نمودِ سحر کے آثار نظر آتے ہیں۔ تجمیع نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے۔

شبِ فراق ستاروں میں روشنی کم ہے　　سحر قریب ہے یا آپ آنے والے ہیں

حالاتِ زندگی میں تغیر رونما ہوتا رہتا ہے۔ اس دارِ فانی میں لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مستقل رفاقت عام طور سے ناممکن ہی رہتی ہے۔ اسی خیال کو پرنس بیان کرتے ہیں۔

اک وہ بھی زمانہ تھا اک یہ بھی زمانہ ہے　　اب تو نہیں لیکن ہے ذکر تجمیع ان کا

درد کی شدت میں آنسو بہہ جانا ایک فطری عمل ہے۔ محبوب کی دل جوئی پیش نظر رہتی ہے اور اپنے غم کو آشکار نہ کرنے کیلئے محبوب سے نظریں بچا کر اشک فشانی کی جاتی ہے۔

رونے والے آپ کی نظریں بچا کر رو دیئے　　آپ کیا جانے کہ ضبطِ درد ممکن ہی نہیں

شہزادہ تجمیع اپنے محبوب کے تنہا سیرِ گلشن کو جانے پر کہتے ہیں کہ نہ صرف وہ بلکہ بہار بھی حیران ہے۔

سیرِ گلشن کو وہ جب تنہا گئے　　خود بہاریں ہوگئی حیراں تجمیع

محبوب کی یاد سے ان کی طبیعت پر وارد ہونے والی کیفیتوں کا اظہار انہوں نے بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔

کبھی آنکھوں میں اشک آئے کبھی لب پر ہنسی آئی　　ہمیشہ اک نئے انداز سے یاد آپ کی آئی

شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام میں ایسے خیالات کو بھی رقم کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے جواز اور وجہ جواز کا کوئی نہ کوئی وسیلہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ شاعر کا یہ خیال بھی ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں تک ساتھ وہ آئے وہیں تک زندگی آئی　　رہا کوئی نہ اپنا ہم سفر راہِ تمنا میں

موسمِ بہار میں صیاد کا قفس میں بند رکھنا اور ازراہِ نام نہاد مہربانی، موسم خزاں میں آزاد کرنا۔ اس خیال کو انہوں نے انتہائی نزاکت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مہربانی میرے صیاد کی دیکھے کوئی جب خزاں آئی مجھے قید سے آزاد کیا

شجیع کہتے ہیں کہ محبوب کی یاد آفت سہی لیکن اس یاد کو بھلا دینا مشکل طلب ہے۔

شجیع ایک آفت سہی، یاد ان کی انہیں بھول جانا کچھ آساں نہیں ہے

شہزادہ شجیع کو حضرت علیؑ سے والہانہ عقیدت تھی۔ ذیل کے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی مشکلوں میں کچھ زیادہ دم وخم نہیں ہے۔ ان کو یقین کامل ہے کہ حضرت علیؑ کے نام کی برکت ہی سے ساری مشکلیں رفع ہو جائیں گی۔

شجیع اس زندگی کی مشکلوں میں دم ہی کتنا ہے ذرا ٹھہرو ابھی مشکل کشا کا نام لیتا ہوں

شجیع کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں جذبات کا بہاؤ کے بجائے احساسات کا ٹھہراؤ نظر آتا ہے چنانچہ بیس سال کی عمر میں لکھی گئی ان کی غزل اور عمر کی آخری حد میں لکھی جانے والی غزل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ شروع سے آخر تک شجیع کے جذبات یکساں ہیں اور ان کی شاعری اسی اعتماد کا شکار ہے تاہم خیالات کی گرمی ہر عاشق مزاج کو اپنی آگ میں جھلسا دیتی ہے۔ شجیع کے کلام کی یہی امتیازی خصوصیت ہے۔ حیدرآباد کی یہ وضع دار شخصیت جس نے شعری ادب میں اپنے شگفتہ، نکتہ رس اور لطیف کلام سے اضافہ کیا۔ ۱۳؍ ستمبر ۱۹۸۷ء کو رحلت کر گئی۔ ان کے جسدِ خاکی کو دائرہ میر مومن میں پیوند خاک کیا گیا۔ [1]

☆ ☆

[1] شخصی انٹرویو از شہامت جاہ فرزند معظم جاہ بہادر شجیع مورخہ ۶؍ نومبر ۲۰۰۲ء

علامہ رشید ترابی

علامہ رشید ترابی کا اصلی نام رضا حسین ہے ۲ر جولائی ۱۹۰۸ء کو وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انکے والد شرف حسین صاحب نے انکی تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ رشید ترابی ایک عہد ساز شخصیت کے حامل تھے۔

رشید ترابی کو حیدرآباد کے متوطن ہونے پر ناز نہیں بلکہ حیدرآباد کو ناز ہے کہ حیدرآباد رشید ترابی کا وطن ہے۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا۔[۲] رشید ترابی ایسی شخصیت کا نام ہے جو برسوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ بے مثل خطیب تھے ان کے زورِ خطابت کی دھوم برِ صغیر میں مچی ہوئی تھی۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''شاہِ مرداں'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے شمع خطابت جو حیدرآباد میں فروزاں تھی ۱۹۴۹ء میں کراچی منتقل ہو جانے کی وجہ سے حیدرآباد اس روشنی سے محروم ہو گیا۔ کراچی میں رشید ترابی کی آمد کا خیر مقدم کیا گیا اور لوگوں نے ان کا آنکھیں بچھا کر استقبال کیا۔ امیر سے لیکر غریب تک اور متمول سے لیکر فقیر تک ہر ایک نے ان کی قدر دانی میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی گویا ان کے آنے سے کراچی کے بھاگ کھل گئے اور وہ مرجعِ کمال بن گئے دور دور سے لوگ آتے اور ان کے فنِ خطابت سے استفادہ کرنے آتے۔

بے مثل خطیب کے علاوہ رشید ترابی اچھے شاعر بھی تھے۔ علی حیدر نظم طبا طبائی سے ان کو تلمذ حاصل تھا۔ غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن رہی ہے۔ علامہ اقبال نے جب ''شکوہ'' لکھا تو ملک بھر میں دھوم مچ گئی تھی۔ رشید ترابی نے ''جوابِ شکوہ'' لکھا جو ۱۳۵۲ھ

۱۔ منبر کا دوسرا نام مرتبہ امیر حسین۔ مشرق ان کراچی جنوری ۱۹۷۵ء صفحہ ۷

۲۔ " " " صفحہ ۳۰

میں منظرِ عام پر آیا۔ اسکے بعد علامہ اقبالؔ نے بھی ''جوابِ شکوہ'' لکھا۔ رشید ترابی کے کلام میں سلاست، شگفتگی، نغمگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

کراچی میں رشید ترابی کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ وہ اپنے وطنِ ثانی کے ہی ہو گئے حیدرآباد میں ان کی تقاریر سننے کے لیے ہزاروں کا مجموعہ ہوتا اور کراچی میں ان کی خطابت کے شائقین کی تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ پاکستان میں جب فیلڈ مارشل ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح میں صف آرائی ہوئی اور انتخابات میں عوامی لہر فاطمہ جناح (ہمشیرہ قائدِ اعظم محمد علی جناح) کے حق میں چل رہی تھی۔ صدر مملکت ایوب خاں کے اصرار پر رشید ترابی نے ایک عظیم الشان جلسہ سے خطاب کیا اور مردوں اور خواتین کے فرائض کی ازروئے شریعت حد بندی اور مرد کی عورت پر اسلام میں فضیلت کو واضح کیا۔ ان کے پر اثر اور جامع خطاب نے ہواؤں کے رخ کو بدل دیا اور اس طرح زورِ خطابت کی اہمیت اور اس کے دورس اثرات کی وضاحت ہوگئی۔ رشید ترابی فضائل اور مصائب دونوں کے بیان کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بعض گوشوں پر ان کے اشارے اتنے لطیف ہوتے تھے کہ صرف فکرِ رسا ذہن ہی پر وہ اجاگر ہوتے تھے۔ ان کے موضوعاتی تقاریر جیسے سجدہ، یقین، رزق وغیرہ علمی و ادبی حلقوں میں خاص مقام رکھتے ہیں جن کے سی ڈی کیاسٹس اور آڈیو کیاسٹس حیدرآباد میں بھی دستیاب ہیں۔ رشید ترابی کی زندگی کے آخری دس برسوں کے خطبات اور شاعری میں فلسفہ، گہرائی، گیرائی، اور آہنگ کی بلندی نمایاں ہوتی ہے۔ انہوں نے ایران، عراق، برما، افریقہ اور یورپ کے سفر کئے اور وہاں پر مجالس میں اپنے فنِ خطابت کے جوہر دکھائے اور وہاں کے لوگوں کے قلوب کو یادِ شہدائے کربلا اور فضائلِ اہلِ بیت سُنا کر گرمایا۔[1]

ہر عظیم فنکار کو اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور رشید ترابی اپنے فنکارانہ خطابت کی عظمت سے خوب واقف تھے۔ ایک بار یومِ عاشورہ میں ان کی تقریر کے لیے کراچی کے ٹی۔ وی ڈائرکٹر نے ان کو ایک کم درجہ کے عہدہ دار کے ذریعہ دعوت نامہ بھجوایا۔ جبینِ خطابت شکن آلود ہوگئی اور انہوں نے اس پروگرام میں شرکت نہیں کی بعد میں اعلیٰ عہدہ دار کی سرزنشت پر ہمیشہ خود ڈائیرکٹر بہ نفسِ نفیس انکو دعوت نامہ پہنچایا کرتا تھا۔ اس واقعہ سے

[1] ممبر کا دوسرا نام مرتبہ امیر حسین۔ مشرقی پریس کراچی جنوری ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۲

میر تقی میر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے والیِ لکھنو نواب سعادت علی خاں کے چوبدار کے ذریعہ خلعت اور ایک ہزار روپے بھجوائے جانے پر خفگی سے واپس کر دیے تھے جو بعد میں سید انشاء کے اصرار پر انہوں نے قبول کیا۔ میر بھی یہ فرماتے تھے ان کی شاعرانہ عظمت سے واقفیت رکھتے ہوئے ایک چوبدار کے ذریعہ روانہ کردہ تحفہ قبول کرنا ان کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ میر تقی میر دلی سے لکھنو پہنچنے پر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا نواب آصف الدولہ نے معقول وظیفہ مقرر کیا اور وہ آسودہ زندگی گزار رہے تھے لیکن دلی کی یاد فراموش نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے کہا۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا　　وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ یاں نہ آتا

جوشؔ ملیح آبادی بھی نقلِ مکانی کے بعد مطمئن نہیں رہے چنانچہ آخری زمانے میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے کا ان کو بڑا اخلق رہا لیکن رشید ترابی راضی بہ رضا رہے اور کبھی اس سلسلہ میں اُف تک نہ کی۔ یہ عظیم المرتبت، بے مثل خطیب و شاعر اور ذاکرِ اہلِ بیت ۱۹ر ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ م ۲۱ر ڈسمبر ۱۹۷۳ء کو اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گیا۔[1] شاید ایسی ہی ہستی کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ذیل میں طوالت سے بچنے کے لیے رشید ترابی کے ''جوابِ شکوہ'' کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

شب کو جو دل میں خلشِ خارِ غمِ دوش ہوئی　　فکر فردا سے خرد بڑھ کے ہم آغوش ہوئی
طبع کیفِ مئے پندار سے مدہوش ہوئی　　بہکی اس درجہ کہ آداب فراموش ہوئی

یوں تو رہتی تھی شکایت فلکِ پیر سے بھی
جی میں جو آیا کہا مالکِ تقدیر سے بھی

ناگہاں آئی صدا کان میں قدرت میری　　مجھ سے بندہ مرا کرتا ہے شکایت میری
خیر، گھیرے ہے غضب کو مرے رحمت میری　　صاف دل سے ہے یہ شکوہ بھی عبادت میری

آج تیرا یہ غم مجھ کو بھی محبوب ہوا
غیر سے مری شکایت جو نہ کی خوب ہوا

---

[1] اخبار ''جنگ'' مورخہ ۲۲ر ڈسمبر ۱۹۷۳ء

مصلحت سے مری خوش ہے کوئی، کوئی مغموم ٭ سن مشیعت نہیں اللہ کی پابندِ رسوم
کیا کٹھن رستہ ہے الفت کا تجھے کیا معلوم ٭ منہ لگایا جو ذرا ہم نے تو اس پر ہے یہ دھوم
شمع الفت دلِ عاشق کو جلا دے جب ہے
شام غم صبح مسرت کو ضیا دے جب ہے

تو سمجھتا ہے اُسی بل پر لیے شام وحجاز ٭ تری وہ جرآت وقوت کے تجھے جس پہ ہے ناز
یاد ہے کس کی مدد کے لیے دی تھی آواز ٭ لیکن اے بھولنے والے بشر، اے بندۂ آز
سورۂ فتح میں تھی فتح اشارہ کس کا
جز ہمارے ترے دل کو تھا سہارا کس کا

پردۂ شب میں رہا کرتا تھا مشغول سجود ٭ دن کو کرتا تھا جو دعوائے خدائی نمرود
نگہِ خلق میں ہر چند تھا گمراہ وعنود ٭ ظلم گو نفس پہ اپنے تھا پئے نام ونمود
میری درگاہ میں جب عجز کا تحفہ لایا
اس نے دنیا کی حکومت میں جو مانگا پایا

صاف غیروں سے ملی جاتی ہے، راہیں تیری ٭ ہم خوشی چاہیں تو کس طرح سے چاہیں تیری
وقفِ رنج وغمِ دنیا ہوئیں آہیں تیری ٭ دل کہیں اور ادھر کو ہیں نگاہیں تیری
تجھ میں اگلی سی محبت نہیں وہ بات نہیں
پھر یہ کہتا ہے کہ، پہلی سی مدارات نہیں

رشید ترابی کی غزلوں کے چند متفرق اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں۔

کیا نور کو مٹا سکے گا ٭ سایہ تو مٹا دے اک ذرا سا
وقت آ گیا کھیل وقت سے اب ٭ لے دیکھ پلٹ رہا ہے پانسا

☆☆☆☆

کیا ان کا بھرم دیر وحرم جن کے نہیں ہیں ٭ کوئی تو سہارا بنے بت ہو کہ خدا ہو

☆☆☆☆

وہ چند نفس، نقشِ قدم جن کے نہیں ہیں ٭ کیا عمرِ گذشتہ کے نشاں ڈھونڈ رہے ہو

☆☆☆☆

وہ شمع بجھاتے ہیں کہ ہو جائے یقیں اور ٭ معلوم ہے پروانے حقیقت میں ہیں کتنے

خورشید احمد جامیؔ

خورشید احمد جامیؔ کا پورا نام معہ کنیت و تخلص ابو الحمید خورشید احمد جامیؔ ہے۔ کچھ لوگ انکی تاریخ پیدائش ۸/مارچ ۱۹۱۰ء قرار دیتے ہیں[1] انکے بھائی افتخار احمد اقبال نے راقم الحروف کو شخصی انٹرویو کے دوران ۲۱/دسمبر ۲۰۰۳ء کو بتایا کہ خورشید احمد جامیؔ کی صحیح تاریخ پیدائش ۸/مارچ ۱۹۱۵ء ہے

انکے والد کا نام محمد یعقوب صاحب اور نانا کا نام قاضی صدیق احمد فہیم تھا جو عدالت العالیہ میں بحیثیت وکیل سرکار بر سرِ خدمت رہ چکے ہیں۔ قاضی صدیق احمد فہیم اردو اور فارسی کے اچھے شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد میں شہرت رکھتے ہیں۔ اسطرح خورشید احمد جامیؔ کو ایک علمی اور ادبی ماحول میں نشو و نما کا موقع ملا۔ خورشید احمد جامیؔ کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں افغانستان اور ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ اورنگ آباد اور پربھنی میں انکے بزرگ عہدۂ قضات پر مامور تھے۔ خورشید احمد جامیؔ کے نانا قاضی صدیق احمد فہیم حیدرآباد آئے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کی۔

خورشید احمد جامیؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی بعد ازاں انہوں نے السنہ الشرقیہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور کچھ عرصہ تک وہ محکمہ آبکاری سے وابستہ رہے لیکن بہت جلد اس ملازمت سے بیزار ہو گئے اور اسے ترک کر دیا بعد میں ہمہ تن اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ ابتدائی زندگی میں انکو فوٹو گرافی اور میجک (Magic) سیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا ورزش کا شوق بچپن سے تھا۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے جاسوسی ناول جو تیرتھ رام فیروزی نے لکھے تھے ا

۱۔ انجم سے شاذ تک ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد سنہ اشاعت اپریل ۸۸ء صفحہ ۵۶

نکا بڑے ذوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اردو، فارسی کے مشہور شعراء کے کلام سے وہ فیض یاب ہوئے انکی ابتدائی شاعری روایتی گل وبُلبل کی شاعری تھی حیدرآباد کے استاد شاعر علی اختر سے بھی فیض یاب ہوئے لیکن جلد ہی انکی شاعری نے کروٹ بدلی اور انہوں نے غزل کو ایک نیا لہجہ اور اسلوب دیا۔ اس لیے انکو برِصغیر کے کئی نقادوں نے جدید غزل کا امام کہا ہے خورشید احمد جامؔی رسائل اور کتابوں کے شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ برِصغیر کے معیاری رسائل اور اخبارات میں انکا کلام شائع ہوتا تھا اسطرح علمی اور ادبی حلقوں میں انکی شاعری کے ڈنکے بجنے لگے لیکن انہوں نے مشاعرے کم پڑھے۔ انکی شاعری کی شہرت شعری مجموعوں، رسائل اور اخبارات میں کلام اشاعت کی وجہ سے ہوئی تھی۔

خورشید احمد جامؔی کی شعری اور نثری تخلیقات بڑی تعداد میں ہیں انکے علاوہ انکے منظوم ڈرامے جو اکثر وبیشتر ریڈیو سے نشر کیے جاتے تھے ان کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے انکے شعری مجموعے ''رخسارِ سحر''، ''برگ آوارہ''، ''قسمت عرض ہنر'' اور ''یاد کی خوشبو'' منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ ''رخسارِ سحر'' اور ''برگ آوارہ'' کی اشاعت سے برِصغیر میں انکی شاعری کی دھوم مچ گئی۔[۱] انہوں نے دوسری جنگ عالمگیر کے دوران ''شرارے'' نام سے فسطائیت کے خلاف جنگی نظمیں کہیں ''شمع حیات''، ''نشانِ راہ''، ''منزل کی طرف'' جیسے ناموں سے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ انکی نظموں کا مجموعہ ''تاروں کی دنیا'' (بچوں کی نظمیں) اور ہمارا ہیرو (نثر بچوں کیلئے) زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔[۲] ''ہمہ خاندان آفتاب است'' کی مثال انکے اور انکے بھائیوں پر صادق آتی ہے چنانچہ نظامؔی، جامؔی، خسرؔو، قدسؔی اور اقبالؔ سب ہی حیدرآباد کے معروف شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

خورشید احمد جامؔی کہنہ مشق اور پر گو شاعر تھے کسی نے انکے تعلق سے کہا کہ وہ '' کام بھی شاعری'' کا کرتے تھے۔ جو شاعر جس قسم کا کلام مانگے ڈھال کر فوراً دے دیتے تھے۔ وہ شاعری کو ذریعہ شہرت نہیں بلکہ ذریعۂ روزگار جانتے تھے۔ کتنے ہی متشاعروں کو انہوں نے شاعر بنا دیا اس طرح حضرت مصحفؔی کی روایت پھر سے تازہ ہوگئی۔ ۱۹۵۸ء سے انکی شاعری نے نیا موڑ لیا انکے کلام میں مانوس اور مقبول لفظیات، علامات، تراکیب ملتی ہیں۔ وہ خود اپنی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں۔

---

[۲] شخصی انٹرویو از افتخار احمد اقبالؔ برخوردار خورشید احمد جامؔی مورخہ ۲۱ ڈسمبر ۲۰۰۳ء

دیار شعر میں جامیؔ قبول کرنہ سکا　　میرا مذاق روایت کی حکمرانی کو

اپنی شاعری کے تعلق سے خورشید احمد جامیؔ کہتے ہیں ''آج کی غزل نہ میر و مومنؔ کے زمانے کی غزل ہے نہ آج کا محبوب میر و مومن کے زمانے کا محبوب، ان بستیوں کو جہاں ''نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی'' کا جادو چلتا تھا میں نے دیکھا ہی نہیں اور نہ غزل کے اُس پُر اسرار طلسماتی ماحول کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ ہے جسکی مہکی ہوئی سرگوشیاں، کوچۂ دلدار تک محدود تھیں۔ میرا عہد تو ایک ایسا انقلاب آفریں عہد ہے جسکی پھیلی ہوئی بانہوں میں تاریخِ انسانی کے صدیوں پرانے خواب اپنی تعبیروں کے چمکتے ہوئے لب چوم رہے ہیں۔ آج کی زندگی علم و ہنر اور شعر و ادب کی راہوں میں ایک عظیم اور تابناک مستقبل کی آہٹیں سن رہی ہے، کہیں صاف اور کہیں مدھم اور آج تو دل کی ایک ایک دھڑکن میں لاکھوں دھڑکنیں اور ایک آواز میں کروڑوں آوازیں شامل ہوجاتی ہیں اور زندگی اپنی ساری تلخیوں کو بھلا کر کوششوں کو تیز کردیتی ہے۔ نئے ذہن اور نئے شعور کے سویرے میں ایسی ہی ایک حقیری کوشش میری غزلوں میں نظر آئیگی۔ میرے فن نے تجربات کی دھوپ میں جو زخم چُنے ہیں انکو پیار کی خوشبو سے مہکا کر نذرِ حیات کرتا ہوں۔''[1]

انہوں نے نہ صرف قدیم استعاروں کو نئے تلازموں کے ساتھ برتا ہے بلکہ نئے استعارے بھی وضع کیے ہیں۔ انکے کلام میں ''آوارگانِ شوق''، ''دست بیکراں''، ''غمِ روزگار''، ''یادِ جاناں''، ''چراغِ سرِ منزل''، ''صداؤں کے جنگل''، ''خیالوں کی بھیڑ''، ''دل کی دہلیز''، ''رات کی دیوار'' جیسے تراکیب اور اظہارات ملتے ہیں اپنی شاعری کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

تمھارے درد کو سورج کہا ہے　　نیا اسلوب غزلوں کو دیا ہے

خورشید احمد جامیؔ نے اپنے احساسات کو شعری سانچے میں حسی پیکروں کے ذریعہ نظم کیا ہے جس میں تشبیہات کے علاوہ استعارات، صفات اور افعال شعری لوازمے بن جاتے ہیں۔ انکی شاعری کے اجزائے ترکیبی اور انکی رمزیت اور ایمائیت کی ذیل کے اشعار سے وضاحت ہوتی ہے۔

کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے صدیوں کا اندھیرا　　پھرتے ہیں مہ و مہر کی آغوش کے پالے

[1] انتخاب کلامِ جامیؔ سنہ اشاعت مئی ۱۹۹۶ء صفحہ ۵۶

☆☆☆☆

کچھ نہیں ان راستوں میں دور تک کھڑکھڑاتے خشک پتوں کے سواء

مندرجہ بالا شعر میں "راستے" اور کھڑکھڑاتے خشک پتے" الفاظ نہیں بلکہ استعارہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے شعر میں ایمائیت اور ابہام پیدا کرنے کیلئے وہ سارے طریقے استعمال کئے جو اساتذہ کیا کرتے تھے انہوں نے تضادات کو مخصوص انداز میں استعمال کیا ہے اسطرح احساس کا رنگ، مخالف رنگ کے پسِ منظر میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس صنعت میں انہوں نے زیادہ تر نور و ظلمت کے تلازمے استعمال کئے ہیں۔

یوں تو نفس نفس میں اندھیروں کا زہر تھا لیکن نظر نظر میں نئے آفتاب تھے

☆☆☆☆

اسی گلی میں اِسی موڑ کے قریب آ کر میں رک گیا تھا وقت کے قدم نہ رُکے

انہوں نے ارتعاشی مصمتہ /ر/ صفیری اصوات /ہ/ اور /س/ کا تکرار کر کے صوتی کیفیات کو ابھارا ہے۔ ذیل کے اشعار میں /ہ/ اور /س/ کے استعمال سے حسرت اور حرمان کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے

بہت دنوں سے میرے دل کے پاس رہتی ہے

کوئی نگاہ کسی حسرت بیان کی طرح

☆☆☆☆

کوئی کہے تو وقت کے مقتل میں کیا کہے

کس کے لہو سے تر ہے اجالوں کی آستین

ذیل کے شعر میں ارتعاشی مصمتہ /ر/ کی تکرار سے پیدا ہونے والی اضطرابی کیفیت اُجاگر ہوتی ہے۔

مرے قریب ہے اک دور کی صدا جاگی

مری تلاش میں اک بیقرار آنسو ہے

خورشید احمد جامی نے قوافی کے استعمال کے ساتھ ساتھ اصوات کی تکرار سے اپنے کلام کو دلکش بنایا ہے۔ انکے کلام میں مصمتوں اور مصوتوں کی تکرار اور دیگر صنعتوں کے استعمال سے کلام میں نغمگی پیدا ہوئی ہے۔ ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں مختلف اصوات کی تکرار اور اندرونی قوافی کو واضح کرنے کیلئے نشان زد کیا گیا ہے۔

ہائے وہ رسمِ مدارات جنوں بھی نہ رہی
درد میں درد کا انداز بھی کم ملتا ہے

☆☆☆☆

صدیوں سے اسی طرح بھٹکتی ہے خدائی
صدیوں سے اسی طرح خدا عرش نشیں ہے

خورشید احمد جامی نے اچھوتی تشبیہات کا اپنے کلام میں استعمال کیا ہے جسکی وضاحت ذیل کے چند اشعار کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

بھولے ہوئے غموں سے ہوا آج سامنا بچھڑے ہوئے رفیق سرِ رہگزر ملے
ترا وعدہ ہے کہ بجھتا ہوا شعلہ بھی تری یادیں کہ مٹتی ہوئی تحریریں ہیں
یہ شہر کہ صداؤں کے گونجتے جنگل نہ کوئی جسم نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

خورشید احمد جامی نے اپنے کلام میں تشبیہات، استعارے، رمزیت اور رومانیت کو دلکش انداز میں استعمال کر کے شعر کے حُسن میں اضافہ کیا ہے۔

دھول بھی تھی خیالوں کی بھیڑ میں برسوں خود اپنے آپ کو ہم ڈھونڈتے رہے

خورشید احمد جامی نے تضادات کو اپنے اشعار میں استعمال کر کے استعجاب کی کیفیت پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جسکی ذیل کے اشعار سے وضاحت ہوتی ہے

یوں تو نفس نفس میں اندھیروں کا زہر تھا لیکن نظر نظر میں نئے آفتاب تھے
آنکھیں اُداس اُداس تو دل ہیں بجھے بجھے پھرتے ہیں لوگ شہر میں صحرا بنے ہوئے

لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا جس سے شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر کولرج نے کہا ہے اچھی شاعری وہ ہے جس میں بہترین الفاظ، بہترین ترتیب کیساتھ بیان کیے جائیں اور خورشید احمد جامی کو اس

فن میں کمال حاصل تھا۔ ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو انکی شاعرانہ عظمت کے مظہر ہیں۔

زمین پہ چاند اترتا دکھائی دیتا ہے   تیرا خیال بھی مجھ سا دکھائی دیتا ہے
بدلتے جاتے ہیں الفاظ صورتیں اپنی   چلو تو یہ بھی تماشہ دکھائی دیتا ہے
بڑے عجیب ہیں یہ درد و غم کے رشتے بھی   کہ جسکو دیکھیے اپنا دکھائی دیتا ہے

خورشید احمد جامی اپنے اشعار میں اسماء کم اور افعال زیادہ استعمال کرتے ہیں جن سے نغمگی پیدا ہوتی ہے مثلاً

کوئی ہلچل ہے نہ آہٹ نہ صدا ہے کوئی   دل کی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہے کوئی
پہچان بھی سکی نہ میری زندگی مجھے   اتنی روا روی میں کبھی سامنا ہوا

ورڈسورتھ شاعری کے لیے بول چال کی عام زبان پسند کرتا ہے جامی نے بھی شہر کی گلی کوچوں میں بولی جانے والی عام بول چال کی زبان کو شاعری میں استعمال کیا ہے۔

اس طرح تیرے درد کو سینے سے لگا لیا   جیسے کوئی روٹھے ہوئے ساتھی کو منا لے
کس پیار سے جلتے ہوئے احساس کو اپنے   کرتا ہوں مہکتے ہوئے گیتوں کے حوالے

''برگِ آوارہ'' کے مختصر سے پیش نامے میں وہ اپنے تصورِ حیات اور نظریۂ فن کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔ ''وقت کی تیز و تند آنکھوں میں زندگی اس برگِ آواز کی طرح ہے جو اپنا ماضی، حال اور مستقبل کھو چکا ہے۔ جلتی ہوئی، ٹوٹے ہوئے خوابوں اور زخم خوردہ تجربوں کے اس صحرا میں جہاں ہر گزرا ہوا پل ایک صدی کی بات معلوم ہوتا ہے۔ تخلیق اظہار کی مختلف جہتیں ان گنت چھوٹی بڑی آوازوں کے شور میں اپنی آواز کو ڈھونڈنے، پہچانے اور پالنے کی خواہش کے سوا کچھ نہیں۔ فن کی دائمی قدروں اور انمنٹ رنگوں کے بارے میں سوچنا اس دور کا مقدر نہیں ہے۔ عمل اور ردِ عمل کی برق رفتاری صرف لمحاتی تصورات کو جنم دیتی ہے--- اور کل کیا ہوگا یہ کوئی بھی نہیں جانتا ہے''[۱]۔ خورشید احمد جامی کے ہاں غم کی تفسیر کچھ الگ سی ہے وہ غم میں بھی خوشی کا پہلو نکال لیتے ہیں بقول کسی شاعر کے ان کا غم کے تعلق سے مطمع نظر کچھ ایسا ہے۔

میں بھی ہوں خوشی کا معترف لیکن — زندگی ہے تو زندگی غم کی

یہ نامور زود گو برِصغیر کا منفرد لہجے اور اسلوب کے شاعر کو کینسر جیسا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا جو ۱۹۷۰ء میں ان کی موت کا باعث بنا۔

ل انتخاب کلام جامی سنہ اشاعت مئی ۱۹۹۶ء صفحہ ۳۹

مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین کا خاندانی نام ابو سعید محمد مخدوم محی الدین حذری تھا۔ مخدوم محی الدین کے جدِ اعلی رسالتمآبؐ کے نامی صحابی حضرت ابو سعید حذریؓ تھے میٹرک تک ان کا یہی نام درج رہا۔ حیدرآباد کے ضلع میدک تعلقہ اندول میں ان کی پیدائش ہوئی ان کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ موسیٰ ندی میں طغیانی (ستمبر ۱۹۰۸ء) کے وقت مخدوم آٹھ مہینے کے تھے لیکن اسکول کے صداقت نامہ میں سنِ پیدائش ۱۹۱۰ء درج ہے۔[۱] مخدوم محی الدین کے نانا سید زادے تھے نانی پٹھان تھیں انکے والد غوث محی الدین تحصیل میں صیغہ دار تھے عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے ابتداء ہی سے نامساعد حالات سے گزرنے والے بچے آسمانِ شہرت پر اپنی لگن ومحنت کی وجہ سے روشن ستارے بن کر چمکتے ہیں یہی مخدوم محی الدین کیساتھ ہوا وہ چار برس کے تھے، سایہ پدری سے محروم ہو گئے ان کے چچا نے انکی پرورش کی ذمہ داری اپنے سپرد لے لی تھی۔ مخدوم محی الدین کے دو بھائی کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔[۲] انکے والد کے انتقال کے بعد انکی والدہ نے حیدرآباد میں دوسری شادی کر لی تھی۔ مخدوم محی الدین کی اپنی والدہ سے ملاقات انکی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد جب وہ کالج میں داخلہ کیلئے حیدرآباد آئے، تب ہوئی۔

مخدوم محی الدین کی ابتدائی تعلیم قرآن اور گلستان، بوستان کے درس سے شروع ہوئی ۱۹۲۹ء میں انہوں نے میٹرک کامیاب کیا اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا انٹرمیڈیٹ میں انکے اختیاری مضامین اردو، فارسی اور معاشیات تھے۔ مولانا مناظر حسن گیلانی

۱، ۲ ''صبا'' مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۵

دینیات پڑھایا کرتے تھے مخدوم محی الدین ان سے اکثر بحث اور حجت کیا کرتے تھے جسکی وجہ سے اکثر وہ کلاس سے نکال دیے جاتے تھے۔[۱] انہوں نے ۱۹۳۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کیا۔

ہاسٹل کی زندگی میں انکے ساتھی کا ایک نیا دوشالہ جو پیلے رنگ کا تھا چرالیا گیا۔ اسکے بعد دوشالہ کے مالک سے اظہارِ تعزیت کیلئے ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا اس تعزیتی جلسہ میں مخدوم محی الدین نے ایک نظم ''پیلا دوشالہ'' پڑھی۔ مزاحیہ نظموں میں اتنی شہرت کسی اور نظم کو آج تک نصیب نہیں ہوئی یہ دلچسپ نظم درجِ ذیل ہے۔

جس دم یہ سنا چل بسا وہ ناز کا پالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا ۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلاوڑ تھا کہ چٹ کر گیا تجھ کو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔پٹ کر گیا تجھ کو
یہ کون موئے کا ہے نیا تازہ نوالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
وہ مائی ملا کون تھا جو لے اڑا تجھ کو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔چھوڑا وہ کیوں تجھ کو
جانے سے تیرا ہو گیا سب عیش کسالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
کیوں چھین لیا وہ ملک الموت کے بچے ۔۔۔۔۔۔۔۔وہ عقل کے کچے
مجھ سے وہ میرا ماہ جبیں بانکا نرالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
اب کون مجھے گود میں لے لے کے سلائے ۔۔۔۔بے بس ہوں میں ہے ہے
جاتا رہا وہ راحتِ جاں دل کا اجالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ
وہ گرم کُن پہلوئے من بازیبائی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گریم زِجدائی
آں روز بیاد آر کہ من زیرِ تو بالا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیلا دوشالہ

جامعہ عثمانیہ میں مخدوم محی الدین کے قریبی حلقہ احباب میں میر حسن، عزیز احمد، نورالہدیٰ، شنکر جی، اشفاق حسین اور شہریار کاوس جی قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانے میں بہار کا علاقہ زلزلہ سے شدید متاثر ہوا تھا مخدوم محی الدین اور ان کے ساتھیوں نے سونچا کہ کوئی ڈرامہ اسٹیج کر کے اس کی آمدنی بہار کے مصیبت زدوں کو بھجوائی جائے۔ یہ ڈراما ساگر ٹاکیز

۱۔ ''صبا'' مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۷

حیدرآباد کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ مخدوم نے مرشد کا میک اپ خواجہ حسن نظامی کے حلیہ کے مطابق کیا تھا اس ڈرامہ کے ناظرین میں مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، ریذیڈینٹ اور اعلیٰ حضرت آصف سابع تھے۔[۱] ڈرامہ کے بعد مخدوم محی الدین سے انکی نظم " پیلا دوشالہ" سنانے کی فرمائش کی گئی نظم کو سن کر لبِ سلطانی پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

مخدوم محی الدین اپنے ایک نواب دوست جن کی معشوقہ ایک اینگلو انڈین لڑکی تھی اور نواب انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ مخدوم محی الدین کی خدمات خطوط بازی کے لیے حاصل کرتے تھے یہ واقعہ مخدوم کو گوئٹے کو پڑھنے کا محرک ہوا۔ عجیب بات ہے گوئٹے سے اقبالؔ اور فیضؔ بھی متاثر ہوئے اور مخدوم بھی۔[۲] میر کی شاعری میں درویشی، شاذ تمکنت کی شاعری شرافت اور مخدوم کی شاعری میں معصومیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ میر کا شعر ملاحظہ ہو۔

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

شاذ تمکنت کہتے ہیں۔

اس نزاکت سے تیرے دل سے اتر جاؤں گا جس طرح تیرے بدن سے تیرا زیور اترے

اور مخدوم محی الدین کہتے ہیں۔

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم محی الدین کا ترنم غضب کا تھا انکی ابتدائی رومانی نظمیں " طور"، " ساگر کے کنارے" اور " تلنگن" وغیرہ جب مخدوم محی الدین اپنے مخصوص ترنم میں سناتے تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔ مخدوم محی الدین کے کلام میں رعنائی، مترنم بحریں، موزوں ترین الفاظ کی بندش، نغمگی کا باعث ہوتی ہیں۔ نہ صرف انکی غزلیں بلکہ نظمیں بھی بے حد مترنم ہیں جنھیں ملک بھر ہی نہیں بلکہ برِصغیر میں گلوکاروں نے گا کر دادِ تحسین حاصل کی ہے۔ مخدوم کی پابند نظمیں اور آزاد نظمیں بھی بہت ہی متاثر کن اور مترنم ہیں۔ آزاد نظم میں مصرعوں کے اراکین کو توڑ کر مصرعوں کو چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا ہے اسطرح پابند نظم میں بحر کی پابندی کی جو قید ہے اس قید سے آزاد نظم میں شاعر رہائی پاتا ہے۔ اور آزاد نظم میں قافیہ اور

۱۔ " صبا" مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۹

۲۔ عمر گزشتہ کی کتاب از مظفر الحسن مئی ۱۹۷۸ء صفحہ ۳۹

ردیف کی پابندی نہیں کی جاتی بحر کی پابندی سے آہنگ برقرار رہتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی نظموں کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

دلوں میں اژدہامِ آرزو لب بند رہتے تھے　　نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے

☆☆☆☆

جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں　　مئے دوآتشہ کے کیسے مزے آتے تھے جینے میں

☆☆☆☆

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی　　ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

مخدوم محی الدین کی شادی ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ شادی سے پہلے مخدوم نے سلطان بازار کی ایک مسجد میں راتیں سوکر گذاریں۔ شام کے وقت بچوں کو انکے سبق یاد دلا کر کچھ کما لیتے تھے جیب میں پیسے ہوتے تو ہوٹل میں کھانا کھا لیتے ورنہ فاقہ کیا کرتے۔ ایک دفعہ مسلسل دو روز مخدوم کچھ کھانہ سکے اپنے رشتے کے چچا سمیع الدین صاحب کے گھر گئے انکی بیٹی نے دیکھا کہ مخدوم محی الدین بے حد نحیف اور لاغر دکھائی دے رہے تھے کھانے کیلئے پوچھا تو مخدوم انکار نہ کر سکے وہ دخترِ خانہ جلدی جلدی روٹیاں پکائیں اور دستر خوان چنا مخدوم شکم سیر ہو کر کھائے اور اسی لڑکی سے مخدوم کی شادی ہوئی۔[1] مخدوم محی الدین کے دو بیٹے نصرت محی الدین اور ظفر محی الدین ہیں۔ تیسرے بیٹے آصف بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئے اس صدمۂ جانکاہ سے متاثر ہو کر مخدوم نے پر اثر نوحہ "پرسہ" لکھا جس کا آخری شعر درجِ ذیل ہے۔

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی　　ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

مخدوم محی الدین کی ایک لڑکی جسکا انہوں نے رفیعہ لینا (شاید لینن سے لینا نام رکھا تھا) یہ لڑکی بھی اوائلِ عمر میں انتقال کر گئی۔

مخدوم محی الدین نے غزلوں میں شاید ایک یا دو جگہ تخلص کا استعمال کیا ہے ان کا خیال تھا کہ اجتماعی بات میں فرد کا صحت مند پہلو اپنے آپ ہی آ جاتا ہے۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو　　چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یا۔

[1] عمرِ گزشتہ کی کتاب فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی زندگی اور تخلیقات کا تذکرہ از مرزا ظفر الحسن مئی ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۶

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کی تن — رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن

ڈاکٹر ظلِ حسنین کہتے ہیں ''مخدوم نے غزل کو بھی بہت رنگین اور سرخ بنایا ہے۔ اقبالؔ اور فراقؔ کے بعد غزل جس منزل پر جم گئی تھی اس سے آگے لے جانے میں فیضؔ کے ساتھ مخدوم کا بھی بہت ہاتھ ہے''۔ [۱]

مخدوم محی الدین نے روایتی شاعری سے انحراف برتا ہے۔ انکی شاعری میں ساغر و مئے کے تذکرے روایتی محبت کی حکایتیں اور رقیبوں کی شکایتیں اور محبوب کی بے وفائیوں کا ذکر وغیرہ نہیں ملتا بلکہ محنت اور محبت ان کا مضمون ہے اچھے مستقبل کی تمنا اور اس کے لیے جہدِ مسلسل مخدوم کی شاعری کا محور ہے۔

الہیٰ یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو — صدائے تیشہ کامران ہو، کوہ کن کی جیت ہو

۱۹۳۹ء میں مخدوم کا تقرر سٹی کالج میں بہ حیثیت معلمِ اردو ہوا۔ جہاں انہوں نے لگ بھگ دو سال کام کیا اور ۱۹۴۱ء میں مستعفی ہو کر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ [۲] ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء کا عرصہ مخدوم نے گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوشی میں گزارا۔ [۳]

مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے ۱۹۵۸ء میں ''حیدرآباد کے شاعر'' نامی تذکرے میں ان کا کچھ کلام شائع کیا ۱۹۶۰ء میں دہلی ساہتیہ اکیڈیمی نے بھی ان کا منتخبہ کلام شائع کیا ادارۂ مطبوعات مخزنِ حیدرآباد نے ۱۹۵۲ء میں مخدوم کے ''۱۰۰ شعر'' نامی کتاب چھاپی۔ ان کے کلام پر مشتمل شعری مجموعہ ''بساطِ رقص'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا مخدوم کے بعض مجموعوں کے ترجمے تلگو، مرہٹی، بنگالی اور بیرونی زبانوں میں انگریزی، روسی، جرمن اور چیک میں شائع ہو چکے ہیں۔ [۴]

مخدوم محی الدین نے سقوطِ حیدرآباد کے بعد انتخابات میں بھی حصہ لیا اسمبلی انتخابات میں انکے مدِ مقابل معصومہ بیگم انتخاب لڑ رہی تھیں موصوفہ پروفیسر حسین علی خاں کی بیگم تھیں جنکے مخدوم شاگرد تھے معصومہ بیگم نے بتایا کہ وہ اپنے حلقہ انتخاب میں اپنی

۱۔ ماہنامہ ''سب رس'' جنوری ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۰ — ۲، ۳۔ ''صبا'' مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۳۱، صفحہ ۳۲، صفحہ ۳۴

۴۔ ''صبا'' مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۳۱، صفحہ ۳۲، صفحہ ۳۴

تقاریر سے جو اثر قایم کرتی تھیں مخدوم اپنی جوابی تقریروں سے اس کا توڑ کر دیتے تھے لوگوں نے انتخابات کے بعد مخدوم سے دریافت کیا کہ کس طرح وہ معصومہ بیگم کی تقاریر کے تاثر کو جوابی تقریروں سے ختم کر دیتے تھے تو مخدوم نے جواب دیا ''معصومہ بیگم پروفیسر حسین علی خاں کی بیگم ہیں میری طرح ان کی شاگرد تو نہیں ہیں''۔[1]

۱۹۵۳ء میں حیدرآباد میں پہلا کل ہند مشاعرہ اسٹانلی گرلز ہائی اسکول کے احاطہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا جس میں جوش ملیح آبادی جو ایک عرصہ دراز کے بعد حیدرآباد آئے (کیوں کہ سابقہ حکومت حیدرآباد نے انکو شہر بدر کر دیا تھا) شریک مشاعرہ تھے جوش کے علاوہ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، سحاب قزلباش (پاکستانی)، مجروح سلطانپوری وغیرہ اور میزبان شعراء مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، شاہد صدیقی، سلیمان خطیب، سرو ڈنڈا وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ مخدوم محی الدین نے اپنی مشہور غزل پیش کی۔

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں　　موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

علامہ اقبال کے تعلق سے مخدوم نے اپنے احساسات کو یوں منظوم کیا ہے۔

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں　　صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

اور پھر اقبال کی رحلت پر مخدوم نے کہا۔

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا　　امت کا شبِ چراغ اندھیرے میں کھو گیا

انتظار کے موضوع پہ اردو شاعری میں بیشتر اشعار ملتے ہیں لیکن مخدوم نے انتظار کے عنوان پر جو نظم لکھی ہے وہ یقیناً اس موضوع میں اضافہ کی حیثیت کی حامل ہے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے　　سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
بیتاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے　　سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
میرے محبوب میری نیند اڑانے والے　　میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جاتا کہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے　　آ بھی جا تا کہ تیرے قدموں پہ میری جاں نکلے

مخدوم صرف نظموں ہی کے تخلیق کار نہیں ہیں بلکہ صنفِ غزل میں بھی طبع آزمائی

---

[1] عمرِ گزشتہ کی کتاب از مرزا ظفر الحسن مئی ۱۹۷۱ء صفحہ ۴۸

کی ہے چنانچہ ان کے مجموعہ کلام ''گل تر'' کا تقریباً آدھا حصہ اسی صنف پر مشتمل ہے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

تیرے دیوانے تیری چشم و نظر سے پہلے　　دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے

☆☆☆☆

اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے　　قفس کو لے کے اُڑیں گل کو ہم کنار کریں

☆☆☆☆

تحفۂ برگِ گُل و بادِ بہاراں لے کر　　قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

☆☆☆☆

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک　　درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

☆☆☆☆

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دن میں　　خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

☆☆☆☆

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے　　گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

☆☆☆☆

ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں　　تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

سردار جعفری اشعارِ بالا کے تعلق سے لکھتے ہیں'' یہ اشعار تغزل اور معنوی اصول سے بھرپور ہیں اپنے جمالیاتی اظہار کے ان حقائق سے محبت پیدا کراتے ہیں جنھیں شاعر عزیز رکھتا ہے۔ شاعر اور قاری کے درمیان یگانیت کا یہ رشتہ اظہار کی گیرائی اور بیان کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔ مخدوم اس میں اکثر و بیشتر کامیاب ہیں'' مخدوم محی الدین کی نظم ''چارہ گر'' (اک چنبیلی کے منڈوے تلے) فلمی دنیا میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس نظم کی دُھن حیدرآباد کے گلوکار اور میوزک ڈائیرکٹر اقبال قریشی نے بنائی تھی۔ فلمی دنیا میں مخدوم کی پذیرائی کی جارہی تھی۔ گرودت جو مشہور فلم ساز گزرے ہیں انہوں نے مخدوم سے انکی فلم ''کاغذ کے پھول'' میں گیت لکھنے کی خواہش کی تھی۔ گرودت یہ چاہتے تھے کہ مخدوم بمبئی میں رہ کر ہی گیت لکھیں لیکن مخدوم محی الدین کیلئے یہ سہولت بخش نہیں تھا اس لیے معاہدہ نہ

ہوسکا اور گرو دت نے اس فلم کے گانے کیفی اعظمی سے لکھوائے۔ مخدوم محی الدین نے ایک فلم ''برسات'' میں گیت لکھنے کے معاہدے پر دستخط کیے تھے اس فلم کے دو ہی گانے وہ لکھ سکے تھے کہ چل بسے۔ [۱]

اس ہمہ جہتی شخصیت جس نے دیگر امورِ حیات میں بے حد مصروف رہتے ہوئے بھی اردو شعری ادب میں وقیع اضافہ کیا جس نے حیات، کائنات اور زمانے کو ساتھ لیکے چلنے کی تلقین کی۔ خود اس دارِ فانی سے اپنے چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر ۲۵ر اگست ۱۹۶۹ء کوچ کر گئی۔ [۲]

☆☆☆☆☆

[۱] مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے از ڈاکٹر شاذ تمکنت ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۴
[۲] " " " " صفحہ ۲۷

عظمت عبدالقیوم

عظمت عبدالقیوم نواب غوث یار جنگ صوبہ دار گلبرگہ کی بڑی صاحبزادی، چیف انجینئر عبدالقیوم کی شریک حیات اور ڈاکٹر وزارت رسول خاں کی خوش دامن تھیں۔[۱] انہیں عظمتِ غزل کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔[۲] ان کے شعری مجموعے ''زرگل'' ۱۹۴۶ء ''سفروسحر'' (مذہبی شاعری) ۱۹۶۷ء ''رگِ گل'' ۱۹۷۲ء اور ''عظمتِ دکن'' (قومی نظمیں) ۱۹۷۴ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔[۳] انہوں نے شعر کو ہمیشہ تفسیرِ حیات سمجھا۔ ذیل میں ان کے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

فکرِ فردا ' غمِ امروز ' روایاتِ کہن　　کتنی راہیں ہیں تیری راہ گذر سے پہلے

☆☆☆

نمی آنکھوں میں ہو عظمتؔ یہ توہینِ تمنا ہے　　یہاں ہنستے ہوئے ہم غم کی منزل سے گذرتے ہیں

غزل کے علاوہ انہوں نے صنفِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ۲۱ رمئی ۱۹۸۹ء کی ابتدائی ساعتوں میں دکن کی یہ عظیم دختر اپنے کلام اور کارہائے نمایاں کی یاد لوگوں کے دلوں میں چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ انتقال کے وقت انکی عمر ۷۳ سال بتائی جاتی ہے۔[۴]

۱، ۲، ۳ ''شاداب کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر'' سنہ اشاعت ۱۹۹۳ء'' صفحہ ۲۳۶

۴ ''عظمتِ خیال'' مرتب صلاح الدین نیر سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء صفحہ ۲۳۷

شاہدؔ صدیقی

شاہد صدیقی کا پورا نام عبد المتین صدیقی تھا۔شاہدؔ صدیقی کے والد کا نام بشارت اللہ اور والدہ کا نام رابعہ بیگم تھا۔شاہد صدیقی اکتوبر ۱۹۱۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔[۱] شاہد صدیقی کے والدین کثیر العیال تھے شاہد صدیقی ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ابتدائی تعلیم روایتی انداز میں مکان ہی پر ہوئی وہاں ان کو عربی اور فارسی پڑھائی گئی۔شاہدؔ کو مارلین اسلامیہ ہائی اسکول یو۔پی میں شریک کروایا گیا تھا شومیٔ قسمت سے ۷ برس کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے دو سال بعد والدہ نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔اس طرح اس وسیع دنیا میں شاہد بے سہارا ہو گئے اور ان کو زندگی کے شدائد جھیلنا پڑا۔بقول جنابِ میرؔ

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا   مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

شاہدؔ صدیقی میٹرک کامیاب کرنے کے بعد حیدرآباد آئے۔شاہدؔ کو حیدرآباد کا علمی وادبی ماحول بے حد پسند آیا اور انہوں نے حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ابتدا میں وہ کتب خانہ آصفیہ میں وقت گزارتے تھے اسی دوران انھیں ہفتہ وار ''الاعظم'' میں کام مل گیا۔کچھ عرصہ بعد قاضی عبد الغفار نے انکو اپنے اخبار ''پیام'' سے وابستہ کرلیا۔انہوں نے اخبار ''صبح دکن'' میں بہ حیثیت شریکِ مدیر خدمات انجام دیں۔''صبح دکن'' کی مسدودی کے بعد اخبار ''سلطنت'' میں بھی وہ کارگزار رہے۔[۲]

۱۹۵۱ء میں وہ سہ روزہ اخبار ''سنیما'' سے منسلک ہو گئے۔اخبارات سے وابستہ رہتے ہوئے انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کام کیا۔آل انڈیا ریڈیو سے وہ اپنا کلام

۱۔ شاہدؔ صدیقی۔حیات اور کارنامے مقالہ برائے ایم۔فل ۱۹۸۳ء از سیدہ وہاب انساء حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی صفحہ ۲

۲۔ " " " " " " صفحہ ۶

مخصوص ترنم میں سناتے تھے جسے عوام میں سندِ قبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں شاہد صدیقی کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں اردو ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے مامورِ خدمت رہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۳ء شاہد روزنامہ ''سیاست'' میں شیشہ و تیشہ کالم لکھا کرتے تھے جسکو عوام نے بے حد پسند کیا۔ شاہد صدیقی کی خدمات سے ''سب رس''، ''ایوان''، ''چراغ'' اور ''صبا'' جیسے رسائل نے بھی استفادہ کیا۔[۱] شاہد صدیقی عرصہ دراز تک پرنس معظم جاہ کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۴۵ء میں شاہد صدیقی کی شادی طاہرہ بیگم سے نظام آباد میں ہوئی۔[۲]

شاہد صدیقی نے اوائلِ عمر سے ہی شعر گوئی شروع کردی تھی۔ ابتداء میں میکش اکبرآبادی نے انکے کلام کی اصلاح کی۔ شاہد ابتداء میں روایتی انداز کے مشاعروں میں شریک ہوکر داد حاصل کیا کرتے تھے۔ اس سے انکے قدیم شعری اسکول سے وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں کاظم علی صاحب باغ نے (علی اختر مرحوم کے والد اور نظر حیدرآبادی کے دادا تھے) اپنے گھر پر جو دفترِ بلدیہ (سابقہ) کے قریب دارالشفاء میں واقع تھا مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جس میں صرف مدعو شعراء اور باذوق سامعین شریک ہوا کرتے تھے۔ اس مشاعرہ میں سب ہی نامور شعراء شریک ہوتے تھے اس طرح ان مشاعروں کو ایک تاریخی یادگار کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ چند نامور شعراء جو شریکِ مشاعرہ ہوا کرتے تھے انکے نام یہ ہیں۔ علی حیدر طبا طبائی نظم، بے نظیر شاہ، شہزادہ لبیب، نذیر حسن، وحید الدین سلیم، ہادی رسوا لکھنوی۔ مولوی عنایت اللہ ناظم دارالترجمہ، سجاد مرزا دہلوی پروفیسر نظام کالج، اسمٰعیل خاں عالی، مولوی عبدالحق بابائے اردو، نواب میر حسن علی خاں امیر حیدرآبادی، مولانا عبدالواسع پروفیسر جامعہ عثمانیہ، عبدالصمد واصفی، اختر یار جنگ، امیر مینائی، عزیز یار جنگ حیدرآبادی، اصغر یار جنگ جج ہائی کورٹ، مسعود علی محوی رکن دارالترجمہ، عظمت اللہ خاں دہلوی، نثار یار جنگ مزاج، مولانا عبداللہ عمادی، سید سجاد پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ، علی اصغر بلگرامی، نرسنگ راج عالی، رائے جانکی پرشاد، نواب نصیر الدین خاں ناظم دفترِ دیوانی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عصمت اللہ بیگ، ضیاء گورگانی، کاظم

۱۔ شاہد صدیقی۔ حیات اور کارنامے مقالہ برائے ایم۔ فل ۱۹۸۳ء از سید وہاب انساء حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی صفحہ ۷ اور ۸

۲۔ " " " " " " صفحہ ۹

علی باغ، حکیم حبیب اللہ سدھوری، نواب ضیاء یار جنگ، جوش ملیح آبادی، علی اختر، عبد الرحمٰن رئیس مدیرِ وقت وفا قانی، فانی بدایونی، علامہ شمسی، حبیب الدین صغیر، آزاد انصاری، میر مہدی حسین آلم شاگردِ داغ، محمد علی ناظم، تفضل حسین تفضل (مزاحیہ کلام لکھتے تھے) رحمت علی رحمت، غلام مصطفیٰ، رسا حیدر آبادی، وفا حیدر آبادی، توصیف فرزندِ توفیق حیدر آبادی، شیخ احمد شرر اور تمکین کاظمی وغیرہ۔[1]

ان نامی گرامی شعراء حضرات کی موجودگی میں محفلِ مشاعرہ کے رنگ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان محافل میں شرکت سے شاہد نے فانی کا اثر زیادہ قبول کیا اور ان کے کلام میں یاس، قنوطیت اور پست ہمتی کا رنگ واضح نظر آتا تھا۔ علی اختر، فانی، جوش، اور جگر سے شاہد کی ملاقاتیں ہونے لگیں اس طرح شاہد کی شاعری میں نکھار پیدا ہوا اور برسوں کی محنت کا صلہ ان کو حاصل ہو گیا اور شاہد حسین و جمیل شعر کہنے لگے حسن و عشق کے باب کھلے۔ غزل میں جذبات اور احساسات کی رعنائی کے علاوہ رمزیت اور اشاریت سے ان کا کلام سنورتا اور نکھرتا گیا۔ ان ہی کے مندرجۂ ذیل شعر سے ان کی شاعری پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

اجڑ چکی تھی جو محفل سجا گیا کوئی   میں کس زباں سے دوں داد اس کے نغموں کی

شاہد صدیقی کی شاعری میں جو ارتقاء عمل میں آیا وہ نامور شعراء کی فیضِ صحبت کے علاوہ شاہد کے کسب کا نتیجہ ہے۔ شاہد نے سخن فہمی میں محنت کی اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ شہر کے مستند شاعر کہلائے جانے لگے اور انکے اشعار اردو دنیا میں مشہور ہو گئے اور ہر عمر اور طبقے کے افراد نے انکے اشعار سے اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ فیضِ محبت کے تعلق سے جگر فرماتے ہیں۔

فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں   اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

آزادی ہند سے پہلے ویدک دھرم پرکاش (شاہ علی بنڈہ) کی رہائش گاہ پر ایک یادگار مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا اس تاریخی مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کی تھی اور مشاعرہ میں صمد رضوی ساز، اکبر وفا قانی، بدر شکیب، تحسین سروری، نظر حیدر آبادی، سلیمان اریب، نذیر دہقانی، اعجاز حسین کھٹا، علی صائب میاں اور شاہد صدیقی نے شرکت

[1] ماہنامہ "سب رس" اگست ۱۹۶۳ء صفحہ ۷ اور ۸

کی تھی۔ مشاعرہ میں شاہد صدیقی کے اس شعر پر خوب دادِ تحسین دی گئی۔

زحمتِ استقبال کرکے سو گئے میرے اہلِ وطن　　آنکھ کھلی تو گھر پر سارا قبضہ تھا مہمانوں کا!

شاہد کے ہم عصر شعراء میں وجد، مخدوم، اریب اور شاذ کی شاعری کی شہرت ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی درجِ ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

اریب و شاذ، شاہد و مخدوم کی آواز　　دکن کی ہر محفلِ شعر و سخن سے آتی ہے

اس زمانے میں بیشتر قلم کار ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے ادب کے شعری و نثری موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی لیکن روایتی شاعری کے اسلوب کی پاسداری سے بیشتر شعراء اجتناب برت رہے تھے۔ گو کہ شاہد ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن روایتی اسلوب کی پاسداری بھی کیا کرتے تھے اس طرح ترقی پسند تحریک سے متاثر لیکن روایتی اسلوب کی پاسداری کا ایک حسین امتزاج شاہد کے کلام میں ملتا ہے۔ ترقی پسند شعراء اشتراکی نظریات کو ادب میں داخل کرنے لگے تھے۔ انقلاب کی دعوت اس طرح دی جاتی تھی جیسے ادب تخلیق نہ کیا جارہا ہو بلکہ نعرہ بازی کی جارہی ہو نمونہ کے طور پر دو اشعار درجِ ذیل ہیں۔

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں　　قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں

مخدوم

میرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے　　میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

سردار جعفری

نغمگی و موسیقیت شاہد کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ کولرج کے نزدیک شعر کی تعریف، بہترین الفاظ، بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ہے اور شاہد لفظوں کے انتخاب اور اس کی ترتیب میں ماہر تھے اور غور و فکر کے بعد وہ لفظوں کا انتخاب کرتے اور انہیں اس طرح شعر میں پیوست کرتے ہیں کہ دلکش ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ذیل میں شاہد کی غزل کے اشعار بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

قریب و دور سے آتی ہے آپ کی آواز　　کبھی بہت ہے غمِ جستجو کبھی کم ہے

ہم انتظار تیرا عمر بھر کرلیں گے　　مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

۱؎ روزنامہ ''منصف'' ''مضمون'' چارمینار کے دامن میں'' از جہاندار افسر صفحہ ۳ مورخہ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۳ء

یہ کیا ستم ہے کہ احساسِ درد کم ہے　　شبِ فراق ستاروں میں روشنی کم ہے
نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی شمعیں　　نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے
نہ تھے بہارِ چمن میں ہم مگر یہ سنتے ہیں　　ہمارے بعد گلوں میں شگفتگی کم ہے

ذیل میں شاہدؔ کی غزل کے کچھ اشعار درج ہیں جس میں قوم کی بے حالی اور سیاسی محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اے قافلہ والوں سچ کہنا بے وجہ تو ہم ناکام نہیں　　منزل کا تصور عام سہی، منزل کی محبت عام نہیں
صیاد نے کس ہشیاری سے ایک رنگیں پھندا ڈالا ہے　　کچھ لوگ یہ کہہ کر خوش ہیں اب کوئی اسیرِ دام نہیں
کچھ بات تو ہے جو پی پی کر نیت نہیں بھرتی رندوں کی　　یا جامِ بقدرِ بادہ نہیں، یا بادہ بقدرِ جام نہیں

ذیل میں شاہدؔ کی مختلف غزلیات کے چند اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں۔

بادلوں میں اک بجلی لے رہی تھی انگڑائی　　باغباں نے گھبرا کر کہہ دیا بہار آئی
آدمی کے ہاتھوں میں آدمی کو موت آئے　　اس سے بڑھ کے کیا ہوگی زندگی کی رسوائی
تم سحر کے گن گاؤ میں تو یہ سمجھتا ہوں　　مجھ کو نیند میں پاکر رات پھر پلٹ آئی
چارہ گر کے چہرے پر، اک عجیب عالم ہے　　جیسے ناپ ہی لیگا میرے غم کی گہرائی
وہ خلش جسے شاہدؔ ان کی یاد کہتے ہیں　　خلوتوں کی محفل ہے محفلوں کی تنہائی

ذیل کے اشعار میں شاہدؔ نے سیاسی رہبروں کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے۔

نئی زندگی کی ہوا چلی تو کئی نقاب اتر گئے　　جنھیں انقلاب سے پیار تھا وہی انقلاب سے ڈر گئے
مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انہیں شعورِ سفر نہ تھا　　کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے
جسے جستجوئے سکوں رہی، اسے ساحلوں نے ڈبو دیا　　انہیں کوئی موج نہ چھو سکی، جو تڑپ کے پار اتر گئے

۱۹۶۱ء میں نرہرراج ساقیؔ مہتمم محکمہ آبکاری نظام آباد نے نظام آباد میں پہلا کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا مشاعرہ کی صدارت عرشؔ ملسیانی کر رہے تھے جب انہوں نے شاہدؔ کو زحمتِ کلام دینا چاہا تو یوں گویا ہوئے۔

پیارے شاہدِ نازک خیالاں　　عزیزِ خاطرِ آشفتہ خیالاں

شاہدؔ نہ صرف غزل گو شاعر تھے بلکہ انہیں پیروڈی لکھنے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا انہوں نے ایک نظم ''انتخابات'' پیروڈی کی طرز میں لکھی جو ان کی زندگی میں اخبارِ

''سیاست'' میں شائع ہوئی تھی درجِ ذیل ہے۔

دفعتاً شاہِ ظفر۔ ذوق سے فرمانے لگے مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے
پھر مخاطب ہوئے غالب سے کہ برخوردار امتحاں ہے تیرے ایثار کا، خودداری کا
یہ تخاطب ابھی جاری تھا کہ مومن آئے منہ میں اک پان لئے ہاتھ میں دیوان لیے
ان کو دیکھا تو کہا شاہِ ظفر نے ہنس کر آج رونق اردوئے معلیٰ تم ہو
انتخابات کا عالم ہے کھڑے ہو جاؤ اس پہ مومن نے بڑی شان سے شرما کے کہا
''آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے''

۲۱ر جولائی ۱۹۶۲ء کی رات یہ شمعِ شعروادب گل ہوگئی حیدرآباد کی شعری وادبی محفلیں اپنے محبوب شاعر، طنز نگار، ادیب وصحافی جس کو دنیا شاہد صدیقی کے نام سے یاد کرتی تھی ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔ [1]

۵ر اگست ۱۹۶۲ء کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں شاہد کے چاہنے والوں نے شرکت کی اور اردو ہال اپنی کم مائگی کا اظہار کررہا تھا۔ شاہد مرحوم کی بدنصیب بیوہ نے اپنے تاثرات کے اظہار میں درد بھرا پیام بھجوایا تھا جس کے پڑھنے کے بعد شرکائے مجلس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ [2]

سیدہ مجیدہ نے اپنے احساسات اور شدید جذبات کو صفحۂ قرطاس پر اپنے خون سے تحریر کرکے روزنامہ ''سیاست'' میں بہ عنوانِ ''آہ شاہد صدیقی'' اشاعت کیلئے بھجوایا تھا دو شعر نموناً درجِ ذیل ہیں۔

تو جستجوئے منزلِ نو میں کدھر گیا دنیا کو اپنے غم میں المناک کر گیا
ہر دردِ نو کو روح پہ سہتا گزر گیا ہر کوہِ غم کو دیکھتا ہنستا گزر گیا

بانو طاہرہ سعید نے اپنے احساسِ غم کو یوں بیان کیا۔

بجھ گیا اک چراغ اردو کا ہے جگر داغ داغ اردو کا
چل بسا شاہدِ گل رعنا اجڑا اجڑا ہے باغ اردو کا

جناب تمکین سرمست نے شاہد کی موت پر تعزیتی جلسہ میں یہ شعر پڑھا۔

نہ گھبرا قبر کی تنہائیوں سے کہ یہ بھی اک ادائے زندگی ہے

---

1. ماہنامہ ''سب رس'' اگست ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۰
2. " " صفحہ ۱۰، صفحہ ۱۱

سکندر علی وجدؔ

ارض دکن میں اورنگ آباد کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ دکن میں حیدرآباد کے بعد اورنگ آباد دوسرا بڑا ادبی مرکز رہا ہے۔ اس شہر کو یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہاں سے اردو کے اہم اور معتبر شاعر ولی اور سراج کا تعلق رہا ہے۔ ولی اور سراج کی سرزمین سے دوسو برس بعد سکندر علی وجد ۲۲ر جنوری ۱۹۱۲ء کو ویجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انہوں نے گریجویشن کیا اور ۱۹۳۷ء میں سیول سرویس کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں سیول سرویس کے امتحان میں کامیابی کے بعد محکمہ عدلیہ، مال گذاری یا پولیس میں حسب خواہش امیدوار کا تقرر عمل میں لایا جاتا تھا۔ وجد نے عدلیہ کو ترجیح دی اور بہ حیثیت منصف انکا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر صوبہ جات کی تنظیم جدید ہوئی اور سکندر علی وجد کی خدمات، مہاراشٹرا اسٹیٹ کو منتقل کی گئیں جہاں سے ۱۹۶۴ء میں بہ حیثیت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ سے انہوں نے قبل از وقت ملازمت سے وظیفہ پر سبکدوشی اختیار کی۔ ۲

ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے ۱۹۷۰ء میں ان کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ وہ ۱۹۷۲ء تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ ۱۹۷۲ء سے مولانا آزاد تعلیمی سوسائٹی اورنگ آباد کے نائب صدر، انجمن اسلام بمبئی کے ٹرسٹی اور انجمن ترقی اردو ہند کے حیاتی رکن رہے۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کی بہ حیثیت نائب صدر خدمت انجام دیں۔ ۱۹۸۰ء میں اُسی اکیڈمی کے رکن

۲؎ جمال اجنتا، جلال ہمالہ، جولائی ۱۹۸۸ء، صفحہ نمبر ۲۷، ۳۰

نامزد ہوئے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کے لئے ۱۹۸۱ء میں حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کے نائب چیرمین اور مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے رکن کی حیثیت سے ان کو نامزد کیا گیا۔[۱]

سکندر علی وجؔد کے پانچ شعری مجموعے ''منصۂ شہود آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''لہو ترنگ'' ۱۹۴۳ء میں، دوسرا مجموعہ ''آفتاب تازہ'' ۱۹۵۲ء میں، تیسرا مجموعہ ''اوراقِ مصور'' ۱۹۶۲ء میں چوتھا مجموعہ ''بیاضِ مریم'' ۱۹۷۵ء میں اور پانچواں مجموعہ ''انتخاب'' ۱۹۷۷ء میں اردو اکیڈمی لکھنو نے ''بیاضِ مریم'' پر اُن کو پہلے انعام سے نوازا اور ۱۹۷۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے بھی پہلا ایوارڈ عطا کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا کے ترقی اردو بورڈ نے انہیں ۱۹۸۱ء میں وائس چیرمین مقرر کیا۔ اس عہدہ پر فائز رہتے ہوئے سرزمین دکن کا قادر الکلام شاعر ۱۶ رمئی ۱۹۸۳ء کو اپنے پرستاروں کو داغ مفارقت دے گیا۔[۲]

سکندر علی وجؔد اردو کے نامور، باکمال اور منفرد اسلوب کے شاعر تھے وہ گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری سے نہ صرف ملک کا وقار بلند ہوا بلکہ انہوں نے یہاں کے تہذیبی آثار کو اپنی شاعری کے پیکر میں ڈھال کر اس کے حسن میں اضافہ کیا۔ ان کی شاعری میں اجنتا کا حسن، ایلورہ کا جمال، جامعہ عثمانیہ کا وقار اور ہندوستان کی تہذیب کے حسین علامات ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اردو ادب اور تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ وجد بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا وحید الدین سلیم جیسے اساتذہ کے خاص شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

سکندر علی وجؔد کی شخصیت ان کی شاعری کا آئینہ تھی۔ وجد نے اپنی شاعری میں اپنے زمانہ کے اقدار کی ترجمانی کی ہے۔ قدیم دبستانِ شاعری کی روایت کو نیا حسن اور نظم کو جمالیاتی احساس دیا۔ انہوں نے اپنے شعری سرمایہ کو فکر و نظر کی وسعتوں سے مالا مال کیا۔ ان کی شاعری میں غم جاناں اور غمِ دوراں کی حکایتیں ملتی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری میں مناظرِ قدرت اور مظاہر فطرت کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے ساتھ ساتھ انہوں نے سماجی مسائل کا بھی اپنی شاعری میں احاطہ کیا۔

---

[۱] جمال اجنتا، جلال ہمالہ، جولائی ۱۹۸۸ء، صفحہ نمبر ۳۰
[۲] " " " ، صفحہ نمبر ۲۸

مزدوروں کا پیغام' تاج محل' مہاتما گاندھی اور پیغامِ اقبال جیسی نظمیں لکھ کرانہوں نے اپنے ذہنی سفر اور ارتقاء کی بلندیوں کا ثبوت پیش کیا۔ان کی شاہ کار نظم ''اجنتا'' جو اردو ادب میں بلند مقام کی حامل ہے۔جس میں انہوں نے اجنتا کے نقوش کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اس کے علاوہ ان کی نظم ''رقاصہ'' ان کے احساس اور فنی عظمتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ نہ صرف نظموں کے خالق ہیں بلکہ وہ ایک اچھے غزل گو شاعر بھی تھے۔ وجدؔ کی شاعری اپنے دور کے سارے تقاضوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔انہوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم ''اجنتا'' لکھ کر اجنتا کے حسن کو حسین تر بنادیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

چٹانوں پر شباب وحسن کی موجیں رواں کردیں — فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کردیں
یہ تصویریں بہ ظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں — مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں
زمانے کی جبیں پہ عکس چھوڑیں ہیں نگاہوں کے — رہینگے نقش ان کے نام مٹ جائنگے شاہوں کے

سکندر علی وجدؔ نے اپنی شاعری میں زندگی کی صداقتوں کو پیش کیا ہے ان کی شاعری کسی بھی ازم سے متاثر نہیں تھی ان کی شاعری کو ترقی پسند، رجعت پسند یا جدیدیت کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔سکندر علی وجد، مخدوم محی الدین کی ذات اور شاعری سے بے حد متاثر تھے اور ان کی فکر میں مخدومؔ کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

سکندر علی وجد کا منفرد شاعرانہ انداز تھا۔اس دور میں عام طور پر شعراء ایک ہی ڈگر پر چل رہے تھے ان کے افکار اور شاعری میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ وجد نے اپنے منفرد آہنگ اور اسلوب سے ادبی دنیا کو اپنی انفرادیت کی طرف متوجہ کیا۔ان کی شاعری اس دور کے احساسی تاثرات کا اظہار کرتی ہے۔سکندر علی وجدؔ کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی خدا نے انساں کو غور وفکر کی اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ پہلی قوتؔ کا نام ادراک اور دوسری کا احساس، یہ دونوں جذبے شعر کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں اور وجدؔ نے اپنی قوتِ فکر اور احساس سے اپنی شاعری کو جلا بخشی ہے۔

الفاظ کے ذریعہ تصویر بنانا ان کا وصفِ خاص ہے۔ جس کو پیکر تراشی کہتے ہیں اس طرح انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعۂ قاری کے سامنے منظر کو متشکل کردیا ہے۔ شاعری کے لئے غنایت بھی ایک اہم وصف ہے بقول کولرج اچھی شاعری وہ ہے جس میں بہترین الفاظ، بہترین ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ وجدؔ کو لفظوں کے انتخاب اور

ان کی ترتیب میں کمال حاصل تھا۔ ان کی زبان اور بیان پر گرفت مضبوط رہتی تھی انہوں نے ایک جگہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔

پیغمبر برحق ہوں جمالِ ازلی کا
ہر شعر میں ایک معجزۂ خوش نظری کا

ان کی شاعری میں احتجاج ملتا ہے نہ پروپگنڈہ۔ سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے ایسے فرزند ہے جن کو اپنی جامعہ پر فخر ہے تو دوسری طرف جامعہ کے لئے بھی ان کی شاعرانہ عظمت باعثِ افتخار ہے۔ اپنی نظم "مزدوروں کے پیغام" میں جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر اس عمارت کی فن کارانہ تعمیر میں حصہ لینے والے مزدوروں کو وہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہم نے نقشِ ہوس خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

ہر بڑے شاعر کی طرح وجد کو بھی اپنی شاعرانہ عظمت کا انداز تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

دوسو برس میں وجدؔ سراج و ولی کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

ان کو اپنی شاعری کے علاوہ سرزمینِ دکن سے والہانہ محبت تھی جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے۔

فضا جاں فزا ذرہ ذرہ حسین ہے
حقیقت میں ملکِ دکن گل زمیں ہے
اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے
تو بے شک یہیں ہے، یہیں ہے

سکندر علی وجد نے اردو شاعری کی تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان کی غزلیات، نظمیں اور رباعیات قبولیت عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے بعد وزیر اعظم اندرا گاندھی سکندر علی وجد کے کلام کے مداح تھے وہ ان کی مشہور زمانہ نظمیں اجنتا اور ایلورا ان ہی کے مخصوص ترنم میں پڑھوا کر سنتے تھے۔ اور وجد اپنے وجدانی کلام کو وجدانی ترنم میں سنا کر سامعین کو وجد میں لاتے۔ ان کے شعری مجموعہ "اوراقِ مصور" کی رسم رونمائی ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں عمل میں آئی اور ان کے شعری مجموعہ "بیاضِ مریم" کی رسم اجرا وزیر اعظم ہندوستان اندرا گاندھی صاحبہ نے انجام دی [۱] ڈسمبر ۱۹۸۲ء میں مولانا آزاد کالج کے زیر اہتمام شاندار پیمانے پر وجد کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "جشنِ وجد" منایا گیا [۲]

۱۔ جمال اجنتا' جلال ہمالہ' جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۲۸
۲۔ جمال اجنتا' جلال ہمالہ' جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۳۱

وجد بڑے حساس طبیعت کے مالک تھے ان کو قوم کی غفلت اور اس کے نتائج بد کا بڑا احساس تھا اسلئے انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے دعوتِ عمل کی ترغیب دی۔

مٹ جائیگی وہ قوم جو بیدار نہ ہوگی — کٹ جائیگا، جس ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی

عبادات کے تعلق سے وہ خشوع اور خضوع کو روح عبادت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

سر تیرے آستاں پہ جھکے پھر نہ اٹھ سکے — اتنا بلند جذبۂ ذوقِ نماز دے

مخدوم کے ترقی پسندانہ رجحانات کی انہوں نے یوں عکاسی کی ہے۔

اے اہلِ سخن، سخن میں کیا رکھا ہے — اس کھوکھلے فکر و فن میں کیا رکھا ہے
مزدور کے چہرے کی شفق کو دیکھو — بیکار گل و سمن میں کیا رکھا ہے

چکبست کی شاعرانہ خدمات، آزادی وطن کے لئے ان کی جدوجہد وغیرہ کو مسدس کی ہیت میں وجد نے خراج عقیدت پیش کیا ہے یہ نظم انہوں نے لکھنو کے قیصر باغ کی بارہ دری میں منعقدہ جلسے میں سنائی تھی۔[1] ذیل میں اس کا ایک بند درج کیا جاتا ہے۔

راہِ وفا میں ٹھوکریں کھاتا ہوا پھرا — اپنی خوشی سے رنج اٹھاتا ہوا پھرا
حُب وطن کی جوت جگاتا ہوا پھرا — آتش نوا تھا آگ لگاتا ہوا پھرا

دم بھر میں ساری قوم کو بیدار کردیا
ہر جھونپڑے کو مطلعِ انوار کردیا

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی شاعری کی عظمت کا وجد اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مبارک ہو جہانِ شعر کی پیغمبری تجھ کو — ملی ہے شاعرانہ خوش نوا کی سروری تجھ کو

ولیؔ دکنی نے اردو شاعری کی شمع شمالی ہند میں روشن کی تھی اس طرح ملک بھر میں اردو شاعری کا ارتقا عمل میں آیا تھا ان کی خدمات کو وجد سراہتے ہیں۔

تیرے دم سے ولیؔ، باغِ سخن میں پھر بہار آئی — خزاں منظر چمن میں گل کھلے بانگِ ہزار آئی

مشہور نقاد اور محقق شیخ چاند جنہوں نے سودا پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور جنہوں نے اردو ادب کی تحقیق اور تنقید میں کارہائے نمایاں انجام دیئے انکے تعلق سے وجد رقم طراز ہیں

ماتم کریں گے قدر شناسِ ادب ترا — تحقیق ہی شعار رہا روز و شب ترا
نقاد نام دل سے بھلائیں گے کب ترا — روئیں گے ذکر آئیگا محفل میں جب ترا

---

[1] جمال احتشا، جلال ہمالہ جولائی ۱۹۸۸ء ناشر مولانا آزاد کالج، صفحہ نمبر ۹۳

بے مثل و بے غرض تھیں وفا کوشیاں تیری
ہاں مقبرے کو یاد ہیں خاموشیاں تیری[1]

اورنگ آباد میں اورنگ زیب عالمگیر کی بیگم رابعہ درانی کا مقبرہ جو تاج محل کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ تاج محل کو محبت کی علامت، فن کا شاہ کار، شاعر کا خواب کہا جاتا ہے اور وہ عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے، جس کے تعلق سے وجد کہتے ہیں۔

جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا　　الفت کا خواب، قالب مرمر میں ڈھل گیا

سارے عالم میں واقعہ کربلا عظیم سانحہ ہے۔ حق اور باطل کے درمیان بہتر ۷۲ نفوس کا لشکر جرار سے مقابلہ اور مسکراتے ہوئے سارے مصائب کو امام عالی مقام حضرت حسینؓ نے جھیلتے ہوئے راہِ حق میں کنبہ کی قربانی پیش کی تاریخ عالم کا یہ عظیم سانحہ ہے اور ہر صاحب فکر و قلم نے اس عظیم قربانی پر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے چنانچہ سکندر علی وجد بھی اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ایسی کوئی صبح ہوگی اور نہ کوئی شام　　اللہ رے صبح و شامِ غریبانِ کربلا

ایلورا میں ماہرانہ سنگ تراشی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے وجد کہتے ہیں۔

بنائی تیشہ وروں نے خیال کی دنیا　　کھلی ہوئی ہے عروج و زوال کی دنیا
جنوں نواز جلال و جمال کی دنیا　　رہینِ منتِ ماضی ہے حال کی دنیا
نجوم ڈوب گئے جلوۂ سحر کے لئے
ہوا ہے خونِ دل اس جنتِ نظر کے لئے

اجنتا میں کمالِ فن سے متاثر وجد اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں　　جہاں کھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمیں جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

ڈاکٹر حامد علی حیدرآبادی لاولد تھے ان کے پاس ایک خطیر رقم (آٹھ لاکھ) تھی انہوں نے اس رقم کو رائے جانکی پرشاد کے ہاں امانتاً محفوظ کر دیا تھا اور پھر ان کے مخلصانہ

---

[1] اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی ملکہ بیگم رابعہ درانی کے مقبرے کی فصیل سے متصل انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا جہاں شیخ چاند کام کرتے تھے۔

مشورہ پر اس رقم کا ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس سے فنی علوم حاصل کرنے والے مستحق مسلم طلباء کی مدد کی جاتی ہے۔ رائے جانکی پرشاد اس ٹرسٹ کے واحد غیر مسلم ٹرسٹی تھے۔[۱] ان کے اس فیاضانہ اور فراغ دلانہ عطیہ سے کئی مستحق طلباء نے استفادہ کیا ہے وجد اس سے متاثر ہوکر کہتے ہیں ۔

خدا نے جو دیا تھا تجھ کو وہ سب دے دیا تو نے کمال جود و تحویل امانت اس کو کہتے ہیں

حیدرآباد کے بے مثل خطیب بہادر یا جنگ جو علامہ اقبال کے کلام سے بے حد متاثر تھے اپنی دیوڑھی کے قریب مسجد میں ہر صبح نماز فجر کے بعد ایک آیت شریف اور علامہ اقبال کا ایک شعر سناتے اور تفسیر بیان کرتے تھے۔ وجد انکے تعلق سے کہتے ہیں۔

زمانے پہ اک بے خودی چھا رہی ہے خودی کا ترانہ سناتا چلا جا
رہِ زندگی کے ہر اک پیچ و خم پر چراغِ محبت جلاتا چلا جا

ارضِ دکن کے شجاعت اور وفا کے پیکر عبدالرزاق لاری جنہوں نے گولکنڈہ پر مغل یلغار کے وقت اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ اورنگ زیب یہ کہنے پر مجبور ہوئے ''اگر قلعہ میں اس جیسا ایک اور شخص وفادار ہوتا تو قلعہ فتح ہونا ناممکن تھا''[۲] سکندر علی وجد ارضِ دکن کے اس جواں مرد مجاہد کے تعلق سے کہتے ہیں ۔

شمشیرِ دکن تو نے عجب دھاک بٹھادی دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھادی
اے مردِ خدا! قدرِ وفا تو نے بڑھادی قربان ترے! مالک کیلئے جان لڑادی

جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہے گا
تاریخِ دلیراں میں ترا نام رہے گا

وجد نے غزل، نظم کے علاوہ صنفِ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے انکی ایک رباعی بطور نمونہ درج کی جاتی ہے۔

اے دوست عجب رنج اٹھائے میں نے فرقت میں بہت اشک بہائے میں نے
گو قلب رہا ریش غموں کے باعث ہنس ہنس کے مگر غم چھپائے میں نے

وجد کے ہم عصر مشہور شعراء مخدوم، شاذ، میکش، شاہد صدیقی اور سلیمان اریب ہیں جو شہر شعر و ادب کے روشن مینار کی حیثیت کے حامل ہیں۔

۱۔ مقالہ برائے ماسٹر آف فلاسفی ان اردو جامعہ عثمانیہ ۲۰۰۳ء ''حیدرآباد میں غیر مسلم ادبا اور شعراء کا حصہ آزادی کے بعد'' صفحہ نمبر ۱۳۱
۲۔ مضمون ''وفاداری بشرطِ استواری'' از سید محمد حسین محسن حیدرآبادی اخبار سیاست مورخہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء صفحہ ۶

اوجؔ یعقوبی

اوجؔ یعقوبی ۱۰ر مارچ ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ انکے والد سید یعقوب مرحوم نے انکا نام سید عبدالقدیم تجویز کیا تھا۔ جب یہ چار سال چار ماہ چار دن کے ہوئے تو مولانا اکبر علی مرحوم مدیر روزنامہ ''صحیفہ'' نے ان سے اقراء کی تلاوت کروائی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ چادر گھاٹ ، چنچل گوڑہ ہائی اسکول اور گوشہ محل ہائی اسکول میں ہوئی۔ ادارۂ حمیدیہ میں انہوں نے منشی اور فاضل کی تعلیم حاصل کی۔ جس زمانے میں ان کے والد ملک پیٹ کے سمنٹ بلاک میں سکونت پذیر تھے جو ملک پیٹ ریلوے اسٹیشن کے روبرو تھا اس کے اکناف میں مولانا حمیدالدین قمر فاروقی ، جوشؔ ملیح آبادی ، ماہر القادری ، شاعرہ خورشیدہ نذیر ، نظیر حیدرآبادی کے والد علی اخترؔ ، وزیر حسن دہلوی ، پروفیسر عبدالقیوم خاں باقیؔ ، سید آلِ عبا قادری ، احمد نواز جنگ فانیؔ ، عبدالقادر وفا ، مولانا مظفر الدین (والد ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ) اور ذکی الدین صدیقی وغیرہ جیسے باکمال علمی ، ادبی اور شاعرانہ ذوق رکھنے والے حضرات رہتے تھے اور ان سب لوگوں کے گھر میں اپنی کم سنی کی وجہ اوجؔ یعقوبی گھومتے رہتے تھے۔ وہ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کی دیوڑھی میں ہونے والے ماہانہ مشاعروں میں اور ہر ہلالی مہینہ کی ۲۷ کو روزنامہ ''صحیفہ'' کی میلاد بلڈنگ میں ہونے والے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اس طرح ان کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ اوجؔ یعقوبی ابتداء میں اخترؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ ان کے کلام کا پہلا شعر

ترے فراق نے شاعر بنا دیا مجھ کو ؏ تری جدائی نے دیوانہ کر دیا مجھ کو

بعد میں انہوں نے اپنا تخلص اشرفؔ رکھا۔ ان کے بہنوئی مشہور شاعر (سید تاج

الہدیٰ) تاج ہاشمی نے ان کو مشورہ دیا کہ تخلص دوحرفی یا زیادہ سے زیادہ سہ حرفی ہونا چاہیے ورنہ اکثر بحر میں زحمت ہوتی ہے اور انہوں نے اوج تخلص تجویز کیا اس کے بعد اوج نے یہی تخلص اپنایا اور اپنے والد کے نام کی نسبت سے یعقوبی کا اضافہ کرلیا اس طرح لوگ ان کے اصل نام کو بھول گئے۔[۳]

معاشی پریشانیوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کیلئے صفی اورنگ آبادی کی طرح انہوں نے فن شاعری کو ذریعہ آمدنی بنالیا اس طرح کم تعلیم یافتہ اُجڈ قسم کے لوگ بھی ان کی شاعرانہ فیاضی سے شاعر کہلانے لگے۔ اوج نے پہلا مشاعرہ روزنامہ ''صحیفہ'' کی میلاد بلڈنگ میں پڑھا۔[۴] اس کے بعد تو انہوں نے استادِ سخن شعراء ضامن کنتوری، صفی اورنگ آبادی، فصاحت جنگ جلیل، حبیب کنتوری، محمد علی سرور، امجد حیدرآبادی، حیرت بدایونی، نجم آفندی، ضیا یار جنگ ضیا، کامل شطاری، قدر عریضی، نرسنگ راج عالی، ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ الہام، جذب عالمپوری، پنڈت دامودر ذکی، سعید شہیدی، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی اور خواجہ شوق وغیرہ کے ساتھ مشاعرے پڑھے۔ اوج کی شاعری میں ان کے تجارتی انداز کی بڑی تشہیر ہوئی جسکی وجہ ان کے قابل تلامذہ ان سے کترانے لگے۔ اوج یعقوبی نے تقریباً سارے اصناف سخن مثلاً حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، مثنوی، قصیدہ، آزاد نظم، قطعہ، رباعی اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی میں اپنے ہم عصر شعراء میں اوج ایک امتیازی اور منفرد مقام کے حامل ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھے قواعد زباں اور فن شعر پر وہ کامل دسترس رکھتے تھے۔ فنی باریکیوں سے خوب واقف تھے ساری زندگی شاعری نہ صرف ان کا مشغلہ بلکہ ذریعہ روزگار رہا۔ صفی اورنگ آبادی کی طرح انہوں نے بھی دکھنی محاوروں کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کر کے محاوروں کو معتبر بنایا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفی اورنگ آبادی کی شاعرانہ روایتوں کو انہوں نے زندگی بخشی۔ گو اوج یعقوبی کا تعلق قدیم دبستانِ شاعری سے رہا لیکن انہوں نے حسن وعشق، ہجر وفراق اور گل وبلبل کی حکایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید رجحانات اور مسائل کو بھی اپنے پیشِ نظر رکھا۔ سماجی مسائل پر انہوں نے بھر پور توجہ دی اور وہ مسائلی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ وہ ایک خاص لہجہ کے شاعر تھے اور ان کا اسلوب منفرد تھا۔ وہ نہ صرف اچھے

---

۳ غنچہ لب بستہ نومبر ۱۹۷۹ء صفحہ نمبر ۱۳ ۴ غنچہ لب بستہ نومبر ۱۹۷۹ء صفحہ نمبر ۱۱

شاعر بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''غنچہ لب بستہ'' پر ان کا لکھا ہوا دیباچہ ان کی انشاء پردازی اور ناقدانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے اگر وہ اس جانب توجہ دیتے تو اردو نثر میں بھی بیش بہا اضافہ ممکن تھا۔انہوں نے عبدالقیوم خاں باقی سے باضابطہ تلمذ حاصل کیا اور ان سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام ''گرفت نظر'' دوسرا ''غنچہ لب بستہ'' اور تیسرا مجموعہ کلام ''اوجِ عرش'' (جو نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل ہے) زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔اوج یعقوبی کی نعتوں اور منقبتوں کے پڑھنے سے قاری کو اوج کی رسالتمابؐ اور اہلبیتِ اطہار سے والہانہ عقیدت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کا یہ سارا کلام فنی خوبیوں سے آراستہ ہے اور ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام سے محسن کاکوری اور امیر مینائی کے کلام کی یاد تازہ ہوتی ہے۔نعت گوئی میں الوہئیت اور عبدیت کے مدراج پر بڑی احتیاط سے لب کشائی کرنی پڑتی ہے اور اوج یعقوبی نے اس احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔انہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں فرموداتِ نبوی کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے اور ذاتِ اقدس رسول اللہؐ کی بارگاہ میں اپنی عقیدت اور محبت کے پھول بکھیرے ہیں جن کے پڑھنے سے قاری کے قلوب گرما جاتے ہیں اور انکے دلوں میں بھی رسول اقدسؐ کے تعلق سے محبت کی چنگاریاں شعلہ بننے کیلئے بھڑکتی ہیں۔ذیل میں ان کے چند منتخب نعتیہ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

صباء جو بھی کہنا ہو تجھے بہ چشمِ نم کہنا ادب سے پہلے تو آنکھوں کو ملنا پائے اقدس سے

مدینہ دیکھوں یہ آخری حسرت ہے جیتے جی دعائیں ہیں بہت وقتِ دعا کم ہے مرے آقاؐ

جبرئیل رہنے دیجئے اب شوقِ رہنمائی سدرہ سے آگے میرے سرکار جانتے ہیں

بچھڑ جاتے نہ اے روح الامینؑ سدرہ پہ یوں آکر قسم ہے تھام لیتے تم ذرا سرکارؐ کا دامن

کعبہ کی طرف سجدہ تو ایمان ہے لیکن سرکارؐ کا نقش پا اپنی جگہ ہے

ایک مسلسل نعت میں اوج یعقوبی کی سرکار سے وابستگی کا عکس نمایاں ہے۔اس کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے علم بشر کتنا، سرکارؐ کے بارے میں ہم لوگ کہیں گے کیا، سرکارؐ کے بارے میں

اے شوقِ سخن گوئی ہے شرطِ ادب اول کچھ کھیل نہیں کہنا، سرکارؐ کے بارے میں

پیکر ہے تو بے سایہ، پڑکا ہے تو بے جسمی کیا کیا ہوا دھوکا، سرکارؐ کے بارے میں
جب عرش پہ پہنچے ہیں، نعلین سمیت آقاؐ جبرئیل نے تب سوچا سرکارؐ کے بارے میں
سرکارؐ بشر ہیں تو مثلِ بشر کیا ہے اتنا کوئی سمجھا سرکارؐ کے بارے میں
اوج اپنا سخن کتنا خود لوح و قلم گم ہیں آسان نہیں لکھنا سرکارؐ کے بارے میں

رسولؐ اقدس کی ایک حدیث شریف جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ علم کا شہر ہیں اور حضرت علیؑ اس کا دروازہ ہیں اس مضمون کو اوج یعقوبی نے یوں باندھا ہے۔

نبیؐ کی معرفت بے شک درِ حیدر سے ملتی ہے یہ دولت جس کے گھر کی ہے اُسی کے گھر سے ملتی ہے

مالک کی خبر گھر والوں سے ملتی ہے۔ اوج یعقوبی بھی بر بنائے سیادت، درِ رسولؐ سے وابستگی رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

فرشتو آؤ پوچھو مجھ سے میں پیشی میں رہتا ہوں ہے مالک گھر کا کیسا یہ خبر نوکر سے ملتی ہے

روایت ہے کہ سرکارِ نامدار کے جسم اطہر کا سایہ نظر نہیں آتا تھا اوج یعقوبی کہتے ہیں کہ سرکارؐ کا سایہ ہے نہ ثانی اس لئے سرکارؐ سے کسی اور کا تقابل ممکن نہیں۔

اے اوج تقابل پہ جب کوئی اتر آئے کہہ دینا محمدؐ کا سایہ ہے نہ ثانی ہے

اوج یعقوبی خمسہ کی ہیئت میں رسالتمابؐ کی خدمت اقدس میں اپنی والہانہ جذبہ وارفتگی کا یوں اظہار کرتے ہیں جس کا ایک بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

چاند سا چہرہ آنکھ غزالی شاہ و گدا سب در کے سوالی
مرکزِ خلقت روضہ کی جالی فرش کا مولیٰ عرش کا والی
مثلِ بشر یہ کون بشر ہے

اوج یعقوبی نے اپنے مرثیوں میں نہ صرف واقعات کربلا اور وہ جور و ستم جو خانوادہ امام عالی مقام پر ڈھائے گئے بیان کئے بلکہ فلسفہ شہادت اور اسوہ حسینی کو انتہائی خوبی اور شاعرانہ محاسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

آپ سے حشر میں ہے اتنی گذارش آقا اوج کو دیکھ کے بولیں مرا نوکر آیا

اوج یعقوبی نے اپنے کلام میں اس نکتہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ جو بد بخت آپ کے مقابل آیا اور وہ بھی اور جو آپ کے ہاتھوں مارا گیا اس کا بھی ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

کتنے ہی بدنصیب تہہ تیغ ہوگئے　　جن کے لئے تھا بابِ جہنم کھلا ہوا

حضرت عباسؑ پیکر وفا تھے ان کی خدمت اقدس میں اوجؔ یعقوبی خراج تحسین پیش کرتے ہیں ؎

یہ بھی میرا ایمان ہے عباسِ دلاورؑ　　تجھ جیسا کوئی مردِ وفا ہو نہیں سکتا

کعبہ میں روشنی بھی خونِ حسینؑ سے　　عباسؑ کے لہو سے چراغِ وفا جلا

اوجؔ یعقوبی کی تاریخ اسلام پر گہری نظر ہے۔ سانحۂ کربلا کے پس پشت جو سازشوں کا جال تھا اور سارے سیاسی پسِ منظر جس کا مقصد رسولؐ خدا کے گلشن کو اجاڑنا تھا، اس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں ؎

یہ کہو گھونپا ہے خنجر کس نے پشتِ آل میں　　نہ دیکھو کربلا میں ہاتھ کس کس کا اٹھا

ہر زمانے میں برابر یہ سوال اٹھتا رہا　　کربلا کے واقعہ میں ہاتھ کس کس کا رہا

مصلحت گاہوں میں کچھ زربفت کے پردے رہے　　وقت بھی کچھ سازشوں کے جال پھیلاتا رہا

پھر اچانک ایک دن خطرے کی گھنٹی بج گئی　　فلسفہ صلح حسنؑ کا وقت سمجھاتا رہا

غاصبانِ حق کے چہروں سے نقاب اتری جہاں　　وہ مسلماں جن سے خود اسلام شرماتا رہا

حق اسی میدان میں آکر ہوا ہے سرخرو　　تخت اسی میداں میں آکر ٹھوکریں کھاتا رہا

بیمارِ کربلا (حضرت زین العابدینؑ) پہ جو جور و ستم ہوئے اس کا انہوں نے اس طرح نقشہ کھینچا ہے ؎

پا بہ زنجیر ایک بیمار اور رستہ شام کا　　ہر قدم پہ غش کیا، گرا، بیٹھا، اٹھا

خانۂ رسول کے شہزادے جن میں رسولؐ کریم کی شباہت بدرجہ اتم نمایاں تھی لیکن اشقیاء نے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا اس مضمون کو اوجؔ یعقوبی یوں باندھتے ہیں ؎

رعایت اشقیاء نے کی نہ ہمشکلِ پیمبر سے　　نہ قاسم سے نہ اصغر سے نہ عباس دلاورؑ سے

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی نے حضرت عباسؑ کے کٹے ہوئے شانے دیکھ کر امام عالی مقامؑ کے احساسات کو یوں شعری جامہ پہنایا ہے ؎

نوجوان بھائی کے شانے کٹ گئے میدان میں　　صبر رویا صبر کرنے کا سلیقہ دیکھ کر

امام عالی مقامؑ کی شہادت کا نقشہ انہوں نے یوں کھینچا ہے۔

جب عصر تنگ آیا شبیرؑ نے دیکھا نانا کھڑے ہوئے ہیں آغوش ان کی وا ہے
آواز جیسے کوئی آئی آؤ میرے نواسے ملنے کا مجھ سے دیکھو اب وقت آ گیا ہے
سروڑ نے قتل ہوکر دکھلایا جہاں کو باطل کی آنکھ نم ہے حق مسکرا رہا ہے

حضرت امام عالی مقامؑ کی قربانیوں کا اجمالی خاکہ ملاحظہ ہو۔

گھر بار کے لٹنے کی ہے یہ آخری تفصیل بیمار کا بستر ہے نہ زینب کی ردا ہے

امامت اور ولایت کے تعلق سے اوجؔ یعقوبی اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

دنیا میں امامت کی نیابت ہے ولایت ہوتا ہے ولی ابنِ ولی آلِ نبیؐ سے

علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں بعض الفاظ کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے انکے معنوں میں اضافہ کیا ہے مثلاً شاہین، خودی، مردِ مومن، فقر، آتشِ نمرود وغیرہ اوجؔ یعقوبی نے بھی اپنے کلام میں بعض الفاظ جیسے وفا، ردا، آنسو، طاعت کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے انکے معنوں میں اضافہ کیا ہے انکا کلام جو حضور اقدسؐ اور اہلبیت اطہار سے والہانہ عقیدت اور محبت سے پُر ہے شاید رسالتماب کی پسندیدگی کا باعث بنا اس لئے آسمانِ شاعری پر اوجؔ کا ستارہ اوج پر نظر آتا ہے۔

اوجؔ یعقوبی کو اہل اللہ سے غیر معمولی عقیدت تھی حضرت سیف الدین شرفیؒ سیفؔ جو اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ تھے جو شریعت، طریقت اور معرفت پر عبور رکھنے کی وجہہ سے حیدرآباد میں منفرد مقام کے حامل تھے گو اوجؔ ان کے دامن گرفتہ تو نہ تھے لیکن حضرت سے عقیدت کاملہ رکھتے تھے اور ان کے وصال پر انہوں نے مسدس کی ہیئت میں اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا جس کا ایک بند درج ذیل ہے۔

اہل نظر کی کم نظری کو خبر نہ تھی گنج نہاں کی دستِ دہی کو خبر نہ تھی
تم مئے کدہ تھے، تشنہ لبی کو خبر نہ تھی تم کیا تھے، کون تھے، یہ کسی کو خبر نہ تھی
نا آشنا قدم تھے اَنا کے حدود سے
نفرت تھی تم کو دہر میں نام و نمود سے

اگرچہ اوجؔ یعقوبی نے آزاد نظم، موضوعاتی نظم، کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ وہ قدیم دبستانِ شاعری

کے پاسدار رہے۔ لیکن ان کی شاعری صرف حسن وعشق، فراق وہجر اور گل وبلبل کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ جدید رجحانات اور عصری مسائل کا بھی احاطہ کرتی ہے ان کو قواعد زبان اور فن شعر پر کامل دسترس حاصل تھی۔ انکی زندگی میں شاعری نہ صرف مشغلہ بلکہ ذریعہ روزگار بھی تھی۔ صفؔی اورنگ آبادی کی طرح انہوں نے دکنی محاوروں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اس طرح انہوں نے محاوروں کو زیادہ معتبر بنایا۔ شاعر حساس ہوتا ہے اور آفاقیت کی صفت سے بھی متصف رہتا ہے اوج بھی اپنے ماحول اور سماج کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی شاعری میں ان مسائل کا شدت سے ذکر کیا ہے جسکی وجہ سے وہ مسائلی شاعر کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔ وہ ایک خاص لہجہ کے شاعر اور منفرد اسلوب کے حامل تھے۔ الفاظ کی بندش میں انکو مہارت حاصل تھی۔ سلاست، شگفتگی اور نغمگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

وارثِ میکدہ ہم جو موجود تھے ۔۔۔ کیوں کرائے کے ساقی بلائے گئے

تمہاری انجمن سے اٹھ کے بھی ہم بجھ نہ جائیں گے ۔۔۔ چراغ رہ گذر بن کر بھی جلنا جانتے ہیں ہم

موجودہ سیاسی انقلابات کی طرف ان کا درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

رُخ ہواؤں کا بدلتے نہیں لگتی دیر ۔۔۔ ڈوب جاتے ہیں سفینے کبھی ساحل کے قریب

سیاسی افق پر ہونے والی تبدیلیوں کا وہ کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

کس کو امید تھی صبح کی گود میں ۔۔۔ اور گہرے اندھیرے ہو جائیں گے

شمع اور پروانے کے تعلق سے مختلف شعراء نے مختلف مضامین باندھے ہیں لیکن اوجؔ یعقوبی کا منفرد اسلوب ملاحظہ ہو۔

شمع اپنے سے نہیں جلتی جلانے کے بغیر ۔۔۔ وہ جو خود بڑھ کے جلتا ہے وہ پروانہ ہے

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی نے اہل اقتدار طبقہ کی ناانصافیوں کو کس خوبی سے اجاگر کیا ہے ملاحظہ ہو۔

کچھ پی پی کے بہکتے ہیں، کچھ رند ترستے ہیں ۔۔۔ منصب سے ہٹا دے گی یہ بے صبری ساقی

اوجؔ یعقوبی قنوطیت پسند نہیں بلکہ وہ رجائیت پسند تھے۔ وہ نوجوانوں کو پامردی

کا درس دیتے ہیں۔

زندگی کے میداں میں کاش آپ ڈٹ جاتے حادثوں میں دم کتنا راستے سے ہٹ جاتے

ذیل کے شعر میں انہوں نے حسی کیفیت کا کس عمدگی سے اظہار کیا ہے ملاحظہ ہو۔

پوچھا جو حال تو ہم مسکرا دیئے اظہارِ طنز میں بھی حسین اختصار ہے

ان کی شاعری میں پند و نصائح ملتے ہیں۔

انسان میں بلندیٔ کردار چاہیے پابند وضع ہو تو غریبی وقار ہے

اوجؔ یعقوبی ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنے کو نا مناسب خیال کرتے ہیں۔

سپردگی نہ سمجھ ان کے مسکرانے کو گلوں کا کام تبسم ہے مسکراتے ہیں

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی نوجوانانِ قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سلام ان پہ جو چھائے ہوئے ہیں صدیوں پر گریز ان سے جو لمحوں میں ڈوب جاتے ہیں

اوجؔ یعقوبی اظہارِ غم سے گریز کرتے ہیں۔

قیمتِ غم سر بازار نہ گرنے پائے گھر گرے پردے کی دیوار نہ گرنے پائے

رِند پی کر بہک جاتے ہیں لیکن ساغر تند سے تند شراب کے اثر کو قبول نہیں کرتے

اس مضمون کو انہوں نے اسطرح باندھا ہے۔

رہتا ہے ہوش میں خود سب کو بھلانے والا کتنی ہی تند ہو مئے ساغر نہیں بہکتے

مخدوم محی الدین بڑے باظرف رِند تھے اوجؔ ان کی بادہ خواری اور ان کے ظرف کے تعلق سے کہتے ہیں۔

مخدومؔ کو جو دیکھا ہم کو یہ باور آیا اے اوجؔ ظرف والے پی کر نہیں بہکتے

موجودہ سیاسی استبداد کا وہ یوں احاطہ کرتے ہیں۔

ثالث بنے ہیں اوجؔ جو کل تک فریق تھے کس کے گلے پڑے گی سزا ہم سے پوچھئے

کہنے کو تو ملک آزاد ہو گیا لیکن آزادی کے ثمرہ سے ملک کے تمام طبقات بہرہ ور نہیں ہو سکے اس مضمون کو انہوں نے یوں باندھا ہے۔

فصلِ بہار آئی تو پھول آپ کے ہوئے فرمایئے حضور! ذرا ہم کو کیا ملا

محبوب اگر مل جائے تو گوناگوں غم سے بھی سامنا ہو سکتا ہے اوجؔ نے اس

مضمون کو یوں باندھا ہے۔

مانگ کر آپ کو کونین کے غم مانگ لئے ہم سے اب اور نہیں کوئی دعاء ہونے کی

ہر صبح کے بعد شام کا ہونا قانونِ فطرت ہے اوجؔ کہتے ہیں۔

راحت میں بھی اک صورتِ آلام چھپی ہے ہر صبح کے پردے میں کوئی شام چھپی ہے

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی کی رجائیت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔

سحر، سحر ہے وہ مخمور و ملگجی ہی سہی سیاہی ایک کرن سے شکست کھاتی ہے

کانگریسی حکومت کے آخری دور میں ٹی۔ انجیا چیف منسٹر حکومت آندھرا پردیش نے انکی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دیوڑھی خورشید جاہ میں منعقدہ مشاعرہ میں ان کو ''ملک الشعراء'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

یہ شاعر خوش گو جس نے لاتعداد بے زبانوں کو زبان عطا کی کتنے ہی غیر متشاعر ان کی شاعرانہ فیاضی کی وجہ صاحب دیوان شاعر بن گئے جسکی وجہ سے دورِ مصحفی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ۳ ر اگست ۱۹۸۳ء کو بمقام اورنگ آباد احاطہ بنے میاں کی درگاہ میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور احاطہ مسجد الٰہی چادر گھاٹ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔[1]

[1] روزنامہ سیاست مورخہ ۴ر اگست ۱۹۸۳ء

سعیدؔ شہیدی

سعیدؔ شہیدی کا نام میر عابد علی اور تخلص سعیدؔ ہے۔ سعیدؔ شہیدی کے والد کا نام شہید یار جنگ ہے۔ اپنے والد کے نام کی مناسبت سے انہوں نے سعید شہیدی کے نام سے شہرت پائی۔ سعید شہیدی ۱۴ر جولائی ۱۹۱۴ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کی۔ سعید شہیدی کے والد میر مہدی علی شہید (شہید یار جنگ مرحوم) آصفِ سابع کے مصاحب تھے اور پرنس معظم جاہ بہادر شجیع کے اتالیق تھے۔ ان کو لکھنو کے ممتاز مرثیہ گو پیارے صاحب رشید سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کا شاعری کا ذوق بڑا نکھرا ہوا تھا۔ اہلبیتِ اطہار سے ان کو والہانہ محبت تھی۔ وہ چاہتے تو اور اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے مذہبی رجحان کے باعث صرف سلام اور منقبت لکھنے پر اکتفا کیا۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ''صد سلام'' کے نام سے چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔[۲] وہ مستحق شاعروں اور ادیبوں کی خاموش طریقہ سے مالی مدد کیا کرتے تھے۔ انکے ہاں اکثر شعری و ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس ادبی، علمی اور شعری ماحول میں سعید شہیدی پروان چڑھے اور یہیں سے ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی۔

سعیدؔ شہیدی کے نانا سید اصغر حسین ناجیؔ مرحوم آسمانِ شاعری کے تابندہ ستارے انیسؔ اور دبیرؔ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے سلام، نوحے اور منقبت کے سوا کسی اور صنفِ سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔ سعید شہیدی اپنے نانا حضرت ناجیؔ کے ممتاز شاگرد میر محمد علی سرور مرحوم سے تلمذ رکھتے تھے۔[۳] سعید شہیدی قدیم دبستانِ اردو کی شاعری کے

---

۱ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری، صفحہ نمبر ۲۰۲

۲،۳ ''آفتابِ غزل'' از سعید شہیدی، صفحہ نمبر ۲

پاسدار تھے۔انہوں نے برق اور آشیاں کو علامتوں کی طور پر استعمال کیا ہے۔برق سے ان کی مراد سماجی ناانصافی اور آشیانہ سے مراد محنت کشوں کی بستی ہے۔ان کی شاعری کے تعلق سے عاشور کاظمی صاحب رقم طراز ہیں۔"میری نظر میں سعید شہیدی غزل کی روایت کے تسلسل کا نام ہے۔"[1]

اردو غزل جس کو اردو ادب کی آبرو قرار کیا جاتا ہے جسکی آبیاری میں متاخرین شعراء میں حسرت، جگر، اصغر، فانی اور خمار نے اپنا حصہ ادا کیا سعید شہیدی بھی اس سلسلہ کی کڑی ہیں۔انکو چھوٹی بحر میں غزل کے عمدہ شعر کہنے میں مہارت حاصل تھی۔

ابتداء میں غزل میں صرف حسن و عشق کی باتیں کہی جاتی تھیں پھر اس میں تصوف در آیا۔غزل میں پند و نصائح کے مضامین بھی شامل رہے لیکن اب غزل میں کثیر النوع موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے۔غزل میں علامتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔جب تک پورا منظر سامنے نہ ہو وہ شعر کا مکمل لطف حاصل نہیں ہوتا جس میں علامتوں کا استعمال ہوتا ہے۔استاد قمر جلالوی جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

یہ شعر قمر جلالوی نے پاکستان میں جنرل ایوب خاں کے اخبارات پر سنسر کی پابندی لگانے پر لکھا تھا۔اس پسِ منظر سے واقفیت کے بعد شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔بقول عابد علی خاں صاحب (سابقہ ایڈیٹر سیاست) سعید شہیدی "حاصل" سے مطمئن نہیں ہیں اور "ممکن الحصول" کے لئے ان کا شاعرانہ جہاد غزل کے روپ میں جاری ہے۔سعید شہیدی نے شاعری میں جہاں اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا ہے وہیں پر انہوں نے شہدائے کربلا کی یاد میں مرثیہ خواں بھی رہے ہیں۔حیدرآبادی عوام ان کے خاص شاعرانہ ترنم کو بھول نہیں پائینگے۔انہوں نے سلام اور نوحوں کے علاوہ غزلوں کے چراغ بھی روشن کئے ہیں۔

انہوں نے اپنے کلام میں جو لفظیات، استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں وہ روایتی شاعری سے متاثر ہیں۔اس روایت میں انہوں نے ترقی پسند دورِ غزل کی علامتوں

---

[1] کفِ گل فروش جنوری ۱۹۹۳ء صفحہ نمبر ۲

کو بھی شامل کرلیا ہے۔ ان کے کلام میں برق، تجلی، دامن، نقشِ قدم، دعا اور سجدہ وغیرہ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وحید اختر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انہوں نے روایتی اندازِ بیان اور لفظیات میں اپنے عہد کے احساسی ردعمل کو بھی سمویا ہے۔ ان کی غزلوں میں سہل ممتنع کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وحید اختر ''انہوں نے روایتی غزل کے لفظیات کو اپنے انفرادی تجربات اور اپنے عہد کے شعور کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہی ان کی غزل کی منفرد خصوصیت ہے۔'' روایتی شاعری کے لفظیات جام، ساقی، میخانہ، طور، برق، تجلی، گل، محفل، بال و پر، چارہ گر، جنوں، گریباں، دامن، نقشِ قدم، دعا، سجدہ، اثر، ذوق، عشق اور ہجر برسوں سے غزل میں مستعمل ہیں۔ ہر روایتی غزل گو نے ان لفظیات کو اپنے اسلوب میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظیات آج بھی ذوقِ سخن کے لئے مانوس ہیں۔ آج بھی روایتی غزل گو شعراء کو مشاعروں میں دادِ تحسین ملتی ہے۔ ایسی شاعری ہمارے قدیم تہذیبی روایات کو زندگی بخشتی ہے۔

سعیدؔ شہیدی نے دیگر شعراء کی طرح تعلّی کے پردہ میں تکبر کا اظہار نہیں کیا بلکہ دھیمے لہجہ میں سادگی کے ساتھ وہ کہتے ہیں۔

غزل سعیدؔ کی تو نے سنی نہیں اے دوست ۔۔۔ زبان کا لطف نہ آجائے تو میرا ذمہ

سعیدؔ شہیدی غم کی دولت کی پردہ پوشی کرنے کے قائل ہیں۔ وہ غم کے اظہار سے گریز اور ضبط اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

میرے دل میں ہے غم، لب پر ہنسی ہے ۔۔۔ اسی کا نام شاید زندگی ہے

سعیدؔ شہیدی انتہائے غم میں بھی غم کی اس قدر پردہ داری کے قائل ہیں کہ شدید غم میں بھی وہ مسکراتے رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں جن کو ضبطِ غم کی صلاحیت حاصل نہیں ہے وہ زندگی کا حقیقی لطف حاصل نہیں کرسکتے۔

انتہائے غم میں جو مسکرا نہیں سکتے ۔۔۔ زندگی کا وہ کچھ بھی لطف اٹھا نہیں سکتے

سعیدؔ شہیدی کی شاعری میں آشیاں کے جلنے، بجلیوں کے چمکنے اور گرنے اور آشیاں کے جل جانے کے تذکرے ملتے ہیں۔ برق اور آشیاں صرف علامتیں نہیں ہیں بلکہ ان کی آپ بیتی بھی ہے۔

ہم اگر گلستاں میں آشیاں بناتے ہیں   بجلیاں بھی گرتی ہیں زلزلے بھی آتے ہیں

سعید شہیدی نے متمول گھرانے میں آنکھ کھولی، ایک چھوٹی سرکاری خدمت پر معمور رہے لیکن انہوں نے زندگی کی آزمائشوں میں جہدِ مسلسل کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور بڑے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا۔ وقتی پریشانیوں کا انہوں نے پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان ساری باتوں کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

اپنے کارنامے پر برق یوں اکڑتی ہے   جیسے آشیانہ ہم' پھر بنا نہیں سکتے

مصائب کے تسلسل سے آدمی پست ہمت ہو جاتا ہے اور پھر ایک ایسا دور آتا ہے کہ وہ یہ کہتا ہیکہ وہ جس حال میں بھی ہے ٹھیک ہے اب مزید کوئی فکر' تدبیر یا دعا کا وہ خواستگار نہیں رہتا۔

اب کوئی ضرورت ہے دوا کی نہ دعا کی   جس حال میں ہوں میں مجھے آرام بہت ہے

مسکراتا ہوں مصیبت میں یہ عادت ہے میری   ضبط مشکل ہے یا آساں مجھے کیا معلوم

ہواوں کے بدلتے رُخ اور نامساعد حالات سے وہ مایوس یا حیران نہیں ہوتے۔

کبھی ٹوٹی ہوئی کشتی پہ ترس آتا ہے   کبھی چڑھتے ہوئے دریا پہ ہنسی آتی ہے

ذیل کے شعر میں وہ امیدِ صبح اور شامِ حیات کے تعلق سے کہتے ہیں۔

اُمیدِ صبح کے مارے ہوئے جہاں پہنچے   وہیں حیات کی بھی شام ہوگئی اے دوست

یہاں پر صبح آزادی اجالے کی علامت بھی ہوسکتی ہے اور شام' مایوسی اور محرومی کا کنایہ بھی۔ وہ اپنے غموں کو نہیں بلکہ اپنے محبوب کے غم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ محبوب کی آنکھ میں نمی دیکھ کر وہ کہتے ہیں۔

آج انتہائے غم ہوگئی   آنکھ ان کی بھی نم ہوگئی

انسان کے مرنے کے بعد اس کی آخری رسومات کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ تدفین کے لئے قبر کھودی جاتی ہے۔ اسی بات کو انہوں نے شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے مرنے کے غم میں زمین کا سینہ بھی چاک ہو رہا ہے۔

اللہ اللہ میرے مرنے پر   ہو رہا ہے زمیں کا سینہ چاک

سعید شہیدی ذیل کے شعر میں مانگنے کے آداب کی تفہیم کرتے ہیں۔

مانگنے کے آداب بھی ہیں کچھ   دامن کو پھیلانے والے

سعید شہیدی میکشی اور میکدہ کے تعلق سے کہتے ہیں۔

مئے کشی اپنی سعید کچھ ایسی ہی معیاری ہے   ہم بدل نہیں سکتے میکدے بدلتے ہیں

ذیل کے شعر میں انہوں نے اسوۂ حسینی کو پیش کیا ہے۔امامِ عالی مقام نے حق کی بقا کی خاطر جامِ شہادت نوش فرمایا لیکن کسی نامناسب سمجھوتے کو قبول کرنے سے گریز کیا۔

اہلِ حق کی فطرت ہے، حق پہ آنچ جب آئے   سر کٹا تو سکتے ہیں، سر جھکا نہیں سکتے

سعید شہیدی آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے وہ انتہائی غیور اور حوصلہ مند شخصیت کے حامل تھے۔وہ اپنی زندگی کے خود معمار تھے۔خودداری اور غیرت مندی ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔راسخ العقیدہ شخصیت کے حامل تھے اور مجاہدانہ مزاج رکھتے تھے۔ان کے مندرجہ ذیل شعر سے زندگی کے تعلق سے ان کی فکر کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ کے سہاروں کی فکر ہوگی اوروں کو   ہم تو ٹھوکریں کھا کر خود بخود سنبھلتے ہیں

معاف کر دینا بھی انتقام لینے کا ایک طریقہ ہے اسی مضمون کو بڑے دلکش انداز سے سعید شہیدی نے باندھا ہے۔

اس کی ساری خطائیں کر کے معاف   مطمئن ہیں اس انتقام سے ہم

ذیل میں سعید شہیدی کے چند اشعار درج کئے جا رہے ہیں جو چھوٹی اور مترنم بحروں میں لکھے گئے ہیں۔جس میں انتہائی دلکش پیرائے میں حسن وعشق، جہدِ پیہم کی ترغیب، محبوب سے ملنے کی خواہش، محبوب کے غیر التفاتی رویہ کی شکایت اور آدابِ محبت کو ملحوظ رکھنا جیسے مضامین باندھے گئے ہیں۔

آئی کیوں ہچکیاں نہیں معلوم   کون ہے مہرباں نہیں معلوم

☆☆☆☆

نشیمن پر نشیمن اس قدر تعمیر کرتا جا   کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے

☆☆☆☆

پھولوں کی رُت ہے ٹھنڈی ہوائیں   اب ان کی مرضی آئیں نہ آئیں

☆☆☆☆

ساحل بھی اپنا طوفاں بھی اپنا　　اب پار اتریں یا ڈوب جائیں

☆☆☆☆

چمن محفوظ ہوگا میری دنیا لُٹ گئی ہوگی　　جہاں بجلی کو گرنا تھا وہیں بجلی گری ہوگی

☆☆☆☆

ہے ملال اس کا کہ بدل گئی وہ نظریں　　مجھے اس کا غم نہیں ہے کہ بدل گیا زمانہ

☆☆☆☆

عشق نے اپنی شان دکھائی　　خود وہ مجھے سمجھانے آئے

☆☆☆☆

مسکرانا ہے جرم آہ کرنا ہے گناہ　　دیکھئے کتنے مجبور ہم ہوگئے

خمار بارہ بنکوی اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں دوستوں کو آزمانے پر خود بخود دشمنوں سے پیار ہو جائیگا۔ ان کی مراد خود ساختہ دوستوں سے ہے۔

دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا　　دوستوں کو آزماتے جایئے

سعیدؔ شہیدی نے تقریباً اسی مضمون کو اپنے اسلوب میں یوں باندھا ہے۔

دوستوں کے کرم یاد کر کے سعیدؔ　　دشمنوں کو گلے لگاتے جاو

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ خمارؔ بارہ بنکوی کی طرح سعیدؔ شہیدی کو بھی چھوٹی بحر میں شعر گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔

سعید شہیدی ذیل کے شعر میں کہتے ہیں کہ اس دنیا میں اوروں کو بہت کچھ نصیب ہوا لیکن انہوں نے کچھ ایسا مقدر پایا کہ وہ کچھ نہ حاصل کر سکے۔ اس شعر میں میکدہ اور تشنگی علامتوں کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ میکدہ سے مراد دنیا اور تشنگی علامت ہے نامرادی کی۔

اوروں کو میکدے سے بہت کچھ ہوا نصیب　　قسمت کی بات ہے کہ مجھے تشنگی ملی

خدائے عز و جل کا ارشاد ہے کہ وہ بندے کے رگِ جاں سے قریب ہیں لیکن اتنے قرب کے باوجود بندہ اس کے وجود کے مشاہدہ سے محروم ہے۔

یہ سنتا ہوں کہ وہ نزدیک ہے میری رگِ جاں سے　　الٰہی کس قدر ہے فاصلہ مجھ سے رگِ جاں کا

سعیدؔ شہیدی آزادی کے بعد حالات میں خوش گواری پیدا ہونے کی توقع رکھتے تھے لیکن وہ اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں اندھیرا مایوسی کی علامت ہے اور اجالا روشنی کی۔

اللہ جانے پھر یہ اندھیرا ہے کس لئے　　آیا تھا انقلاب اجالا لئے ہوئے

سعیدؔ شہیدی کا کلام ملک کے موقر جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ ان کو ملک بھر میں مشاعرے پڑھنے کے لئے مدعو کیا جاتا تھا اور وہ اپنے مخصوص ترنم میں مشاعرہ پڑھ کر دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

۱۔ برق و آشیاں ۲۔ شفق ۳۔ نصابِ غزل ۴۔ کفِ گل فروش

شعری مجموعے ''شفق'' اور ''کفِ گل فروش'' پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ان کو ایوارڈ سے بھی نوازا۔[۱]

یہ روایتی دبستانِ شاعری کا خوش گو شاعر ۱۵ر جولائی ۲۰۰۰ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

---

[۱] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۹ء صفحہ نمبر ۲۰۲

تہنیت النساء بیگم تہنیت

تہنیت النساء بیگم تہنیت ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔[۱] انکے والد نواب رفعت یار جنگ بہادر ایک روشن خیال، مدبر، رحم دل، منصف مزاج، مردم شناس، خوش اخلاق، ہر دلعزیز اور غرباء پرور حاکم تھے۔ انکی ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں ہوئی اور سلسلہ تعلیم سینیئر کیمبرج تک رہا۔[۲]

وہ بچپن سے ذہین تھیں اور علمی شوق اُن میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ انکی شادی ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء میں سید محی الدین قادری زور سے ہوئی۔[۳] زور صاحب نے نہ صرف دکنیات پر نا قابل فراموش کام کیا بلکہ دکنی قلم کاروں کی حتی المقدور ہمت افزائی کی جسکی وجہ کئی ذرّے ادبی دنیا کے آسمان پر تابندہ ستارے بن کر چمکے۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اِس ادارہ کے قیام میں تہنیت النساء بیگم کا در پردہ ہاتھ رہا۔ ادارہ ادبیاتِ اردو کی عمارت انہی کی عطا کردہ زمین پر تعمیر ہوئی۔ مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی جن کو خطابات عطا کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا جنہوں نے راشد الخیری کو "مصور غم" اور حیدر آباد کی مایہ ناز شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیر کو "چمن آرا" اور ضیا الدین احمد کو "برنی" اور تہنیت النساء بیگم کو "طوطی دکن" کا خطاب دیا۔[۴]

بیجاپور کے ممتاز مرثیہ گو شاعر مرزا کو اس بات کا اعزاز حاصل تھا کہ اس نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ لکھا اور کسی دیگر صنفِ سخن میں طبع آزمائی نہیں کی، حد تو یہ ہے کہ بادشاہِ وقت علی عادل شاہ شاہی کی فرمائش پر بھی اس نے قصیدہ لکھنے کے بجائے مرثیہ لکھا اور اس مرثیے کو بادشاہ کی نذر کر دیا۔ اسی طرح یہ سعادت تہنیت النساء بیگم تہنیت کو بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سوائے حمد، نعت اور منقبتوں کے کسی اور صنفِ سخن میں طبع آزمائی

۱، ۲، ۳ تہنیت النساء بیگم زور شخصیت اور شاعری مرتبہ ادارہ ادبیات اردو سنہ اشاعت ستمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۱۸

۴ " " " " صفحہ ۱۹

نہیں کی۔

تہنیت النساء بیگم صاحب طرز شاعرہ تھیں۔ انکی شاعری میں ساری فنی خوبیاں موجود ہیں۔ انکے تین نعتیہ شعری مجموعے جو غزل کی ہیئت میں ہیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں اور یہ تینوں مجموعے ''ذکر و فکر''، ''صبر و شکر'' اور ''تسلیم و رضا'' عوامی سندِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ انکے پہلے نعتیہ شعری مجموعہ ''ذکر و فکر'' پر امامِ رباعیات حضرت امجدِ حیدرآبادی رقم طراز ہیں ''بیگم زور (یعنی اہلیہ جناب ڈاکٹر زور صاحب المتخلصہ تہنیت) کا نعتیہ مجموعہ میں نے دیکھا ضعفِ بصر کی وجہ سے بعض جگہ اچھی طرح نہ پڑھ سکا۔ جہاں تک دیکھا اور جہاں تک سمجھا مجھے محسوس ہوا کہ بیگم مذکور الصدر حُبِّ نبیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ انکے اشعار سے ایک خاص قسم کی ربودگی اور فریفتگی محسوس ہوتی ہے اور شعر متاثر ہو کر کہے گئے ہیں۔ جنکا اثر پڑھنے والوں پر بھی ہوتا ہے بعض اشعار سے میں بھی متاثر ہوا ہوں مثلاً

وقتِ رخصت ہم پہ جو گذری وہ اب تک یاد ہے   چھوڑتے ہی ان کا در۔۔ تنہا نظر آنے لگے

امید کہ یہ نعتیہ مجموعہ مُحبانِ رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آتشِ شوق کو اور بھڑ کادیگا اور عوام و خواص میں قبول ہوگا'' علامہ شبلی، شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں ''شاعری کی اصل حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دِل میں کوئی جذبہ پیدا ہوا اور وہ اس جذبہ کو اسی جوش وخروش کے ساتھ ادا کردے جس جوش وخروش سے وہ پیدا ہوا تھا'' جس طرح میکہ سے رخصتی کے وقت دوری کے ایک خاص احساس سے وہ گذری ہیں اس طرح وقتِ زیارت انکا احساس ملاحظہ ہو

ہم اور بارگاہِ رسالتِ پناہ میں   مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے

پہلا شعر جذبۂ غم اور دوسرا جذبہ مسرت کا اظہار کرتا ہے لیکن شعر مبالغہ آمیزی سے مُبرا ہے۔ عام طور سے شاعری میں مبالغہ ضرورتِ شعر رہتا ہے لیکن یہاں پر خلوصِ جذبات نے اس کمی کو پورا کردیا ہے۔ اسی خلوص کے سبب ان کے اشعار اثر آفریں ہوتے ہیں۔

مقصود مرا لطف شہہ ہر دوسرا ہے   محبوبؐ مرا اصل میں محبوبِ خدا ہے

اسلامی مساوات اور غریبوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں۔

اسلام سکھاتا ہے محبت کے قرینے ایمان طلب گار رہ و رسمِ وفا ہے

سکندرِ آعظم نے موت سے پہلے وصیت کی تھی کہ اسکا جنازہ اسطرح لیجایا جائے کہ اسکے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہوں اسکا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مرنے کے بعد انسان خالی ہاتھ رخصت ہوتا ہے۔ انکی چشمِ بصیرت میں دولت کی فراوانی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

دیکھتے آئے ہیں باوصف زر و جاہ و جلال ہاتھ خالی ہی چلے جاتے ہیں دولت والے

اسوۂ نبیؐ کی کس عمدگی سے انہوں نے عکاسی کی ہے ملاحظہ ہو۔

غریبوں بیکسوں کی آس کیوں ٹوٹے کبھی تجھ سے ترا مسلک فقیرانہ تیرا دربار شاہانہ

اس شعر میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ حادیٔ برحق نے جہاں نان و جویں تناول فرمایا وہیں اپنے درِ فقیرانہ میں مختلف ممالک کے سفراء سے صلح نامے بھی تحریر و تکمیل کروائے۔

تہنیت النساء بیگم کو حضور اقدسؐ سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ انکے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رسالتمآبؐ کا ادب اتنا ملحوظ رکھتی تھیں کہ اپنے اشعار میں انہوں نے ان کے اسمِ مبارک کے استعمال سے ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے گریز کیا ہے۔ انکے اشعار پڑھنے کے بعد سامع کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ نعتیہ اشعار سُن رہا ہے لیکن شاعرہ نے ممدوح کا نام بتقاضۂ ادب لینے سے گریز کیا ہے۔ چند اشعار بطورِ ثبوت درج کئے جاتے ہیں۔

جو محروم ہو اُن کے چشمِ کرم سے نہیں کوئی ایسا ہماری نظر میں

☆☆☆☆

انسان کو جس نے واقفِ انسانیت کیا احسان کر گیا ہے جو سارے جہاں پر

مزدور اور غریب کے ہر دم رہا قریب رکھتا تھا جو کرم کی نظر ہر انساں پر

ہوتا ہے ذکر، رحمت و شفقت کا جب کبھی آتا ہے نام اُسی کا ہماری زباں پر

پیغمبر برحقؐ کے اظہار کے لئے انہوں نے حسب ضرورت ماہِ مدینہ، آقا، حضور، رسالتِ پناہ، حبیبِ حق اور محبوبِ خدا لکھا ہے ورنہ ضمائیر ہی سے کام لیتی ہیں مثلاً

آپ کے شوق میں ہر شوق کو ہم بھول گئے حرمِ پاک میں کچھ اور ہی حالات رہے

☆☆☆☆

وہ محبوبِ خدا یوں رہنمائے دین و دنیا ہیں نظر ان کی بنا دیتی ہے دیوانے کو فرزانہ

حضورِ نامدار نے اذیتیں سہہ کر بھی اذیت دینے والوں کو دُعا دیتے رہے۔ آپؐ فرماتے کہ وہ ظالم ان کو جانتے تو اسطرح نہ ستاتے۔ یہ کردار تاریخ عالم میں کسی اور شخصیت کا نظر نہیں آتا ایک بار ایک ضعیفہ دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئی لیکن رُعب نبوت سے مرعوب ہوگئی۔ حضورؐ نے رُعب کا ازالہ اسی وقت کر دیا کہ ''میں بھی تم جیسی عورت کا بیٹا ہوں میری ماں کو سوکھے گوشت کے کباب پسند تھے'' آپ اپنے اصحاب کے ساتھ اس طرح مل جل کر رہتے کہ نو وارد کو پہچاننے میں تکلف ہوتا آپؐ نے حقیقی مساوات کا نہ صرف درس دیا بلکہ عملاً کر دکھایا وہ اس طرح کہ آپؐ نے ایک لشکر تیار کیا جس کی سرداری کے لئے حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کو امیر مقرر کیا جبکہ خلیفۂ اول اور دوسرے اکابر صحابہ مامورین میں تھے۔ اور فتح مکہ کے وقت حضور کا مخالفینِ اسلام کے ساتھ فیاضانہ سلوک تاریخِ اسلام کا ایک درخشاں باب ہے۔ آپؐ کے اس مثالی کردار کو تہنیت النساء بیگم یوں خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔

جو یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی بشر ہیں وہ بھی بشر کیا وہ کر سکتے ہیں اُن کی ہمسری کردار میں

وہ اپنی شاعری کو عبادت تصور کرتی تھیں۔ اور راہِ نجات بھی۔

نبیؐ کی مدح سرائی میں تہنیتؔ کتنے غلام داخلِ خلدِ بریں ہوئے ہونگے

رسالتمابؐ سے انکی بے پناہ عقیدت اور والہانہ محبت کا اندازہ انکے درجِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

سر بہ سجدہ رہیں اٹھیں نہ کبھی پھر جو پہنچیں درِ نبی کے قریب
تہنیتؔ ہجر میں ملول نہ ہو دِن ہے اب تیرے حاضری کے قریب

☆☆☆☆

حرم میں جا بجا اِس شوق میں کئے سجدے حضورؐ جلوہ فگن بس یہیں ہوئے ہوں گے

☆☆☆☆

جب مدینے کی یاد آتی ہے ہم کو اپنا پتہ نہیں چلتا

درجِ بالا شعر میں انکی استغراقی کیفیت کا پتہ چلتا ہے اس شعر کو پڑھنے کے بعد بے اختیار جناب میر کا شعر یاد آجاتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

تہنیت النساء بیگم کو اہلبیتؑ کی مدح سرائی کا شرف بھی حاصل ہے۔ واقعہ کربلا سے کون ہے جس کا دل ملول نہیں۔ اس حزینہ کے تعلق سے وہ کہتی ہیں ۔

توشۂ صبر و رضا لائی ہے اولادِ علیؑ صبح زندان کیلئے شامِ غریباں کیلئے

صبحِ زندان اور شامِ غریباں کا تصور کیجئے اور انکا یہ شعر سنئے۔

کاش یہ جانتے اعدائے حسینؑ ابنِ علیؑ کس قدر چاہتے تھے سرورِ دیں ان پیاروں کو

محبتِ اہلبیتؑ ان کے قلب میں جاگزیں ہے اور وہ کہتی ہیں کہ ہر وہ مسلمان جس کے دل میں آل نبی کی الفت ہے حضورؐ اسکی شفاعت فرمائیں گے ۔

حبیبِ حقؐ ضامنِ شفاعت ہے دل میں آلِ نبیؐ کی الفت ہے

یہ زادِ رہ مل گیا ہے ہم کو رہ عدم کے سفر سے پہلے

وہ کہتی ہیں کہ وہ صحابہ جو صحبتِ حضورؐ سے فیض یاب ہوئے بڑے خوش نصیب تھے۔

وہ خوش نصیب تھے جو ہم نشیں ہوئے ہوں گے فدائے گیسوِ روئے مبیں ہوئے ہوں گے

اور پھر ان کی تمنا جس میں تاسف بھی ہے استعجاب بھی ہے اور ہلکی سی جھنجھلاہٹ بھی ۔

مجھے بھی کاش یہ نعمت نصیب ہو جاتی یہ بخت کیوں مرے ایسے نہیں ہوئے ہوں گے

وہ اپنی خوش نصیبی پہ نازاں ہیں کہ وہ زیارتِ مرقدِ رسولؐ سے مشرف ہوئیں لیکن ساتھ ساتھ انکو یہ خیال بھی ہے کہ کہیں وہ دوبارہ حاضری سے محروم نہ رہ جائیں

بخت رسا پہ ناز ہے لیکن یہ فکر ہے ایسا نہ ہو کہ یاد دوبارہ نہ کیجئے

۸/ نومبر ۱۹۹۶ء کو بروزِ جمعہ تہنیت النساء بیگم تہنیت رحلت کر گئیں ۔[1]

---

[1] ''تہنیت النساء بیگم زور شخصیت اور شاعری'' مرتبہ ادارہ ادبیات اردو سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۱

بشیر النساء بیگم بشیرؔ

حیدرآباد کی صاحبِ دیوان شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیرؔ جو نوشابہ خاتون کی ہم عصر تھیں 1915ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ۱؎ بشیرؔ النساء کے والد عبدالرحمٰن صاحب کا تعلق سرزمینِ پنجاب سے تھا۔ حصولِ روزگار کی جستجو میں وہ حیدرآباد آئے۔ حیدرآباد کی آب و ہوا، ماحول اور حیدرآبادی تہذیب سے متاثر ہو کر انہوں نے حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ حیدرآباد کے محکمہ سیاست میں وہ مددگار کے عہدہ پر فائز تھے اور حیدرآباد ہی میں پیوندِ خاک ہوئے۔ انکو اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی کافی مہارت تھی۔ بشیرؔ النساء کی والدہ شمس النساء بیگم حیدرآبادی تھیں۔ انکو بھی اردو ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ خطِ نستعلیق اس قدر خوبصورتی سے لکھتی تھیں کہ لوگ انکو ''شمسِ رقم'' کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ ۲؎ اسطرح بشیرؔ النساء کی آنکھ ادبی اور علمی ماحول میں کھلی۔ انکی ابتدائی تعلیم روایتی انداز میں مکان ہی پر ہوئی۔ ابتداء میں گلستاں، بوستاں، انوارِ سہیلی اور کیمیائے سعادت کے مطالعہ، قرآنِ مجید کی باقاعدہ تفسیر اور صرف و نحو کی تعلیم گھر پر انکے والدین نے دی۔ ۳؎ بشیرؔ النساء کے تعلق سے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کہا تھا ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے۔'' ۴؎

خوبیٔ قسمت سے بشیرؔ النساء کو ان کے خسر کی دولت اور شوہر کی بے پناہ محبت نے ان کے شعری فن کے نکھرنے اور سنورنے میں بڑا ساتھ دیا۔ ان کے خسر اکرام علی صفوی قدرشناس بزرگ تھے اور ان کے شوہر ضامن علی غازی نے ان کے ذوق کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۴۸ء میں ان کے شعری مجموعہ ''آبگینۂ شعر'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ وہ اپنے وقت کی واحد صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ ۵؎ بشیرؔ النساء صاحبِ طرز شاعرہ تھیں جن کا

۱؎ ماہنامہ ''سب رس'' جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۴
۲؎ ماہنامہ ''سب رس'' جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۳۹
۳؎ ماہنامہ ''سب رس'' جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۰
۴؎ ماہنامہ ''سب رس'' جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۲
۵؎ اخبار ''منصف'' مورخہ ۲۷/اپریل ۲۰۰۳ء (ادبی صفحہ)

اسلوب منفرد تھا۔انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن، حمد، نعت، منقبت، غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی نظموں میں زیادہ نکھار نظر آتا ہے۔انہوں نے غزلِ مسلسل لکھی ہے۔جن کو موضوع دے دیا جائے تو وہ موضوعاتی نظمیں کہلائی جا سکتی ہیں۔

بشیر النساء کے خسر اکرام علی صفوی مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے وابستہ شاعر صادق حسین غبار کے علاوہ علی حیدر نظم طباطبائی اور ابوظفر عبدالواحد کو بشیر النساء کے کلام میں زحمتِ اصلاح کے لئے آمادہ کیا تھا اس طرح بشیر النساء کے کلام میں نکھار پیدا ہوا۔[1]

مشہور رسائل عصمت، ساقی، ادبِ لطیف، انکشاف اور سب رس میں انکا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔خواجہ حسن نظامی کو خطابات دینے میں خاص ملکہ حاصل تھا علامہ راشد الخیری کو انہوں نے ''مصورِ غم'' ضیاالدین احمد کو ''برنی'' بیگم تہنیت النساء بیگم (بیگم زور) کو ''طوطیٔ دکن'' اور بشیر النساء بیگم کو ''چمن آراء'' کا خطاب دیا۔بشیر النساء کا شاعری کے تعلق سے نظریہ یہ تھا کہ شاعری مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہوتی ہے۔وہ اپنے جذبات اور احساسات کو شعری سانچہ میں ڈھالتی تھیں۔ان کے مندرجہ ذیل قطعہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

میرا ضمیر ہے بے تاب جستجو اس میں — جھلک رہی ہے میرے دل کی آرزو اس میں
بشیر کیا کہوں کیا شئے ہے ''آ بگینۂ شعر'' — مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

گو بشیر النساء مذہبی گھرانہ سے تعلق رکھتی تھیں پردہ کی پابند تھیں لیکن وہ سیاسی بصیرت، قومی احساس اور معاشی ادراک کی حامل تھیں۔انہوں نے گاندھی جی اور جناح صاحب کی ملاقات کے بعد ''دریوزہ آزادی''، جشنِ فتح کے موقع پر ''نوید امن'' ترقی پسند تحریک کے بارے میں ''ترقی پسند فنکار سے'' اور ۱۹۴۷ء کے غیر یقینی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے ''امید و بیم'' جیسی نظمیں تحریر کر کے اس وقت کے حالات کی تصویر کشی کی ہے جو تاریخ میں دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔بشیر النساء کی نظم ''امید و بیم'' کے چند شعر بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں۔

کیا خبر صورتِ امروز کا کیا ہو انجام — کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
لیکن اتنا تو سمجھ سکتے ہیں اربابِ نظر — زندگی عین دوراہے پہ کھڑی ہے ششدر
اک جانب وہی دریوزہ گری کے پیماں — دوسری سمت ہے خون ریز تباہی کے نشاں

[1] ماہنامہ ''سب رس'' جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۵

گر چہ آفاق سے پیدا ہے سحر کے آثار　　گر فضاؤں میں ہے شمشیر وسنان کی جھنکار

صبح نو زندگئ نو کی پیامی ہوگی
یا تو پھر اور بھی مضبوط غلامی ہوگی [۱]

بشیر النساء نے اپنے بعض قریبی عزیز و اقارب کی رحلت پر اپنے ذاتی اور شخصی تاثرات کو شعری شکل میں قلم بند کیا ہے۔ چنانچہ اپنے خسر مرزا اکرام علی صفوی کے دائمی مفارقت پر ان کا ایک بند درجِ ذیل ہے۔

زندگی خواب گر اس موت کی تعبیر ہے　　موت کیا ہے زیست کی بے جان سی تصویر ہے
ہو کے رہتا ہے جو قسامِ ازل نے لکھ دیا　　سامنے تقدیر کے بیکار سب تدبیر ہے
الغرض بننا، بگڑنا، قدرتی قانون ہے　　منحصر انسان پر کیا، یہ موت عالمگیر ہے
ہے زوالِ آمادہ، یہ سارا نظامِ کائنات　　موت کے اجزاء سے موجودات کی تعمیر ہے [۲]

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ سے بشیر النساء والہانہ عقیدت رکھتی تھیں۔ انکی رحلت پر بشیر النساء نے اپنے شخصی جذبات کو منظوم شکل میں بیان کیا ہے۔ یہ نظم مثنوی کے قوافی پر مشتمل ہے چند اشعار نمونتاً درجِ ذیل ہے۔

"برقِ ایمن" کا سراسر تیرا اندازِ بیاں　　عزم سے تیرے لرزتا تھا غرورِ آسماں
ٹولیاں لاکھوں کی آتی تھیں تیری آواز پر　　دنگ رہتا تھا زمانہ تیرے اس اعجاز پر
وہ تدبر، وہ فصاحت، وہ نوائے آتشیں　　آگ بھڑکا نا دلوں میں، وہ تیرا سوزِ یقیں
جگمگاتے شہہ نشیں پر، جلوہ فرمائی تیری　　اور انسانی سمندر پر وہ دارائی تیری
دم بخود رہتی تھی تیری تقریر کی جادوگری　　صبح تک بھی گرم رہتی تھی وہ بزم ساحری [۳]

بشیر النساء کو علامہ اقبال سے ایسی والہانہ عقیدت اور روحانی وابستگی تھی جیسے اقبال کو مولانا رومؒ سے اور اس عقیدت سے ان کے کلام پر بھی اقبال کا رنگ نظر آتا ہے۔ بشیر النساء بشیر کے میز پر علامہ اقبال کا ایک بڑا فوٹو چاندی کے فریم میں نصب کیا ہوا رکھا رہتا تھا۔ جس پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے حسبِ ذیل اشعار لکھے تھے۔

اقبال تیری قوم بیدار ہو رہی ہے　　تو سو گیا تو اب وہ ہوشیار ہو رہی ہے

---

۱ ماہنامہ "سب رس" جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۳۵　　۲ ماہنامہ "سب رس" جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۵
۳ ماہنامہ "سب رس" جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۶

اُٹھ دیکھ جوش تیرا ہر دل میں رونما ہے

قلب ونظر کی دولت اک آہِ صبح گاہی — فقرِ غیور سے ہے پیدا جلال شاہی

مردِ فقیر ''شاہی مسجد'' جگا رہا ہے

ملت کی بے حسی سے تنگ آ کے سوگیا ہے — دنیا کی سورشوں سے اکتا کے سوگیا ہے

آہستہ چل صبا ! یاں کیا تجھ کو ہو گیا ہے

اے چاند جس نے تجھ کو شاعر کا دل دیا تھا — ''قومی نشان'' کا منصب تجھ کو عطا کیا تھا

وہ پیرِ کارواں اب مرقد میں سو رہا ہے

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو — کیا کیا جتا رہا تھا اک خوش نہاد تجھ کو

فطرت کا وہ سندیسی دنیا سے جا چکا ہے

لاہور کی زمیں ہے اقبال مند کتنی — وابستگی تیری ہے اب سربلند کتنی

اب کعبۂ عقیدت یہ شہر بن گیا ہے [۱]

آصف سابع سے بشیر النساء بے پناہ عقیدت رکھتی تھیں جسکا اظہار انکے اشعار سے ہوتا ہے چند اشعار ذیل میں بطورِ نمونہ درج ہیں۔

وہ سادگی کہ تصدق ہوں جس پر اہلِ نظر — وہ کج کلاہی کہ دنیا کو ناز ہو جس پر

یہی وہ در ہے کہ قسمت جہاں بدلتی ہے — بغیر پھولے تمنا کی شاخ پھلتی ہے [۲]

بشیر النساء نے طبقۂ نسوان کی اعلیٰ ہمتی اور کارہائے نمایاں انجام دینے کی صلاحیتوں اور عظمت نسوان کی تعلق سے لکھا ہے۔

صنفِ نازک جسے کہتے ہیں یہ اربابِ نظر — ہے اسکی ذات پہ قوموں کی ترقی کا مدار

لازمی ہے کہ بنے قابلِ خدمت یہ بھی — کام کیوں کر وہ کرے جسکا ہو بازو بے کار

اپنی تاریخ پہ جس وقت نظر پڑتی ہے — ہم پہ ہوتے ہیں عیاں اپنے نمایاں کردار

کس کے افسانے سے توقیر ہے جھانسی کی سوا — سطوتِ نور جہاں سے ہے کس کو انکار

یاد رکھو کہ ہے یہ عالمِ ہستی ہم سے — ہم جو مٹ جائیں تو مٹ جائیں گے یہ لیل ونہار

بشیر النساء نے بڑی اثر انگیز نعتِ شریف لکھنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے اور

---

[۱] ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۶،۴،۲ [۲] ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۷

ان نعتوں میں وہ رسالتمآب کی خدمتِ اقدس میں قوم کی بے حالی کا ذکر کرتی ہیں۔

حضور دہر کی حالت بیان کیا کیجیے ہے عرضِ حال سے قاصر زبان کیا کیجیے
تقاضہ دل کا ہے رنگِ مآل عرض کروں شکستہ حال مسلمانوں کا حال عرض کروں ا
محشر بپا ہے باہمی جنگ و جدال سے کیا بے خبر حضور ہیں امت کے حال سے
جینے پہ بس ہے باقی، نہ مرنے پہ اختیار زندہ ہیں، زندہ قوموں میں لیکن نہیں شمار
یہ کیفیت ہے امتِ خیر الانام کی قرآن میں نوید ہے، جسکے دوام کی ۲

بشیر النساء نے شہدائے کربلا کی خدمتِ اقدس میں اپنے جذبات واحساسات کے مضمون باندھے ہیں ان کے ایک سلام کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

تمام فوجِ عدو ہے حیراں، امامِ دیں مسکرا رہے ہیں
کہ لعلِ زینب کے ننھے ننھے، بپھر کے میداں میں آ رہے ہیں
تمام حوریں سنور رہی ہیں، ملائکہ بندوبست میں ہیں
کہ اہلِ بیتِ رسولِ اکرم، شہید ہو ہو کے آ رہے ہے
بشیر النسیاء دونوں جہاں کی خوشیاں، حسینؑ انکو عطا کریں گے
غمِ شہادت میں جتنے شاعر، سلام اپنے سنا رہے ہیں ۳

بشیر النساء نے بزرگانِ دین کی خدمتِ اقدس میں منقبتیں بھی لکھی ہیں خواجۂ اجمیریؒ کی خدمت میں والہانہ وابستگی کا اظہار ان کے ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے۔

فضا اجمیر کی معمور ہے، خواجہؒ کی بخشش سے کہ بہتروں نے بن مانگے یہاں دولت کمائی ہے
بشیر دلِ حزیں پر ہو کرم اجمیرؒ کے باشی غم و آلام نے گھیرا میرے مولی دہائی ہے ۴

بشیر النساء کو بزرگانِ دین سے قلبی لگاؤ تھا حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ جنکی قیام گاہ کٹل گوڑہ میں واقع ہے اور جن کا مدفن کرمن گھاٹ میں ہے وہ سلسلہ صابریہ کے بڑے بزرگ تھے انکے عرس کے موقع پر وہ ہر سال صندل شریف لے جانے کیلئے اپنی کار روانہ کرتی تھیں۔ ۵ شاہ فخر الدینؒ صاحب اپنے وقت کے با اختیار بزرگ گزرے ہیں۔ سر حیدری (سابق وزیرِ اعظم حیدرآباد) انکے بڑے عقیدت مند تھے جب وہ حضرت کے مکان جاتے تو آہستہ بیرونی دروازے کو کھٹکھٹاتے جہاں حضرت تشریف رکھا کرتے تھے

۱، ۲ ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۱ ۳ ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۵
۴ ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۳ ۵ ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۶۱

حضرت جب پوچھتے ''کون'' تو سر حیدری نہایت ادب سے کہتے ''خادم باریابی کی اجازت چاہتا ہے'' حضرت فخر الدین ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کی بشیرا لنساء عقیدت مند تھیں ۔ حضرت کے مکان کے قریب حیدرآباد کے نامور فزیشین ڈاکٹر میر مصطفیٰ علی زیدی صاحب رہا کرتے تھے ۔ ایک بار انکے مکان میں کوئی کمسن لڑکا غلطی سے زہر کی شیشی میں سے کچھ زہر پی لیا اور بے ہوش ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے حتی المقدور کوشش کی لیکن انکی کوشش کارگر نہیں ہو رہی تھی وہ دوڑتے ہوئے حضرت کے مکان آئے اور معروضہ کیا کہ وہ ایک نظر بچہ کو دیکھ لیں حضرت ، ڈاکٹر صاحب کیساتھ انکے مکان گئے پوچھا وہ کونسی شیشی ہے ڈاکٹر صاحب نے وہ شیشی انکے روبرو رکھ دی حضرت نے بچہ کا منہ کھول کر بوتل بچہ کے منہ کو لگا دی اور جو کچھ بوتل میں باقی تھا اس طرح بچہ کے منہ میں یہ کہتے ہوئے ڈال دیا کہ ''زندگی ہے تو موت نہیں اور موت ہے تو زندگی نہیں'' زنانہ میں ایک کہرام مچ گیا لوگ اس حرکت سے بچہ کی موت کو یقینی تصور کر رہے تھے لیکن بفضلِ خدا بچہ صحت یاب ہو گیا شاید ایسے ہی صاحب دل بزرگ کیلئے علامہ اقبالؔ نے ارشاد فرمایا ۔

کوئی اندازہ بھی کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ڈاکٹر مصطفیٰ زیدی اپنے وقت کے نہ صرف حاذق ڈاکٹر تھے بلکہ باکردار، پاکباز اور انسان دوست تھے ۔ سرما کے موسم میں ڈاکٹر صاحب رات کے تیسرے پہر اپنی کار میں بلانکٹس لیے نکلتے اور فٹ پاتھ پر سردی سے کانپتے ہوئے محوِ خواب لوگوں کو بلانکٹ اڑھا کر چلے جاتے ۔ ضرورت مندوں کی دامے درمے اور سخنے مدد فرمایا کرتے تھے ۔ مجلسِ عزا میں منبر پر رونق افروز ہوتے ڈاکٹر صاحب کے مجلس پڑھنے کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ عمل پر زیادہ توجہ دیتے تھے ۔ ڈاکٹر زیدی نوجوانوں سے مخاطب ہوتے اور کہتے تھے وہ اپنے میں کردارِ حیدرِ کرارؓ ، فقرِ بوزرؓ اور صدقِ سلمانیؓ کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کریں تا کہ وہ اسلام دشمن قوتوں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی اہلیت کے حامل ہو جائیں بقول علامہ اقبالؔ ۔

مٹایا قیصر کسریٰ کو کسریٰ کے استبداد کو کس نے وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ فقرِ بوزرؓ، صدقِ سلمانیؓ

سرزمینِ دکن کی یہ مایہ ناز دختر ۲۰ر فبروری ۱۹۷۲ء کو اپنی یادوں کے گہرے نقوش چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں ۔ ؎۱

؎۱ ماہنامہ ''سب رس'' ماہ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۶۵

صاحبزادہ محمد علی خاں میکشؔ

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ کا تعلق خانوادہ آصفیہ سے تھا ان کے والد میر جہاندار علی خاں ریاست حیدر آباد میں نائب تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) تھے۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ عیش وعشرت میں گذرا۔ وہ سٹی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کالج جانے کے لئے ان کو کار کی سہولت حاصل تھی۔ میکشؔ کو کم عمری سے شاعری کا ذوق تھا۔

میکشؔ ۱۹۱۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گریہ وتبسم'' منصۂ شہود پر آیا۔۱ میکشؔ نہ صرف صاحبِ طرز شاعر تھے بلکہ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر قادر محی الدین زور اور ادارہ ادبیات اردو سے ان کو خاص تعلق خاطر تھا۔ ڈاکٹر زور نے ماہنامہ ''سب رس'' کے اجرا ہونے پر میکشؔ کو اس ماہنامہ کی ادارت کی ذمہ داری سونپی۔ میکشؔ کی شبانہ روز محنت نے اس رسالے کو معیار عطا کیا اور کچھ ہی عرصہ میں سب رس کا شمار اردو کے موقر جریدوں میں ہونے لگا۔ وہ زود گو شاعر اور قلم کار تھے۔ کسی موضوع پر بھی وہ قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے مضامین میں تنوع تھا۔ شائد اتنی کم عمری میں کسی شاعر کا مجموعہ کلام تکمیل پایا ہوگا۔ کم عمری میں ان کی فکر اور کلام کے بارے میں حیدر آباد کے عظیم رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدر آبادی نے کہا تھا'' کہنے والا کوئی اور ہے'' اس طرح صوفی منش بزرگ شاعر حضرت امجد حیدر آبادی نے میکشؔ کے الہامی انداز سخن کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حیات کے وسیع پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ انہوں نے اپنے تجربات کا اظہار پیچیدہ نہیں بلکہ سادہ انداز میں کیا ہے جو اس عہد کا تقاضہ تھا۔ ان کی

۱۔ دو آتشہ مرتبہ عزیز قیسی، جون ۱۹۸۷ء صفحہ نمبر ۱۴

شاعری پُر اثر تھی اور ان کا اسلوب پر شاعر مشرق علامہ اقبالؔ اور شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں اندھیری کالج بمبئی میں جشن اقبال کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر زور کرنے والے تھے۔ میکشؔ بھی اس جشن میں مدعو تھے۔ بمبئی پہنچنے کے بعد میکشؔ کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتے تھے کیونکہ شام میں ان کو جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کمرے میں داخل ہوئے اور میکشؔ سے علامہ اقبالؔ کی چند کتابیں حوالے کرتے ہوئے خواہش کی کہ وہ اقبال پر اپنا مقالہ تیار کرلیں جسے انہیں جلسہ میں سنانا تھا۔ میکشؔ طبیعتاً یا اخلاقاً بامروت اور زود نویس تھے انہوں نے انکار نہیں کیا۔ حسبِ عادت کاغذ اور قلم سنبھالا اور ڈیڑھ دو گھنٹوں میں مبسوط مقالہ تیار کردیا۔ جلسہ گاہ میں چار پانچ ہزار علمی اور ادبی ذوق کے شائقین جمع تھے۔ صاحبان علم ونظر نے ان کے مقالہ کو بڑی دلچسپی سے سنا اور داد و آفرین دی۔ میکشؔ ادبی حلقوں میں اپنی فکر انگیز تقاریر سے لوگوں کو گرویدہ بنالیتے تھے۔[1]

مئی ۱۹۴۶ء میں تعلقہ کوڑنگل میں ادارہ ادبیات اردو کی شاخ کی طرف سے اردو کانفرس اور مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ میکشؔ، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنولؔ، سلیمان اریبؔ اور دیگر شعراء نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ صدر جلسہ نے کسی وجہ سے کانفرنس میں شرکت سے معذرت چاہی۔ معتمد کانفرنس نے میکشؔ کو صدارت کے لئے آمادہ کرلیا۔ صدر جلسہ کو رسمی طور پر تقریر یا خطبہ سنانا پڑتا ہے اس لئے میکشؔ نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور ایک گھنٹہ کے اندر اپنے خطبہ کو تحریر کرڈالا۔ ان کا یہ خطبہ زبان اور ادب سے متعلق ایک معلومات آفرین ادبی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔[2]

علامہ اقبالؔ نے جس دن اس دنیائے فنا سے دنیائے بقا کی طرف کوچ کیا خواجہ حمید الدین شاہد ملاقات کیلئے میکشؔ کے گھر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ میکشؔ نہایت مغموم اور افسردہ عالم اضطراب میں ٹہل رہے تھے۔ خواجہ شاہد صاحب نے میکشؔ سے کہا "اگر وہ کل تک اقبالؔ کی موت پر ایک نظم لکھ دیں تو وہ سمجھیں گے کہ واقعتاً میکشؔ شاعر ہیں۔" دوسرے دن صبح ہی میکشؔ نے نظم اور خط خواجہ حمید الدین شاہد کو بھجوایا۔ خط کا ایک جملہ یہ تھا

۱؎ ماہنامہ "سب رس" مارچ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ نمبر ۵ اور ۱۳
۲؎ سب رس مارچ و اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ نمبر ۵

''تم نے کہا تھا اگر اقبالؔ پر نظم نہ دی تو تم شاعری ہی نہیں، لو خدا نے شاعر بنا دیا نظم مرسل ہے۔''[۱] یہ واقعات میکشؔ کی زود نویسی اور بسیار نویسی کا ثبوت ہیں۔

میکشؔ نے کوئی اعلیٰ تعلیمی سند حاصل نہیں کی تھی نہ ہی ان کی تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا یہ صرف خدا کی دین اور ان کی اکتسابی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ انتہائی قلیل عرصہ میں وہ آسمان شعر و ادب پر تابندہ ستارے کی طرح دمکنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ رہنمائے کارواں نہ تھے لیکن رہ روان شوق کے پیچھے چلنے میں سلامتی کا احساس رکھتے تھے۔ بانی شہر حیدر آباد (قلی قطب شاہ) اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا یہ شعر آج تک شہر حیدر آباد کے در و بام میں گونج رہا ہے۔

پیا باج یک تل جیا جانے نا ۔۔۔ پیا باج پیالہ پیا جاے نا

وہیں پر میکشؔ کا یہ شعر بھی حیدر آباد کی فضاؤں میں اپنی تاثیر کو منواتا ہے۔

پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا ۔۔۔ شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا

یہ شعر پڑھ کر بے ساختہ سوداؔ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں ۔۔۔ کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ

میکشؔ کو کم عمری میں اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

یہ بھی دیکھیں گے جو جیتے رہ گئے ۔۔۔ زندگی ڈھونڈے گی ہم کو بعدِ مرگ

اور ہوا بھی یہ کہ میکشؔ اپنی زندگی کے ۳۸ بہاریں دیکھنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو لوگ رہ گئے وہ دیکھ رہے ہیں کہ زندگی میکشؔ کو ڈھونڈ رہی ہے اور شاعر کا یہ شعر حدیثِ دل بن گیا ہے۔ اس موقعہ پر اس نوعمر شاعر کا قصہ یاد آ رہا ہے جس نے سوداؔ کی موجودگی میں غزل سرا ہو کر یہ شعر پڑھا تھا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ۔۔۔ دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

جناب سوداؔ چونک پڑے اور نوعمر شاعر کو دیکھا۔ شعر کی تعریف کی۔ شعر کو بار بار پڑھوایا اور کہا کہ ''میاں لڑکے جواں ہوتے تو نظر نہیں آتے'' اور یہی ہوا۔ مرزا غالبؔ نے تین مرتبہ اپنی تاریخ وفات نکالی لیکن دو بار مقررہ تاریخ پر تاریخ غلط ثابت ہوئی۔ شائد میکشؔ نے جب یہ شعر کہا وہ وقت قبولیت کا تھا یا وہ ایک الہامی واقعہ تھا جس سے متاثر ہو کر

۱۔ سب رس مارچ و اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ نمبر ۲

انہوں نے وہ شعر لکھا۔

مخدومؔ، وجدؔ اور میکشؔ عثمانین شاعروں کا ایک تکون تھا۔ مخدومؔ اور وجدؔ نے طویل عمر پائی اور اہل حیدرآباد ان کے شعری اور علمی خدمات کے معترف رہے لیکن میکشؔ جواں عمری میں چل بسے۔

زندگی بھر میکشؔ اپنے عصری کرب سے بے تاب رہے وہ چاہتے تو آسودہ حال زندگی گذار سکتے تھے لیکن انہوں نے قفس کو آشیاں سمجھنے سے گریز کیا۔ ان کی طبیعت میں قناعت پسندی تھی۔ شبنم کے ایک قطرے سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے وہ رضامند تھے زندگی بھر محرومیوں کا شکار ہونے کے باوجود انکے لبوں پر حرفِ شکایت نہیں آیا۔ ذیل کے اشعار ان حقائق کی تفسیر کرتے ہیں۔

مجھے شبنم سہی اپنے کا حق میں بھی تو رکھتا ہوں ۔۔۔ حصاروں میں سمندر کو ہوس نے گھیر رکھا ہے

زندگی کو دے رہا ہوں صرف سانسوں کا خراج ۔۔۔ مجھ کو کب آزمایا ہے فریبوں نے کہ آج

میں نے ڈالے آنسوؤں پر مسکراہٹ کے نقاب ۔۔۔ میں نے ہنس ہنس کر چھپائے اپنے دل کے اضطراب

میکشؔ نے جو نظم اپنے بیٹے فہیم کے نام لکھی ہے یہ نظم ''ننھے فہیم سے''، نئی نسل کے نام، اپنے دو سالہ بچے کے توسط سے لکھی گئی ہے وہ میکشؔ کی شاعری نہیں بلکہ زندگی ہے۔

دیر تک میں دلدلوں کا ساتھ دے سکتا نہیں ۔۔۔ ریت اور کیچڑ میں اپنی ناؤ کھے سکتا نہیں

دن وہ آئیں گے نظر آوں گا اصلی روپ میں ۔۔۔ اب تو ڈھلتی چھاوں ہوں میں دوپہر کی دھوپ میں

میکشؔ کی انقلابی شاعری سے جبینِ خسروانہ شکن آلود ہوگئی اور ان کو نشر گاہِ حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ روزگار کے چھین جانے سے وہ زندگی کے آخری دنوں میں لہو تھوکتے گزارے۔ وہ مرضِ دق میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان دنوں لاعلاج مرض تھا۔ اپنا اپنی بیمار بیوی اور بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے وہ روزناموں اور رسالوں میں لکھتے رہے جہاں سے ان کو صرف دادِ تحسین ملی۔ ان کا کلام ان کے دور کا آفریدہ تھا انہوں نے اپنی شاعری میں جس کا احاطہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

اڑتے ہیں اب قفس کی طرف آشیاں سے ہم ۔۔۔ بیزار ہوگئے ہیں بہار و خزاں سے ہم

کچھ چونکنے ہی والے تھے خوابِ گراں سے ہم ۔۔۔ قسمت نے اپنے ساتھ تھپک کر سلا لیا

وہ بھی زمین پہ آتے ہی بے نور ہوگئے تارے اڑا کے لائے تھے کچھ آسماں سے ہم

انہوں نے نظم، غزل، گیت اور رباعی کے اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مشاعروں کے علاوہ نہ صرف جرائد اور اخبارات میں انکے کلام سے لوگ واقف ہوتے رہے بلکہ حیدرآباد کے گلوکاروں کی وجہہ سے انکے کلام سے لوگ روشناس ہوئے۔

میکشؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''نوید'' ۱۹۴۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ مخدومؔ اور وجدؔ اپنے مخصوص ترنم میں اپنا کلام سناتے لیکن میکشؔ تحت اللفظ میں پڑھتے۔ ذیل کے شعر سے میکشؔ کے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

بھوک سے خودداریوں کو موت آسکتی نہیں یہ ہوا شمعِ صداقت کو بجھا سکتی نہیں

سکندر علی وجدؔ نے ''تاج محل'' کے تعلق سے اپنے احساسات کا یوں اظہار کیا ہے۔

جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا الفت کا خواب، قالب مرمر میں ڈھل گیا

صاحبزادہ میکشؔ جو ترقی پسند تحریک کے حامی تھے اور تحریک اشتراکیت سے متاثر تھے انکی نظر تاج کے حسن پر نہیں بلکہ ان مزدوروں کے خون اور پسینے پر پڑتی ہے جنہوں نے تاج محل کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔

وہ تنے مضبوط سینے، وہ اٹھے مضبوط ہاتھ تاج پر وہ مسکرائی زندگی مزدور کی

میکشؔ کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ان کے نظریات میں یکسر تبدیلی واقع ہوئی اور انہوں نے اشتراکی نظریات کی علی الاعلان مخالفت شروع کردی تھی۔ میکشؔ کی شاعری میں رجائیت کا اظہار پایا جاتا ہے۔

زہرِ غم ہنس ہنس کے پینا چاہئے موت آنے تک تو جینا چاہئے

میکشؔ نے کئی موضوعاتی نظمیں لکھی ہیں جن میں کسان، بھکارن، چرواہا، مزدور، لال قلعہ، ٹیپو، چاندنی رات اور سال نو وغیرہ میں اپنے عہد کے سارے مسائل، اضطراب، طبقاتی کشمکش، ملک کے سیاسی حالات، معاشی مسائل، مذہبی رہنماوں کی تنگ دلی اور سرمایہ دار نظامِ حکومت کی خرابیوں کا انہوں نے احاطہ کیا ہے۔ ان کی نظم ''میری شاعری'' کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے سماج پر مُلّا اور مہاجن اور سرمایہ داری کی اجارہ داری پر بھرپور طنز کیا ہے۔

ذلتوں کا یہ تصور یہ گناہوں کا رواج　　تنگ دل مُلّا کا مذہب ہے مہاجن کا سماج
پشت پر افلاس کے سرمایہ داری کا نظام　　عرس قبرستان میں اور بستیوں میں قتلِ عام

اپنی نظم ''کتابیں'' میں انہوں نے فاقہ زدہ لوگوں کے لئے کتابوں کی نہیں بلکہ روٹی کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

جس سے ساحل کی طرف اپنا سفینہ بڑھ جائے　　زورِ طوفان کی وہ قوت ہے حبابوں کی نہیں
کتنی بے نور ہے ان فاقہ زدوں کی آنکھیں　　ان کو روٹی کی ضرورت ہے کتابوں کی نہیں

اپنی نظم ''تاریخ'' میں انہوں نے شخصی حکومت اور اس میں عوام کے استحصال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

وہ شہنشاہوں کی عظمت' بادشاہوں کا جلال　　چوم لے جن کو فلک ان بارگاہوں کا جلال
مصلحت آمیز آئینِ وفا کی پختگی　　زر پرستوں کی سیاست کج کلاہوں کا جلال
جس طرف پلٹیں نظامِ زندگی تھرا اُٹھے　　بجلیوں میں دوڑنے والی نگاہوں کا جلال
وہ کنیزوں کی چھما چھم سے حرم اندر سبھا　　جن کی عصمت کا محافظ ہے گناہوں کا جلال
مطربوں کا سحرِ نغمہ' ساغرِ صہبا کا رقص　　کھینچ لیں جو حور کو بھی ایسی باہوں کا جلال

اپنی نظم ''اجنتا'' میں انہوں نے جہاں اجنتا میں موجود نادر تراشیدہ مجسموں کی فنکاری اور ان کے حسن و جمال کا ذکر کیا ہے وہیں پر انہوں نے معاشرے کے کمزور طبقات کی مجبوریوں کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

کتنے دم توڑتے انسان ہیں مجبورِ حیات　　جن کی قسمت میں نہیں غار بھی رہنے کے لئے
عہدِ رفتہ کے مزاروں پہ ہے رنگین غلاف　　عصرِ امروز غمِ دہر ہے سہنے کے لئے

ملک کے نامور فرزند ''ٹیپو سلطان'' جن کی جانبازی اور شجاعت کے قصے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں انکو میکش نے اپنی نظم ''ٹیپو'' میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انکے خون اور تلوار کی قسم کھا کر میدانِ کارزار میں سرگرم ہونے کا عہد کیا ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

بہہ رہا ہے جیسے تیرے جسم تازہ سے لہو　　اب بھی یوں اپنے تصور میں تجھے پاتے ہیں ہم
ہم کبھی ضائع نہ جانے دیں گے تیرے خون کو　　آج پھر تیری شہادت کی قسم کھاتے ہیں ہم

اب تری عہد آفریں تلوار کی ہم کو قسم　　اب بہ اندازِ دگر میدان میں آتے ہیں ہم

اپنی نظم ''تضاد'' میں میکشؔ، مسئلہ جبر وقدر اور خیر وشر کے تعلق سے اپنے مخصوص لہجہ میں ذاتِ باری سے رجوع ہوتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے عام رحمتِ یزداں تو امتحان کیوں ہے　　کوئی ہے مشقِ ستم کوئی شادماں کیوں ہے
یہ مندروں میں پرستش یہ مسجدوں میں نماز　　خدا ہے دل میں تو پھر سنگِ آستاں کیوں ہے
یہ خیر و شر کا جہاں حلقۂ تضاد میں ہے　　یہ حُسنِ ظن ہے تو انسان بدگماں کیوں ہے

میکشؔ نے اردو کی محبوب صنف غزل میں طبع آزمائی کی ہے ان کی غزلوں میں مترنم بحور، بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب اور سلاست زبان نے ان کے کلام میں نغمگی پیدا کی ہے۔ ان کی غزلیات میں تغزل پایا جاتا ہے۔ انکی غزلوں میں حسن و عشق کی حکایتیں بھی ملتی ہیں، ساغر و مئے کے تذکرے بھی اور انہوں نے اپنی شاعری میں علامتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ حرکت اور عمل کا پیغام بھی ملتا ہے۔ سیاسی جبر کا بھی انہوں نے اپنی شاعری میں احاطہ کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ امتیاز رہے میکدے میں میکشؔ کا　　لبوں سے اپنے ہر ایک جام کو لگا کے پلا
گرتے گرتے ان کا دامن تھام لے　　گرنے والے لغزشوں سے کام لے

ذیل کے اشعار میں میکشؔ نے حسن و عشق اور محبوب کی معشوقانہ، معصومانہ اور دل فریب اداؤں کی نہایت حسین اور دلکش پیرائے میں عکاسی کی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہنس کے دیکھا دیکھ کر تڑپا دیا　　دیکھنے والے کو تڑپا کر ہنسے
ان کا غصہ بھی ہے کتنا صلح جو　　اپنے ماتھے پر شکن لا کر ہنسے
مجھ کو جب دیکھا تو آنسو بہہ گئے　　میں نے جب دیکھا تو گھبرا کر ہنسے
ہنستے ہنستے رک گئے کچھ سوچ کر　　وجہ جب پوچھی تو شرما کر ہنسے
کھیل سوجھا مجھ کو سائل دیکھ کر　　میرے آگے ہاتھ پھیلا کر ہنسے
میکشِ خاموش نے مانگی جو مئے　　دور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

اس غزل کو پڑھنے کے بعد مومن خاں مومنؔ اور حسرتؔ موہانی کا کلام یاد آجاتا ہے۔ یہ دونوں شاعروں کے کلام میں حسن وعشق کی حکایتیں مترنم بحور اور شوخی کلام دیدنی ہے۔ مومن کی مشہور زمانہ عشقیہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حسرت موہانی کی رنگین اور دلکش عشقیہ غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

بارگاہِ ایزدی میں میکشؔ عرض کرتے ہیں کہ وہ امیدوارِ کرم ہیں اور ان کی زندگی کا دارومدار امید پر ہے وہ ذاتِ باری سے ان کو یاد رکھنے اور بھول نہ جانے کی استدعا کرتے ہیں۔

ہوں امیدوارِ کرم ترا، مری زندگی ہے امید پر
کبھی بھول کر مجھے یاد کر کبھی یاد کرکے بھلا نہ دے

عام طور پر شعراء نے غم، مصائب، حزن وملال سے نجات کے لئے آغوشِ موت کو لازم قرار دیا ہے۔ میکشؔ نے اپنی جدت پسندی سے ایک نیا مضمون باندھا ہے۔

اب سکونِ مرگ سے ہیں مضطرب
صدمۂ ہستی تو میکشؔ سہہ گئے

میکشؔ دیدارِ حق کے لباس مجاز میں ناممکن ہونے پر شاکی ہیں۔

آنکھوں سے دیکھتے تجھے دنیا میں اے خدا
تو ہی بتا نصیب یہ لائیں کہاں سے ہم

اپنے کلام میں وہ عزم، استقلال اور حوصلہ کا درس دیتے ہیں۔

لنگر کو توڑ دیں گے جو ساحل کی ہو تلاش
باندھیں گے اپنی ناؤ کو موجِ رواں سے ہم

ایسے زود گو اور خوش فکر شاعر جوارضِ دکن میں اپنے مخصوص لہجہ اور کلام کی وجہ سے اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے لیکن عجیب بدقسمتی ہے کہ جس دن میکشؔ اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے اس دن جامعہ عثمانیہ کے قدیم طلبا کا کوئی بڑا جلسہ منعقد کیا گیا تھا لیکن صد افسوس شرکائے جلسہ کی بے حسی پر جنہوں نے اس اطلاع پر کوئی خاص ردِعمل

ظاہر نہیں کیا۔ ان کے جلوسِ جنازہ میں شریک احباب کی تعداد پچیس پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ اشائد ایسے ہی واقعہ سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے کہا ہے۔

نہ شور ماتم نہ جنازے پہ ہجوم احباب اتنا خاموش غریبوں کا سفر ہوتا ہے

ا ماہنامہ سب رس مارچ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ نمبر ۴۰

امیر احمد خسرؔو

امیر احمد خسرو کا پورا نام معہ کنیت و تخلص ابوالحسن احمد خسرؔو ہے۔ وہ ۲۱/ جولائی ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے[1] جامعہ عثمانیہ سے انہوں نے ۱۹۴۰ء میں بی۔اے کیا اور ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے۔[2] وہ بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ۱۹۷۹ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔[3] شعری وادبی شوق انکو ورثہ میں ملا ان کے بڑے بھائی خورشید احمد جامی کا حیدرآباد کے معروف شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ امیر احمد خسرؔو اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ادبی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اپنے بڑے بھائی خورشید احمد جامؔی کی طرح ان کو بھی نظم ونثر میں دسترس حاصل تھی۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی نظم اور نثر کی بے شمار تخلیقات نشر ہوتی رہی ہیں۔ مشاعروں میں اپنی مخصوص ترنم میں وہ اپنا کلام سنا کر دادِ تحسین سے نوازے جاتے تھے۔ انکے تین مجموعے کلام ''صدف'' ۔ ''اجالوں کی زبان'' اور ''اکھوا'' (بچوں کی نظمیں) زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔[4] ہندوستان کے بیشتر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اردو، فارسی، شعراء کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے ادیبوں اور شاعروں کے کلام کا بھی وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی خورشید احمد جامؔی کی طرح اُنکو بھی جاسوسی ناولوں کا بڑا شوق تھا یورپی جاسوسی ناول نگار کے ناولوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے ہم عصر شعراء میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، اوج یعقوبی، خواجہ شوق اور خیرات ندیم قابل ذکر ہیں۔ انکو ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ادبی ٹرسٹ کے ایک مشاعرے میں انہوں نے اپنے لحنِ داودی میں ایک حسین غزل سنائی تھی جس پر سارا

---

[1] [2] [3] [4] شخصی انٹرویو از افتخار اقبال برادر خورد امیر احمد خسرؔو مورخہ ۷/ ستمبر ۲۰۰۳ء

مشاعرہ جھومنے لگا تھا اُس غزل کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

کون کہتا ہے سرِ عرشِ بریں رہتا ہے　　وہ تو اک درد ہے جو دل کے قریں رہتا ہے

☆☆☆☆

وہ جو سورج کو ہتھیلی میں لئے پھرتا تھا　　ان ہی تاریک سی گلیوں میں کہیں رہتا تھا

اخبارِ سیاست میں انکی غزلیں، اور نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں علی صدیقی مرحوم صدر عالمی اردو کانفرنس کی دعوت پر عالمی اردو کانفرنس کے زیر اہتمام دلی کے عظیم الشان کل ہند مشاعرے میں امیر احمد خسرو اپنے دل گداز کلام سے سامعین کے قلوب کو متاثر کیا تھا۔ امیر احمد خسرو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہندوستان منعقدہ مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ جدّہ میں ۳۰ رڈسمبر ۱۹۹۲ء کو بزمِ عثمانیہ جدّہ کی جانب سے منعقد کئے جانے والے مشاعرہ میں انکا کلام بے حد پسند کیا گیا۔[۱] زندگی کے آخری زمانے میں امیر احمد خسرو پر مذہبی رنگ غالب آگیا تھا۔ اس دور میں انہوں نے نعتیہ اور منقبتی کلام کثرت سے لکھا اور وہ اپنے اس کلام کو نہایت عقیدت و احترام کیساتھ مشاعروں میں سنایا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشاعرہ گاہ پر نور و نکہت کی بارش ہو رہی ہے۔ انکا نعتیہ اور منقبتی کلام ابھی تک زیور اشاعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

امیر احمد خسرو نے ساری ادبی تحریکوں، رویوں اور رجحانوں، سے متاثر ہوئے بغیر شعر کہا ہے۔ انہوں نے غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کو نیا آہنگ، اسلوب اور لہجہ دیا۔ امیر احمد خسرو نے درد کی تصویر کشی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے ملاحظہ ہو[۲]

کاغذ پر لکیریں، کوئی آڑی، کوئی ترچھی　　اس طرح مرے درد کی تصویر بنی ہے

امیر احمد خسرو کی شاعری میں مجاز اور حقیقت گھل مل گئے ہیں اور یہی انکی غزل کا اصل رنگ ہے جو ارضی محبوب سے لے کر حقیقی محبوب (حضورِ اکرم رسالتؐ) تک پہونچا تا ہے۔

بیکل اتساہی نے اپنے ایک نعتیہ شعر میں راہِ نجات کو حضورؐ کی ذات سے منسوب کیا ہے

۱۔ شخصی انٹرویو از افتخار اقبال برادر خورد امیر احمد خسرو مورخہ ۷ر ستمبر ۲۰۰۳ء

۲۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے مرتبہ صلاح الدین نیر یکم نومبر ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۷۰

میں بھٹک ہی چلا تھا خدا کی قسم میرے ہر سمت تھا حسنِ دیر وحرم
وہ تو کہئیے کہ ایک شمع مہ خانہ سے راستہ مل گیا راستی کیلئے

اس مفہوم کو امیر احمد خسرو نے اپنے شعر میں یوں کہا ہے

بھٹک رہی تھی نظر وقت کے اجالوں میں ترے خیال کا سورج جسے سنبھال گیا

خورشید احمد جامی بے شک بڑے شاعر تھے اور انکی غزلوں میں فنکاری، قوافی، تراکیب، استعارے اور تشبیہات بڑے سلیقہ سے استعمال ہوئے ہیں جن سے امیر احمد خسرو متاثر ہوئے ۔ لیکن اس رہِ گزر میں دردوغم کی دولت لے کر وہ کچھ آگے ہی نکل پڑے معلوم ہوتے ہیں۔ گوانہوں نے حضرت جامی سے جو بھی تصرف حاصل کیا اسکا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔

نگاہِ حضرت جامی کا فیض ہے خسرو ملا ہے صنفِ غزل میں جو افتخار مجھے

امیر احمد خسرو نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام ''صدف'' میں اُنکی بیشتر موضوعاتی نظمیں ملتی ہیں۔ انہوں نے اردو کے مشہور نظم گو شاعر نظیر اکبرآبادی۔ علامہ اقبال، بابائے قوم گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور لال بہادر شاستری پر طویل نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کا اصلی میدان غزل گوئی ہے۔ وہ کلاسیکل غزل گوئی سے جڑے ہوئے ہیں لیکن عصری حسیت، نئے موضوعات اور مسائل کا بھی انہوں نے اپنی شاعری میں احاطہ کیا ہے اسطرح انکی شاعری میں کلاسیکل شاعری اور موجودہ رجحانات کا حسین امتزاج ملتا ہے ذیل کے اشعار جس کے غماز ہیں۔

سوچتا ہوں کہیں یہ وقت کی سازش تو نہیں کل جو قاتل تھا وہی آج مسیحا کیوں ہے
جو کبھی سارے زمانے کو لئے پھرتا تھا آج وہ شخص زمانے میں اکیلا کیوں ہے
یہ سلگتے ہوئے لمحات یہ جلتے شب و روز ہائے کیا وقت کی رفتار کا اضافہ ہے
جب تک ہو صبح، دل ہی جلاؤ کہ ہر طرف اب بھی جہانِ شوق میں اک تیرگی تو ہے

☆☆☆☆

اب اعترافِ محبت کی کیا ضرورت ہے کہ ہم تمہاری نظر کی زباں سمجھتے ہیں

☆☆☆☆

یہ مدعا نہیں کہ وفا کا صلہ ملے　　بس اتنی آرزو ہے کہ دادِ وفا ملے

مخدوم محی الدین کی مشہور غزل جس کا ایک شعر درجِ ذیل ہے۔

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں　　موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

اسی زمین میں امیر احمد خسروؔ کا شعر ملاحظہ ہو۔

دشتِ ہجراں میں گراں بار خموشی کیوں ہے　　گاؤ خسروؔ کی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے

امیر احمد خسروؔ کی شاعری میں قنوطیت، یاس اور مایوسی نہیں بلکہ رجائیت ملتی ہے

ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

وقت آتا ہے تو تقدیر بدل جاتی ہے　　زندگی موت کے سائے میں بھی پل جاتی ہے

امیر احمد خسروؔ اپنے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

لبِ ہستی پہ مچلتا ہوا اک نغمہ ہوں　　قلبِ گیتی میں دھڑکتا ہوں اک پیار ہوں میں

وقت کی دھوپ میں جلنا میری تقدیر سہی　　اک زمانے کیلئے سایۂ دیوار ہوں میں

شعر میں چاند ستاروں کی سجا کر محفل　　جو اُجالوں کو ترس جائے، وہ فنکار ہوں میں

ذیل کے قطعہ میں خسروؔ نے اپنی حضرت امیر خسروؒ سے نسبت کا یوں اظہار کیا ہے۔

وہ کعبۂ مقصد اس کا رہرو میں ہوں　　وہ مہر منیر، اس کا پرتو میں ہوں

ہمنامی کے فیض سے تعجب کیا ہے　　دہلی کے تھے وہ، دکن کا خسرو میں ہوں

اپنے اسلوب کا منفرد یہ خوش گو شاعر ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۶ء کو مختصر علالت کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔[۱]

......☆☆☆☆☆......

[۱] شخصی انٹرویو از افتخار اقبال برادر خورد امیر احمد خسروؔ مورخہ ۷ر ستمبر ۲۰۰۳

عزیز احمد جلیلی

عزیز احمد جلیلی فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کے صاحبزادے ہیں سنہ 1919ء میں وہ شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم ہائی اسکول سے انہوں نے میٹرک کامیاب کیا۔ سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔[۱] شاعری کا ذوق انکو ورثہ میں ملا۔ دورِ طالب علم سے انہوں نے شعر گوئی شروع کردی مجلّہ عثمانیہ، عالمگیر اور جہانگیر جیسے رسائل میں انکی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انکا شعری مجموعہ ''سوز و ساز'' جو غزلوں پر مشتمل ہے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے ''گیتانجلی'' کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا اور سروجنی نائیڈو کی زائد از ۱۰۰ انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ قاضی نذرالاسلام (جو بنگالی زبان کے شہرہ آفاق شاعر ہیں) کی شاعری کا منظوم ترجمہ کیا۔ رباعیاتِ عمرِ خیام (فارسی) اور خلیل جبران (جو عربی زبان کے مشہور مفکر اور شاعر تھے) انکے افکار کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ انکی شاعری میں دبستانِ لکھنو کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ کلام میں کیف، سرور، نشاط نمایاں نظر آتے ہیں۔ انکے شعری مجموعہ ''سوز و ساز'' میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے شامل ہیں۔ انگریزی کے جن شعراء کا انہوں نے منظوم ترجمہ کیا ہے ان میں شیلی، ولیم ورڈس وتھ، ٹیلی سن اور شیکسپیر وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے سانیٹ بھی لکھے ہیں۔ طویل علالت کے بعد ۶ ر ستمبر سنہ ۲۰۰۲ء کو وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔[۲]

۱۔ عزیز احمد جلیلی کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ مقالہ برائے ایم۔ فل از تہنیت جبین سنہ ۲۰۰۲ء صفحہ ۲۳، ۲۴

۲۔ شخصی انٹرویو از علی احمد جلیلی برادر عزیز احمد جلیلی مورخہ ۵ ر نومبر سنہ ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر علی احمد جلیلیؔ

علی احمد جلیلیؔ استاد سخن فصاحت جنگ جلیل کے صاحبزادے ہیں۔ فصاحت جنگ جلیل آصفِ سابع والئی ریاست حیدرآباد کے استاد تھے۔ اس طرح حضرت جلیلؔ کو شاہی قرب حاصل تھا۔ علی احمد جلیلی نے اپنی خوددار طبیعت کی وجہ اپنے بزرگوار کے اثر ورسوخ کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا اور اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے۔ ڈاکٹر جلیلیؔ ۲۲ر جون ۱۹۲۱ء کو "جلیل منزل" حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] ڈاکٹر جلیلیؔ کا تعلق شمالی ہند کے علماء وفضلاء کے ایک گھرانے سے ہے۔ انکے دادا حافظ عبدالکریم مانک پور (یو۔پی) میں سکونت پذیر تھے۔ وہ نہ صرف حافظ قرآن تھے بلکہ جید عالم اور صوفی منش بزرگ تھے۔ درس وتدریس ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ڈاکٹر جلیلیؔ کے والد جو آصف سابع کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے جن کو آصفِ سابع نے امام الفن اور فصاحت جنگ کے خطابات سے نوازا تھا وہ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو دونوں کے آخری نمائندہ شاعر تھے ذیل میں انکا ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

وہ اپنے عکس کو آواز دے کے کہتے ہیں   ترا جواب تو میں ہوں' مرا جواب نہیں

ڈاکٹر جلیلیؔ کو مکہ مسجد کے مدرسہ حفظ قرآن میں حفظ کے لئے شریک کروایا گیا تھا لیکن وہ اس سعادت سے محروم رہے انکی ابتدائی تعلیم مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۳۴ء میں میٹرک کامیاب کیا۔[۲] ۱۹۳۸ء میں انہوں نے سٹی کالج سے انٹر کیا اور ۱۹۴۰ء میں بی۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔[۳] ۱۹۴۴ء میں بی۔ایڈ کرنے کے بعد محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے ایم۔اے کامیاب کیا۔[۴] رائچور'

۱۔ آبروئے قلم ساویز مورخہ ۱۶ر اپریل ۲۰۰۲ء صفحہ نمبر ۲۵

۲،۳،۴۔ ماہنامہ سب رس ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۶

حیدرآباد، محبوب نگر اور نارائن پیٹ پر وہ بہ حیثیت مدرس اور صدر مدرس کارگذار رہے اور ۱۹۷۰ء میں بہ حیثیت گزیٹیڈ انسپکٹر آف اسکولس کام کرتے ہوئے وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔[۱] انہوں نے محبوب نگر کی ودیا سمیتی آرٹس و سائنس کالج میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک اردو کے لکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔[۲] وظیفہ پر علحدگی کے بعد انہوں نے اپنے والد فصاحت جنگ جلیل پر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔[۳]

جلیل منزل جو ڈاکٹر جلیلی کا پیدائشی مقام ہے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کے حسین امتزاج کا مرکز رہا ہے جہاں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، نکات شعر کے تجزیئے کئے جاتے اور فنِ عروض کے تعلق سے درس دیا جاتا تھا۔ ایسے شاعرانہ اور ادبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہہ سے ان میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا۔ ابتداء میں ان کے والد فصاحت جنگ جلیل نے ان کی شاعری کی ہمت افزائی نہیں کی لیکن بعد میں شاعری کی طرف فطری میلان دیکھ کر نہ صرف انہوں نے ڈاکٹر جلیلی کے کلام کی اصلاح کی بلکہ اصلاح کے دوران زبان و بیان کے حُسن و قبیح اور نکاتِ شعر کی تفہیم بھی کیا کرتے تھے۔ ان تعلیمات کی وجہہ سے ڈاکٹر جلیلی نے فن عروض میں مہارت حاصل کی۔ فصاحت جنگ جلیل نے ''اردو عروض'' کے فن پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جیسے فن عروض پر لکھی گئی کتابوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔[۴] ڈاکٹر جلیلی کی قدیم بیاض میں ان کی پہلی غزل کا جو مطلع درج ہے ملاحظہ ہو۔

معصومیت نے اس کی ستم اور ڈھایا   دل کو مرے چراغ سمجھ کر جلایا

۱۹۳۵ء سے انہوں نے باقاعدہ طور پر شاعری شروع کردی۔ دورانِ طالب علمی میں جب وہ سٹی کالج میں انٹر کے طالب علم تھے پہلا مشاعرہ فانی بدایونی کی صدارت میں پڑھا جس کا انعقاد دارالعلوم ہائی اسکول میں ہوا تھا۔[۵] وہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ جلیل منزل میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتے اور حیدرآباد کی دیگر ادبی محافل میں بھی شریک ہوتے تھے ۱۹۴۰ء میں پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم کی نگرانی میں جامعہ عثمانیہ میں تاریخی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت پرنس معظم جاہ بہادر شجیع (آصفِ سابع کے دوسرے فرزند) نے کی۔ ڈاکٹر جلیلی نے اس مشاعرہ میں اپنی مرصع غزل سنا کر

۱،۲،۳ ماہنامہ سب رس ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۲   ۴،۵ ماہنامہ سب رس ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۷، ۱۸

شرکائے مشاعرہ سے داد تحسین حاصل کی اور پرنس نے ان کی کامیاب غزل پر ان کو انعام سے نوازا۔انہوں نے غزلوں کے علاوہ صنفِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کا کلام مجلّہ عثمانیہ کے علاوہ ہندوستان کے موقر جریدوں ساقی' عالمگیر' ادب لطیف' ادبی دنیا' خیام اور سب رس وغیرہ کے صفحات کی زینت بنا۔حسن عسکری نے ایک شعری مجموعہ ''میری بہترین نظم'' کے نام سے ترتیب دیا تھا جس میں دکن کے مشہور نظم گو شعراء مخدوم محی الدین اور سکندر علی وجد کی نظموں کے ساتھ ڈاکٹر جلیلی کی نظم ''صبح بنارس'' کو بھی شامل کیا تھا۔اس شعری مجموعہ کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر جلیلی کی نظم ''صبح بنارس'' ادبی اور علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔[۲]

آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے ان کا کلام' خاکے' غنائی فیچر' گیت اور تقریریں نشر ہوا کرتی ہیں۔امیر مینائی کی یاد میں ۱۹۴۳ء میں ایک مشاعرہ ساغر نظامی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس مشاعرہ میں ڈاکٹر جلیلی نے امیر مینائی کی خدمت میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

تیری گرد کارواں سے، کارواں پیدا ہوئے کتنے نکتہ سنج' کتنے نکتہ داں پیدا ہوئے [۳]

محبوب نگر میں طویل عرصہ تک بسلسلہ ملازمت ڈاکٹر جلیلی کا قیام رہا۔انہوں نے اپنے دورانِ قیام ادب اور شاعری کی جو شمع فروزاں کی تھی اس کی روشنی سے آج بھی لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔انہوں نے محبوب نگر میں بزم سخن قائم کی تھی۔جس کے زیر اہتمام ماہانہ اور سالانہ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔سالانہ مشاعرے میں حیدر آباد کے منتخبہ شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔محبوب نگر والوں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''جشن جلیلی'' منایا اس جشن کی سرپرستی اس وقت کے وزیر اوقاف و جنگلات جناب ابراہیم انصاری نے کی۔اس جشن کے موقع پر ادبی اجلاس اور عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا اس موقع پر ''اعترافِ فن'' کے نام سے ایک ساونیر کا بھی اجراء عمل میں لایا گیا اور انکو کیسہ زر بھی پیش کیا گیا۔ڈاکٹر جلیلی اچھے افسانہ نویس بھی رہے ہیں اور انہوں نے مغربی زبانوں میں لکھے گئے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

ذیل میں ان کے شعری اور تنقیدی مجموعے معہ سنہ اشاعت درج کئے جاتے ہیں۔

۲'۳'۱ ماہنامہ سب رس ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۱۸'۱۷

۱۔ نقشِ قدم (شاعری) ۱۹۷۰ء ۲۔ شہرِ تمنا (شاعری) ۱۹۷۷ء
۳۔ اندھیرے اجالے (شاعری) ۱۹۸۱ء ۴۔ مکاتیب جلیل ۱۹۸۲ء
۵۔ نئی غزل میں منفی رجحانات (تنقید) ۱۹۸۴ء ۶۔ کائناتِ جلیل ۱۹۸۵ء
۷ منظر منظر (شاعری) ۱۹۸۷ء ۸۔ اردو کا عروض ۱۹۹۲ء
۹۔ فصاحت جنگ جلیل (تنقید) ۱۹۹۳ء
۱۰۔ بت خانۂ خلیل (تنقید) ۱۹۹۴ء
۱۱۔ لہو کی آنچ (شاعری) ۱۹۹۶ء ۱۲۔ نقد و نگاہ (تنقید) ۱۹۹۷ء [۱]
۱۳۔ اردو لغات تلفظ ۱۴۔ اردو غزل پر ہندی کے اثرات

ان کی تصانیف اور شعری مجموعوں پر مختلف اکیڈیموں اور ادارۂ جات نے انعامات و اعزازات سے ان کو نوازا[۲]۔ ڈاکٹر جلیلی نے ترقی پسند تحریک کا عروج و زوال' ارباب ذوق کے ادبی نظریات اور پھر ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ابھرنے والی جدیدیت کے رجحان جیسے مختلف افکار کا مشاہدہ کیا۔ حضرت جلیل سے ان کو فنِ شاعری کی تربیت ملی اور وہ فنِ شاعری کے سارے رموز سے آشنا ہوئے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تیز اور تند مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے عروض کی تمام پابندیوں کو ملحوظ رکھا لیکن ان تحریکات اور رجحانات کی وجہ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ضرور پیدا ہوا اور انہوں نے اپنی شاعری میں عصری حسیت کا احاطہ کیا اور ان کی شاعری میں سماجی' سیاسی' معاشی اور اخلاقی مسائل در آئے۔ ان کے کلام میں قدیم دبستان اور جدید فکر و لہجہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں انہوں نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن جوش نے طویل اور جلیلی نے مختصر نظمیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر جلیلی کی نظمیں جدید مغربی نظموں کی طرح مرکزی خیال کے گرد گھومتی ہیں۔ انہوں نے اپنی عشقیہ نظموں میں محبت کے جذبات و احساسات' ہجر و فراق کی کیفیات اور حسن و جمال کی حکایات کا احاطہ دلکش انداز میں کیا ہے۔ وہ اپنی نظم ''مجبوری'' میں اپنے محبوب کی رخصتی کے منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

---

[۲] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں شاعروں اور مصنفین کی ڈائری سنہ اشاعت ۲۰۰۰ء صفحہ نمبر ۲۹۵

وہ میری بھیگی نگاہوں میں حرفِ مجبوری   وہ ترے خشک لبوں پر سکوتِ مجبوری

نظم ''کل رات کو'' میں انہوں نے جو منظر کشی اور پیکر کشی کی ہے قابل دید ہے اس نظم میں بھی وہ جوشؔ کے مخصوص رنگ سے متاثر نظر آتے ہیں اس نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ذرہ ذرہ مثل مہ تھا ضوفشاں کل رات کو   نور سے معمور تھا کون و مکاں کل رات کو

کرر ہے تھے بام و در سرگوشیاں کل رات کو   سب کو استعجاب تھا اس کی میری یکجائی پر

جلیلی کی ایک نظم ''افق کے پار'' جو زبان و بیان کی سلاست کا نمونہ ہے اس نظم میں اختر شرانی کی نظم گوئی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

افق کے پار سنتے ہیں اک رنگین دنیا ہے

وہ دنیا چاند تاروں کے نظاروں سے بھی آگے ہے   یہاں سے دور وہ دنیا ستاروں سے بھی آگے ہے

وہ بستی پھول سے آباد ہے کانٹوں سے خالی ہے   وہ بستی اپنی اس دنیا کی بستی سے نرالی ہے

تبسم کھیلتا پھرتا ہے رنگیں مرغزاروں میں   ترنم رقص کرتا ہے وہاں کے آبشاروں میں

مختلف تحریکات اور رجحانات کی وجہ سے نظم گوئی میں نت نئے تجربے کئے گئے ایسی کوششوں کی قیادت کا سہرا میرا جی کے سر جاتا ہے جن سے متاثر ہو کر جلیلی نے بھی ''بلینک ورس'' اور فری ورس'' میں بھی چند نظمیں لکھیں جو میرا جی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں اس فکر سے متاثرہ پہلی نظم ''آوارگی'' لکھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ جو شاعر کے قلبی کرب کو ظاہر کرتا ہے ملاحظہ ہو۔ ع

مسکراتی کاش وہ آنکھیں نہ مجھ کو دیکھ کر

انکی ایک رومانی نظم ''دورِ اُفق پر'' کے اشعار اور ان میں برتی گئیں تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

اُٹھی لال شفق کی دھاری لے کر پیلے بادل   دورِ افق پر سورج اُٹھا' سمٹا رات کا آنچل

بہکی بہکی چال کہ جیسے لچکے ڈالی کومل   وہ اندھیارے گھاٹ پہ آئی اک البیلی ناری

نظم ''روپ وتی'' میں انہوں نے حسن و جمال کو جو خدا کی عطا کردہ نعمت غیر مترقبہ قرار دیا ہے لیکن حسین و جمیل دو شیزاؤں کو بعض وقت پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا

ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نظم میں ایک حسین وجمیل دوشیزہ کی اس کے حسن وجمال کی وجہ سے پریشانی کی عکاسی کی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کاش نہ ہوتی روپ وتی میں ۔۔۔ گورا میرا رنگ نہ ہوتا
مد میں ڈوبے نین یہ میرے ۔۔۔ چھلکے چھلکے جام نہ ہوتے
بادل جیسے بال یہ میرے ۔۔۔ مئے خانہ کی شام نہ ہوتے

اس نظم میں انہوں نے اچھوتی تشبیہات اور مترنم بحر کے علاوہ ہندی الفاظ کو بڑی عمدگی سے برتا ہے۔

ڈاکٹر جلیلی نے سیاسی' معاشرتی' سماجی اور مسائلی موضوعات کا اپنی نظموں میں احاطہ کیا ہے۔ اکثر ترقی پسند تحریک سے متاثر شعراء نے کمیونزم کی ترویج کو اپنا مقصدِ شاعری بنالیا تھا اور ان کی شاعری میں نعرہ بازی بھی در آئی تھی اور داخلی موضوعات پر توجہ نہیں دی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر جلیلی کی نظمیں ان عیوب سے پاک ہیں۔ مسائلی اور سیاسی نظموں میں انہوں نے علامت نگاری اور ایمائیت سے کام لیا ہے جس کی وجہ ان کے کلام میں ڈرامائی انداز پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی نظم ''اندھیرے اجالے'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آج افراد کے سمندر میں ۔۔۔ فرد کی ذات کھوئی کھوئی ہے
جاگتی سر زمیں کی چھاتی پر ۔۔۔ اس کی سنتان سوئی ہوئی ہے
چھین لیں گے چراغ نظروں کے ۔۔۔ ان چراغوں سے فائدہ کیا ہے
جن کا ہر پھول ہے خزاں دیدہ ۔۔۔ ایسے باغوں سے فائدہ کیا ہے

مشہور صحافی قاضی عبدالغفار سابق ایڈیٹر ''پیام'' ڈاکٹر جلیلی کی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں ''علی احمد جلیلی نواب فصاحت جنگ بہادر کے صاحبزادہ ہیں اس لئے وراثتاً مذاق سخن میں ان کا حصہ مسلم ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے سند حاصل کی ہے اور قدیم شاعری کے جوہر سے مستفید ہوکر جدید شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان ربط قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خیال اور بیان کی قدامت اور فرسودگی سے اپنے ذوقِ سخن کو بلاشبہ آزاد کرالیا ہے۔''

اردو ادب کی صنف غزل میں دردِ دل کے اظہار کا سلیقہ زیادہ ہے ڈاکٹر جلیلی

جنہوں نے نہ صرف غزل گوئی کی ہے بلکہ اس صنف کے گیسوؤں کو سنوارا ہے اور اس کو نکھارنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے کہتے ہیں۔

فائدہ یہ بھی علی اک ہے غزل گوئی کا درد دل اس میں سلیقہ سے ادا ہوتا ہے

انہوں نے غزل گوئی میں عروض کے سارے لوازمات کو برتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے عہد حاضر کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور نئے نئے مضامین اور موضوعات کا احاطہ کیا۔ انہوں نے غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کو بھی پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر جلیلی کی غزل گوئی کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں۔ ''اگر علی احمد جلیلی صرف درد دل اور سلیقۂ ادائیگی تک اپنی غزل کو محدود رکھتے تو غالباً عہد جدید کے مفکر قرار دئے جاتے۔ ان کی غزلوں میں خوشی کی بات ہے کہ عصر جدید کی کروٹوں کا بھی بھر پور احساس ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر جلیلی جنکا قدیم دبستان اردو سے تعلق ہے لیکن انہوں نے ماضی کی روایات کے ساتھ عصری حسیت کو بھی پیش نظر رکھا انہوں نے جدید انداز فکر کو اپنایا ضرور لیکن ماضی کی روایتوں سے انحراف نہیں کیا۔ اس طرح قدیم اور جدید امتزاج کو انہوں نے برقرار رکھا۔ اپنی شاعری کے تعلق سے وہ خود رقم طراز ہیں ''قدامت کی جگہ جدت یقیناً قابل تعریف ہے لیکن میرے سامنے غزل کا ماضی بھی ہے اسکی روایت بھی اور اسکے امکانات بھی۔ روایات کو بدلنا اور روایات سے کام لینا علحدہ چیزیں ہیں۔ نیا پن پرانے پن کی کوکھ سے جنم لیتا ہے من وسلویٰ کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ اس پس منظر میں' میں جدید شاعر نہیں ہوں جدید عہد کا شاعر ہوں۔'' ڈاکٹر جلیلی نے اپنی ابتدائی غزلوں میں بھی روایتی مضامین کو جدید اسلوب کے پیراہن سے ملبوس کیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ کیسی بزم میں ہم آج لائے جاتے ہیں جہاں چراغ نہیں دل جلائے جاتے ہیں
اب چھلکتے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے بعد توبہ کے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے
ہم نے دیکھا ہے زمانہ کا بدلنا لیکن ان کے بدلے ہوئے تیور نہیں دیکھے جاتے

ڈاکٹر جلیلی کی بعد کی غزلوں میں احساس کی شدت اور مشاہدے اور فکر کی پختگی نمایاں نظر آتی ہے ان غزلوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند شعراء کے بر

خلاف ان کے استعمال کردہ استعاروں کی معنویت میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نشیمن ہی کے ٹوٹ جانے کا غم ہوتا تو کیا تھا　　یہاں تو بیچنے والوں نے گلشن بیچ ڈالا ہے
کیا اسی واسطے سینچا تھا لہو سے اپنے　　جب سنور جائے چمن، آگ لگادی جائے
تبصرہ بعد میں قتل پہ ہوسکتا ہے　　پہلے یہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے
سب پوچھتے ہیں مجھ سے مرے آشیاں کا حال　　میں سب سے پوچھتا ہوں کہ گلشن کا کیا ہوا

انکا شعری سفر طویل عرصہ تک جاری رہا اور اس سفر میں مرحلہ وار ارتقاء نمایاں ہوتا ہے انکی شاعری میں مزید تغیرات سامنے آتے ہیں، نئے استعارے بھی ملتے ہیں اور جدید غزل کی لفظیات کا خوبصورت استعمال بھی سامنے آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے زندگی کا گرد سے چہرہ اٹا ہوا　　جیسے کوئی غریب مسافر تھکا ہوا
پانی کا انتظار ہی کرتی رہی زمیں　　بادل سمندروں پہ برس کر نکل گئے
اماں جس پیڑ سے مانگی ہے　　ہر اک ڈالی برہنہ ہوگئی ہے
رستے سب سنسان پڑے ہیں　　اک پھرتا ہے قاتل تنہا

درج بالا اشعار میں ڈاکٹر جلیلی نے خلاقانہ ذہانت اور فنکارانہ چابکدستی سے موجودہ سیاسی حالات پر بھرپور طنز کیا ہے۔ انکی شاعری میں الفاظ اور بیان کی شوکت تو نہیں ملتی لیکن ان کے منفرد اسلوب میں سلاست اور لطافت پائی جاتی ہے جسکے اثرات آہستہ آہستہ دل و دماغ پر نمودار ہوتے ہیں۔ زبان کی لطافت، خیال کی نزاکت، تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور خاص لہجہ جس میں برجستگی اور بے ساختگی موجود ہے انکے کلام کی رنگینی میں اضافے کا وسیلہ ہے۔ ذیل کے اشعار میں شانِ تغزل ملاحظہ ہو۔

ایک خوشبو سی اتر آئی ہے آنگن آنگن　　جھانک کر کون دریچے سے صدا دیتا ہے
اف یہ اجالا رخساروں کا　　ان صبحوں کی شام نہیں ہے
تری زلف کے پیچ و خم اللہ اللہ　　ہر اک موڑ پر رات ٹھہری ہوئی ہے
تبسم پہ یہ کس نے پھول پھینکے　　مری ہر آواز مہکی ہوئی ہے

ایک نقاد نے شاعری کے تعلق سے کہا ہے شاعری تاج محل بھی ہوسکتی ہے اور قبر

بھی فرق صرف لفظوں کے برتنے کا ہے اور ڈاکٹر جلیلی اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ شعری فکر ان کو ورثہ میں ملی ہے اور انکی شبانہ روز محنتوں نے شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔ مشہور شاعر عزم نے اپنے ایک شعر میں اسکی یوں وضاحت کی ہے۔

جو حقیقت میں ہیں فنکار وہ ہیں گنتی کے ان گنت یوں تو ہوئے عزم غزل خواں پیدا

جلیلی نے ہندی کے اثرات کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے جس کے ذریعہ انہوں نے تنقیدی اور تحقیقی میدان میں بھی قدم رکھا ہے اردو داں طبقہ کے لئے حال ہی میں انہوں نے ''لغت اردو تلفظ'' تحریر کی۔ علم عروض پر انکی کتاب ''اردو کا عروض'' شائع ہو چکی ہے اسی طرح تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نقد و نگاہ'' اور ''بت خانۂ خلیل'' شائع ہو چکے ہیں۔ غرض شاعری کے علاوہ نثر میں تحقیق، تنقید، علمِ عروض اور لغت نویسی کے ذریعہ علی احمد جلیلی نے اپنی انفرادی حیثیت بنائی ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ انکا مقام و مرتبہ ایک شاعر کی حیثیت سے کافی بلند ہے اور انہیں حال ہی میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے ''مخدوم ایوارڈ'' کے اعزاز سے بھی نوازا گیا جس سے انکے شاعرانہ کمالات کی زندگی میں ستائش کا ثبوت ملتا ہے اور ایک شاعر کیلئے یہ اعزاز بھی بہت کچھ ہے۔

ڈاکٹر جلیلی کا حلقہ تلامذہ کافی وسیع ہے۔ ان کے اصلاح دینے کے طریقہ میں ندرت ہے۔ وہ علامہ نجم آفندی کی طرح اصلاح دیتے تھے شاعر کے خیالات کو تبدیل نہ کرتے ہوئے معمولی سی رد و بدل سے شعر میں نکھار پیدا کر دینا ڈاکٹر جلیلی کی اصلاح کی خصوصیت تھی۔

خانوادہ فصاحت جنگ جلیل کی یہ شمع جس کی روشنی سے حیدرآباد اور محبوب نگر میں سینکڑوں لوگوں نے روشنی حاصل کی بتاریخ ۱۳؍اپریل ۲۰۰۵ء کو گل ہوگئی، اور ان کو احاطہ مسجدِ الٰہی چادر گھاٹ (حیدرآباد) میں سپردِ خاک کیا گیا۔

طالب رزاقی

طالب رزاقی یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد کے ایک مشائخ گھرانے میں پیدا ہوئے۔[1] طالب رزاقی کا پورا نام سید محمد قطب الدین حسین ہے اور وہ طالب تخلص کیا کرتے تھے ادبی حلقوں میں طالب رزاقی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

ان کے والدالحاج شاہ محمد یوسف قادری کا تعلق لکھنو سے تھا اوران کی والدہ حیدرآبادی تھیں۔ان کے والد اپنے وقت کے معروف مجتہد عالم، اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ طالب رزاقی مشہور عالمِ دین مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدیر ''صدق'' کے بھتیجے تھے۔[2] طالب رزاقی نے ایک علمی اورادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ انکی اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم انکے والد کی نگرانی میں گھر ہی پر ہوئی۔ شعر گوئی کی ابتداء ۱۸ برس کی عمر سے ہوئی۔ انہوں نے شاعری کی ابتداء صنفِ غزل سے کی۔ حضرت فانی بدایونی سے ابتداء میں اصلاح لی۔ فانی بدایونی کے انتقال کے بعد علامہ حیرت بدایونی سے بغرض اصلاح کلام رجوع ہوئے۔[3] انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر صنفِ غزل سے وابستگی والہانہ رہی ہے۔ طالب رزاقی چار برس تک جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

طالب رزاقی پختہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے۔ روایتی شاعری کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ادب کی جدید تحریکات خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک سے وہ متاثر تھے۔ عروض وقواعد پر عبور، روایتی شاعری کی پاسداری اور پھر ترقی پسند تحریک کے اثر سے انکی شاعری کو وقار واعتبار اور بڑھا وا ملا۔ کلام دلکش، شگفتہ اور پُر اثر تھا، ان کے مخصوص ترنم سے سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ انکے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع ہے۔

۳،۱ امجد سے شاذ تک پیش کش روزنامہ ''سیاست'' ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱۴ ۲ نوائے طالب ۱۹۷۹ء صفحہ ۱

طالبؔ رزاقی کی شاعری کے تعلق سے اختر حسین سابق اسسٹنٹ سکریٹری اردو اکیڈیمی اے۔ پی نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے ''طالب کی شاعری کے رگ و پے میں، زندگی کے سوز و ساز کی جو لہریں کارفرما ہیں وہی انکی آواز اور انکے لہجہ میں ایک گہری شاعرانہ دردمندی کی لے بن کر، انکے پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور غالب کے اس مصرع کی تفسیر بن جاتی ہے کہ ع

''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' اور شاید اچھے شعر کی سب سے اچھی تعریف بھی یہی ہے کہ اس کا سننے اور پڑھنے والا یوں محسوس کرے کہ جیسے یہ تو اس کی اپنی چیز ہے'' لے

طالبؔ رزاقی کو زبان اور بیان پر دسترس حاصل تھی انکے کلام میں دل کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور ماحول کی عکاسی بھی۔ زندگی کی تلخیوں سے انہیں گہری وابستگی تھی۔ غزلوں میں درد، کسک اور تڑپ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ کلام سلیس، شگفتہ اور اس میں روانی ہے۔ انکا کلام آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوتا تھا ہندوستان کے بڑے مشاعروں میں بھی وہ اپنا کلام سنا کر سامعین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مخصوص ترنم میں اور ڈوب کر وہ اپنا کلام سناتے اور سننے والوں پر چھا جاتے تھے۔ انکی رائے میں ''شاعری دنیائے ادب کی عمیق مگر روشن ترین حقیقت ہے شعر کی حقیقت و ہیئت پر بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے روح کی کوئی مرئی تعبیر پیش کرنا۔ شعر، ذہن و دماغ کی اس کاوش کا نتیجہ ہے جو تخیلِ جذبہ، احساس اور وجدان کی ہم آہنگی سے نغمہ کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ شاعر میں یہ صلاحیتیں قدرتاً ودیعت ہوتی ہیں''۔

یہ شاعرِ خوش گو مہلک مرض کینسر میں مبتلا ہو کر ۵۵ سال کی عمر میں ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۷۵ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ یکم جنوری ۱۹۷۶ء یاقوت پورہ شیخ فیض کی کمان کے قریب واقع قبرستان میں بادیدۂ تر سپردِ خاک کیا گیا۔ ۲ے

اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور ذاتِ رسالتمآبؐ رحمۃ العالمین ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ وہ شخص بہتر ہے جسکے اخلاق بہتر ہوں۔ اسوہ نبوؐی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ

لے ''حرفِ چند'' از اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

۲ے امجد سے شاذ تک پیش کش روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۱۵

آپؐ نہ صرف مجسم اخلاق بلکہ معلم اخلاق بھی ہیں۔ آپ نے زندگی کے ہر موڑ پر اخلاق کا درس دیا ہے۔ ماضی کا کیا ذکر موجودہ عہد میں بھی فاتح فتح کے نشہ میں کیا کیا نہیں کرگزرتا لیکن آپ نے فتح مکہ کے موقع پر جو فیاضانہ سلوک دشمنانِ اسلام کے ساتھ برتا ہے وہ تاریخ کا ایک سنہری ورق ہے۔ اسی تعلق سے طالبؔ رزاقی کہتے ہیں۔

زمانہ فتحِ مکہ کو نہ بھولا ہے نہ بھولے گا　　لیا بدلہ نہ دشمن سے یہی فاتح کی عظمت تھی

اپنے ظرف اور حوصلہ کے تعلق سے طالبؔ رزاقی کہتے ہیں۔

بس یہی ہے ظرف میرا، بس یہی ہے حوصلہ　　بے خودی میں مثلِ پیمانہ چھلک جاتا ہوں میں

پرانی ضرب المثل ہے ''جس نے ایڑ لگائی وہ خندق کے پار تھا'' اسی موضوع کو دلکش انداز میں انہوں نے نظم کیا ہے۔

پار اترے جن کی ہمت تھی بلند　　ہم لبِ ساحل ٹھٹھک کر رہ گئے

وجود کائنات اور اسرارِ کائنات کے تعلق سے انسانی فہم اور علم کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

کھل سکے طالبؔ نہ اسرارِ حیات　　اہلِ دانش سر پٹک کر رہ گئے

طالبؔ رزاقی کہتے ہیں کہ ذات خداوندی، قادرِ مطلق اور بندہ، مجبورِ محض ہے۔ بشریت کا تقاضہ غلطی کے ارتکاب کا سبب بنتا ہے۔ وہ رب العالمین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ وہ بُرے ہوں یا بھلے لیکن بندۂ ذات باری ہیں۔

بُرا ہے یا بھلا ہے، بندہ پرور　　یہ طالبؔ آپ کا ہے بندہ پرور

خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرنے کیلئے سعی پیہم کی ضرورت ہوتی ہے عمل ہی سے زندگی بنتی ہے۔ وہ نوجوانانِ ملت میں اسی جذبہ کو فروغ دینے کیلئے کہتے ہیں۔

وہ قافلے جو اپنی جسارت کے بل گئے　　آگے نکل گئے بہت آگے نکل گئے

اس شعر میں طالبؔ رزاقی کہتے ہیں کہ غمِ حیات سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ اس سے مفر ممکن نہیں۔

غمِ حیات کو جی بھر کے پیار کر لینا　　یہ جبر، جبر سہی اختیار کر لینا

موجودہ معاشرہ اور عہدِ حاضر کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

انسانیت پہ جن کو بڑا ناز تھا کبھی　　افسوس ہے کہ آج وہ انساں بدل گئے

طالب رزاقی رجائیت پسند تھے وہ کہتے ہیں کہ خزاں رسیدہ چمن میں بہار لے آئینگے اس وقت تک انکا انتظار کیا جائے۔

خزاں رسیدہ چمن میں بہار لے آؤں تم اُتنی دیر میرا انتظار کر لینا

وہ وقت کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گذرا وقت واپس نہیں آتا۔

تجھے اتنا میں بتادوں اے اسیرِ آشیانہ کبھی لوٹ کر نہ آیا جو گزر گیا زمانہ

اپنے انتقال سے دو ہفتے قبل انہوں نے آخری غزل کہی تھی اسکے ایک شعر میں وہ عہدِ حاضر کے مقتدر ممالک جو امن کے نام پر جنگ مسلط کرتے ہیں اُن پر طنز کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

نقشۂ جنگ سے ہٹنے نہیں پائیں نظریں امن کے نام یہ تلوار کھینچی رہتی ہے

حیدرآباد کے مشہور غزل گو شاعر شاہد صدیقی کے انتقالِ پُر ملال پر طالب رزاقی نے اپنے اندوہناک غم کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

ساقی سے کوئی طالبِ مئے اب سے نہ ہوگا
اک ایسا جہاں کے لئے غم چھوڑ رہا ہوں

سلیمان اریب

حیدرآباد کی شعری اور ادبی دنیا میں مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، شاذ تمکنت، شاہد صدیقی اور سلیمان اریب روشن مینار کی اہمیت کے حامل ہیں جن کی روشنی سے آنے والے شعراء اپنے شعری سفر کے تعین کرنے میں استفادہ کریں گے۔ سلیمان اریب کا پورا نام محمد بن سلیمان اور اریب ان کا تخلص تھا لیکن انہوں نے سلیمان اریب کے نام سے شہرت پائی۔ وہ ۵/اپریل ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] اوائل زندگی سے شعر گوئی کی طرف مائل رہے لیکن ۱۹۴۲ء سے ان کی شعر گوئی میں با قاعدگی پیدا ہوئی۔ ابتداء میں نثر نگاری کی طرف رجحان تھا چنانچہ وہ افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھا کرتے تھے۔ اردو ادب کی صنفِ شاعری کی طرف ابتدا ہی سے ان کی طبیعت کا میلان رہا اور انہوں نے نثر نگاری کے سلسلہ کو ترک کر کے شاعری میں ہمہ وقتی دلچسپی لینی شروع کی۔[۲]

۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک کا ارتقاء عمل میں آیا یہ وہ دور ہے جب ان کی شاعری نکھر رہی تھی۔ سلیمان اریب ترقی پسند تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ اس تحریک کے پروان چڑھانے میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک سے ادب میں موضوعات کا تنوع پیدا ہوا۔ سلیمان اریب کا لباس، ان کی گفتار اور ان کی فکر ترقی پسند تحریک کی مظہر تھی۔ ان کی تحریک سے اٹوٹ وابستگی رہی انہوں نے تحریک کا بھرپور ساتھ دیا انقلابی نظمیں لکھنے کی پاداش میں جیل کی مصیبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار ''مجاہدِ تلنگانہ'' نظم لکھنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور دو برس جیل کی سزا کاٹی۔[۳] رہائی

۱،۲،۳۔ امجد سے شاذ تک سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۳ صفحہ نمبر ۱۹

کے بعد امن کمیٹی اور انجمن عوامی مصنفین قائم ہوئی اور انہوں نے ہر دو اداروں کی بہ حیثیت معتمد خدمت انجام دی ۱۹۵۲ء میں طلباء کی ہڑتال کے دوران وہ پھر گرفتار کر لے گئے اور ۲ ماہ کے بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔[۱]

مختلف ادبی رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے چنانچہ ۱۹۴۸ء میں ہفت روز ''جمہور'' ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ ''چراغ'' اور ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ ''سب رس'' کے وہ مدیر رہ چکے ہیں۔[۲] ۱۹۵۵ء میں انہوں نے ماہنامہ ''صباء'' اپنی ادارت میں جاری کیا جس کا سلسلہ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔[۳] اس رسالہ کا معیاری رسائل کی صف میں شمار ہوتا تھا جو نہ صرف حیدرآباد بلکہ برصغیر میں مقبول رہا۔ سلیمان اریب نہ صرف بلند پایہ نثر نگار اور شاعر تھے بلکہ وہ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔

سلیمان اریب نے اردو شاعری کی اصناف نظم اور غزل ہر دو میں طبع آزمائی کی ہے ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وجہہ سے حیدرآباد میں روایات سے گریز اور اجتہاد پسندی کے رجحانات سے بیشتر قلم کار متاثر ہوئے اور اس تحریک کے اثر سے جو تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں مخدوم محی الدین کے بعد سلیمان اریب نمایاں نظر آتے ہیں۔ سلیمان اریب نہ صرف حیدرآباد میں منعقد ہونے والے بیشتر مشاعروں میں مدعو کئے جاتے تھے بلکہ انہوں نے متعدد کل ہند مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے۔ سلیمان اریب کا پہلا شعری مجموعہ ''پاسِ گریباں'' ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اریب کا دوسرا اور آخری شعری مجموعہ ''کڑوی خوشبو'' ان کے انتقال کے تین سال بعد آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر آیا جس میں ان کے سارے کلام کو محفوظ کر دیا گیا ہے اس مجموعہ کی اشاعت سے اریب کے کلام کو زمانے کے دست برد سے بچا لیا گیا جو ایک اہم ادبی خدمت ہے قاری اس مجموعہ کے مطالعہ سے ایک عہد کی سماجی و سیاسی پس منظر میں ادبی تحریکات کے مختلف موڑ اور ترقی پسند شاعری ادبی تحریکات اور جدیدیت کے اثرات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ یہ مجموعہ دو تین دہوں کی فکر شعر اور فن کا احاطہ کرتا ہے۔

سلیمان اریب اس سماج کے مخالف تھے جس سماج میں انسان کا استحصال ہوتا تھا

[۱،۲،۳] امجد سے شاذ تک سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۳ صفحہ نمبر ۱۹

ان کی شاعری کے موضوعات انسان کی عظمت، درد و غم کی کسک اور زندگی سے پیار کا احاطہ کرتے ہیں۔ سلیمان اریب شاعری کو عروض کے لباس میں ملبوس رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اچھے لباس اور اچھے زیور سے آراستہ دلہن کا حسن نکھر جاتا ہے لیکن وہ ان پابندیوں کو شاعری اور اظہار خیال کی راہ میں حائل بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ''مجاہد تلنگانہ'' اور ''انسان نہیں مرسکتا'' ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ ان کی آخری نظم ''کڑوی خوشبو'' ہے جو انہوں نے انتقال سے کچھ دن پہلے کینسر ہاسپٹل میں لکھی تھی۔

یہ جدید لہجہ کا شاعر جس کی شاعری ارضِ دکن میں برسوں گونجتی رہی۔ ۸ر سپٹمبر ۱۹۷۰ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ ان کو کینسر جیسا موذی اور جان لیوا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ انہوں نے زندگی کی صرف ۴۸ بہاریں دیکھیں۔ ان کا انتقال کینسر ہاسپٹل میں ہوا اور ان کو خیریت آباد کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔[1] شاید ایسی ہی ہستیوں کی موت پر امیر مینائی نے کہا تھا۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے　　　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ذیل میں سلیمان اریب کی نظموں کے بند درج کئے جاتے ہیں جس میں تشبیہات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ سلاست، شگفتگی اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔

تیرے ہونٹوں سے ملا نطق کو میرے اعجاز　　　تیری بانہوں سے ہے پیدا میری نظروں میں گداز
کیا کہوں کیا ہے تصور تیری انگڑائی کا؟　　　عرش و کرسی سے پرے ہوتی ہے میری پرواز

ان اشعار میں اریب نے اپنی پرواز کو عرش کی کرسی سے آگے بتا کر خیال کی آزادی کی نمائندگی کی ہے اس پر مذہب پرستوں کو بلاشبہ اعتراض ہوسکتا ہے۔

ذیل کے بند میں انہوں نے فیض احمد فیض کے مصرعے ''تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے'' سے استفادہ کیا ہے۔

جس طرف بھی میرے اللہ نظر کرتا ہوں　　　''تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے''
جانے کیا بات ہے کیوں زلفِ چلیپا کی طرح　　　زندگی ہے کہ الجھتی ہی چلی جاتی ہے

ان اشعار میں زندگی کو مزید پیچیدگیوں میں الجھنے کی نشاندہی کی گئی اور شاعر کا احساس ہے کہ وہ جس قدر زندگی کو سلجھانا چاہتا ہے اس قدر وہ محبوب کی زلفوں کی طرح

[1] امجد سے شاذ تک سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست حیدرآباد۔ ۱۳ صفحہ نمبر ۲۰

الجھتی چلی جاتی ہے۔

ذیل میں سلیمان اریبؔ کی غزلوں کے چند اشعار درج کیئے جاتے ہیں۔ ان کی ایک غزل مسلسل سے دو اشعار پیش کیئے جا رہے ہیں جس میں وہ اپنی مئے خواری کا ذکر کرتے ہیں۔

بے پیئے ہی جھوم جائیں اک بار	دیدۂ سرشار کی باتیں کریں
حافظ و غالب ہوں یا جوشؔ و اریب	ہاں کسی مئے خوار کی باتیں کریں

سلیمان اریبؔ نے کسی میخوار کی بات تو کی ہے لیکن اس کی جانب اشارہ کر کے اپنے دامن کو جس انداز سے بچایا ہے وہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں اریب پیار و محبت سے زندگی کی لذتوں کو دوبالا کرنے کا گر بتاتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ گذر جائے نہ یہ لمحہ کہیں	آ کہ ہم پیار کریں زیست کو کر نے رنگیں

ہر لمحہ کو پیار سے رنگین کر کے زندگی گذارنے کا انداز اریبؔ کی شاعری میں حسین بیان کی نمائندگی کرتا ہے۔ ذیل میں درج کیئے ہوئے شعر میں وہ ذاتِ باری سے مخاطب ہیں۔

گر تو برا نہ مانے اک بات تجھ سے پوچھوں	احساسِ عشق تجھ میں ہے کس کا آفریدہ

حالیؔ نے ''دیباچہ مسدس'' میں اپنی روایتی شاعری میں موجود حسین حقائق کا ذکر کیا ہے اس کا پرتو اریب کے اس شعر میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی زمین میں اریب کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مریں بھی تو کیا جب جیا جائے نا	کہ اب زہر بھی تو پیا جائے نا
وہ حسنِ مجسم ہے اے دوستو	اُسے نام خاطر جیا جائے نا
اک اشکِ چکیدہ میری کائنات	یہ تحفہ بھی اس کو دیا جائے نا

محمد قلی نے محبوب کے بغیر پیالہ نہ اٹھانے کا ذکر کیا تو اریبؔ نے زندگی کو زہر سے تعبیر کرتے ہوئے ایسا زہر پی پی کر مرنے اور جینے کا تصور پیش کیا ہے جس سے ان کے عہد کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ذیل کے شعر میں اریب مذہبی رہنماوں پر گہری چوٹ

کرتے ہیں۔

جو پھولوں کے بھی تاجر ہیں جو کانٹوں کے بھی تاجر ہیں　　دُکانِ مذہب و ملت سجانے میں جو ماہر ہیں

سلیمان اریب ملک میں ہونے والے فسادات سے ملولِ خاطر ہیں "مرگِ انسانیت" کے عنوان سے ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیسے گل اور کہاں کا نشیمن　　ایک آتش کدہ گلستاں ہے

موت لاشوں پہ ہے رقص فرما　　اُف یہ کیسا بھیانک سماں ہے

کوئی ہندو ہے کوئی مسلماں　　کس سے پوچھوں میں انسان کہاں ہے

ان اشعار میں اریب نے وجود انساں کے ترقی پسند فلسفہ کی نشاندہی کی ہے جسکے مطابق مذہب کی جکڑ بندیوں اور تفریق سے آزاد ایک وسیع المشرب اور وسیع القلب وجود کو انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

ذیل میں اریب کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے جس کے پڑھنے سے فارسی ادب کے نامور شاعر حافظ کی بادہ نوشی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

پھر حافظ و غالب کو جوانی دے دوں　　خیام کو پھر قالب ثانی دے دوں

اک پل کے لئے جو خدا ہو جاوں　　دنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

ان اشعار سے اریب کی حقیقت پسندی کے بجائے مے پسندی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی ناپسندیدہ شہ کو انسانوں پر لازم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ خدائی کے بغیر بھی یہ کام ممکن ہے پھر خدا ہونے پر دنیا کو انگور کا پانی دینا چہ معنی دارد۔ اسے شاعر کی نازک خیالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں سلیمان اریب کا ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جس سے ان کی رجائیت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔

رات کے ڈوبتے تاروں نے یہ بتلایا مجھے　　رات کتنی ہی بڑی رات ہو، ٹل جاتی ہے

گر کوئی چاہے تو زنجیر درازِ ظلمت　　نورِ خورشید کی شمشیر میں ڈھل جاتی ہے

آس اور امید ہی انسان کا بہترین سہارا ہے اور اریب نے ان اشعار میں علامتوں اور اشاروں کے ذریعے جس بلیغ کیفیت کو نمایاں کیا ہے وہ بذات خود انسان کی زندگی کا حاصل ہے۔ ذیل کے شعر میں انہوں نے رات کی سیاہی کو صبح کی پہلی کرن کے

ساتھ شکست کھاتے ہوئے بتایا ہے جس سے ان کی رجائیت پسندی کا اظہار ہوتا ہے ۔

اگرچہ رات مسلسل سیاہی ہوتی ہے یہ کس کی جیت ہے وہ دیکھ صبح ہوتی ہے

اریب نے اپنی شاہکار نظم ''مجاہدِ تلنگانہ'' میں مذہب کے نام نہاد ٹھیکے داروں اور حکامِ وقت پر بھرپور طنز کیا ہے ۔

تیرے خیال سے ظل الہٰ کی گم آواز تیری کدال سے لرزاں ہے خواجگی کی اساس

اگرچہ آج بھی راستوں پہ اندھیرا ہے زمانہ کل ہی بتادے گا سب یہ تیرا ہے

روایتی علامتوں پر چوٹ اریب کی شاعری کا مزاج ہے چنانچہ خواجگی اور ظل الہ کے ساتھ اریب نے جس خفگی کا اظہار کیا ہے جس سے ان کے اندر کا کرب محسوس ہوتا ہے جو شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایام قید میں لکھی ہوئی نظم ''زمین کا درد'' کا ایک شعر درج ہے جس کا تیور ملاحظہ ہو۔

مرئے ندیم مرے ہاتھ میں رباب نہ دے نہ پینا جرم سہی پھر بھی تو شراب نہ دے

شراب' شباب اور رقص وسرور کی محفلوں کا اظہار روایتی شاعری میں ہوتا رہا ہے اسی سے استفادہ کرتے ہوئے اریب نے اس شعر میں جرم کی ایک حسین توضیح بیان کی ہے۔ ذیل کا بند اریب کی نظم ''نیا پرچم'' سے متعلق ہے جس میں انہوں نے عورت کی مظلومیت کو آشکار کیا ہے۔

تو سب کی ماں سہی اب بھی ترا نیلام ہوتا ہے نہ جانے کب سے تیرا حسن ہے بازار کی رونق

جو میں کہتا ہوں کچھ تو مرد ہی بدنام ہوتا ہے تجھے کس نے گرایا آسمانوں کی بلندی سے

عورت کی تضحیک کا مرد ہی ذمہ دار ہے اور یہ فلسفہ کوئی نیا نہیں لیکن اریب نے ان اشعار میں اپنے جذبات کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے اس وسیلہ کو استعمال کیا ہے۔

ضلع بیڑ کی جیل میں محروس رہتے ہوئے انہوں نے ایک نظم ''چاندنی رات اور جیل''، لکھی جس کا ایک بند درج ذیل ہے جو پیغامِ جہدِ مسلسل دیتا ہے۔

یوں ہی محبوس رہ نہیں سکتے دوست لیکن ہم انقلابی۔ جواں

اور ہم ظلم سہہ نہیں سکتے ہم نے لے لی ہے ہاتھ میں شمشیر

ان اشعار میں اریب کی جذباتی کیفیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے وہ جس انداز

سے انقلاب کی روش کو سرہانا چاہتے اور ظلم کے خاتمے کے لئے شمشیر کو ہاتھ میں لینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسے دور حاضر میں دہشت گردی کا وسیلہ سمجھا جائے گا۔ ذیل میں اریب کی غزلوں کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں سلاست، شگفتگی، روانی اور مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے۔

جیسے پی رہا ہوں میں ماہتاب کی کرنیں میرے جام میں ساقی کیا تری نظر بھی ہے
مجھ کو یہ بتایا ہے، ڈوبتے ستاروں نے تلخ کامیِ شب میں لذتِ سحر بھی ہے

اریب کے کلام کی خوبی یہی ہے کہ وہ نا امیدی نہیں بلکہ ہر مصیبت کے بعد راحت کی امید بندھاتے ہیں اور ان کے اشعار میں یہی کیفیت رواں دواں نظر آتی ہے۔

وقت آئے تو اٹھالیتے ہیں تلوار بھی ہم اب تیرے سایۂ گیسو میں غزل گاتے ہیں

عزم وہمت کی دلیل کیلئے اریب نے تلوار کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے چنانچہ اس شعر میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ ذیل کے اشعار میں سلیمان اریب آزادی کے بعد سیاسی افق پر سیاست دانوں کی کارستانیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

ہے یہ کیسی بہارِ آزادی ہر کلی چپ ہے پھول حیراں ہے
یہ زمانہ بھی خوب ہے ساقی مئے تو مہنگی ہے خوں ارزاں ہے
ہاں یہ ہی کفر اصلِ ایماں ہے میرا معبود آج انساں ہے

اریب کے اشعار میں کھلے طور پر خدا سے کھلواڑ کا انداز نمایاں ہے۔ وہ دنیا کی حقیقتوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ہی کچھ ایسے کلمات بھی شعر میں شامل کرلیتے ہیں جو مذہب پرستوں پر گراں گذرتے ہیں اور ان اشعار میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔

ذیل کے شعر میں اریبؔ نے اپنے حوصلہ اور عزم کی وجہ سے اپنی سخت جانی کا ذکر کیا ہے۔

کیا زنجیریں کیا دار ورسن سو بار ادھر سے گذرے ہیں ہم مرمر کے جیتے ہی رہے مارے بھی گئے تو مر نہ سکے

آزادی کے تصور کو ابھارنے کے لئے اریب نے مختلف علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ قربانیوں کے ذریعہ ہی حصول آزادی ممکن ہے۔

ذیل کے اشعار میں سادگی بیان اور نغمگی ملاحظہ ہو۔

لب پر آہیں سینے خالی ایسے عاشق عام بہت ہیں
پینا ویسے جرم نہیں ہے لیکن ہم بدنام بہت ہیں

انسان کے بنائے ہوئے قانون اسے عزیز ہوتے ہیں اور اریب نے یہ مفروضہ گھڑ لیا ہے کہ مے نوشی جرم نہیں یہ انداز ان کی اپنی شاعری کی خصوصیت ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی ذات کی تکفیر کرتے ہیں۔

ذیل کے شعر میں سلیمان اریب اپنی حق گوئی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

صلے میں گر مجھے دار و رسن ملتے ہیں ملنے دو نہ گاتا میں جو حق کے گیت تو' توہینِ گلو ہوتی

حق پرستی پر صلیب و دار ہی مقدر ہوتا ہے اور اسکے خوف سے حق کے گیت نہ گانا سراسر ظلم و زیادتی ہے اسی لئے اریب نے خود کو خوش گلو کی توہین سے بچانے کی جرأت کی ہے۔ درج ذیل اشعار میں اریب نے کوے یار اور دار کی باتیں کی ہیں اس موضوع پر فیض احمد فیض نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ فیض کا شعر اس کے بعد اریب کا شعر ملاحظہ ہو۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
میں تیرے غم سے غم روزگار تک پہنچا تیری گلی سے چلا اور دار تک پہنچا

ترقی پسند خیالات کی نشاندہی میں اریب نے دوسرے ترقی پسند شعراء کے آواز میں آواز ملا کر کلام کرنے کو ضروری سمجھا۔ یہی انداز انکی شاعری میں نمایاں نظر آرہا ہے۔

ذیل کے شعر میں اریب خالق مطلق سے شکوہ کرتے ہیں۔

گذر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

اس شعر میں خالق سے شکوہ کا انداز اریب کے لئے گرفت کا سبب بنتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بندوں سے شکایت کرنے کے ساتھ ساتھ خدا سے بھی شکایت کی تو اس انداز میں جیسے خدا کا وجود بھی انسان جیسا ہو۔ ذیل کے اشعار میں اریب اپنے محبوب سے اپنی اٹوٹ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

کتنے بندھن ٹوٹ گئے ہیں تیرا بندھن کیا ٹوٹا سوچ رہا ہوں جاوں کہاں اب تیرا کوچہ جب چھوٹا
تو نے جب تک چاہا مجھ کو کانٹا کانٹا گلشن تھا تیری نظریں جب سے بدلیں چبھتا ہے بوٹا بوٹا
میرا دامن دیکھنے والے تیرا دامن کیوں دیکھیں حسن ہمیشہ کا سچا ہے عشق ہمیشہ کا جھوٹا

روایت پرست شعراء نے عشق کو سچا اور حسن کو روبہ زوال بتایا ہے جبکہ اریب نے اپنی شاعری میں روایت سے بغاوت کے پس منظر میں بہت سی ایسی باتیں کیں جس سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ اریب ذیل کے شعر میں اپنے محبوب سے اپنی خاموش محبت اور ضبط کی انتہا کو یوں قلم بند کرتے ہیں۔

مٹ گئے جس کے لئے نام تک اس کا نہ لیا کاش اس بات کی اس کو بھی خبر ہو جاتی

اریب کے اس شعر میں غزل کی روایتی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اور انہوں نے محبوب سے شکایت کا انداز بھی روایتی رکھا ہے۔ عصرِ حاضر میں انسانی مصائب اور ساتھ ہی پرامید ہونے کے مضمون کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے۔

ابنِ آدم سے یہ دنیا ابھی مایوس نہیں ابنِ آدم کے لئے گرچہ صلیب آج بھی ہے

ذیل کے شعر میں صبح بہار کے تعلق سے ان کی آس اور امید ملاحظہ ہو۔

لاکھ یورش ہو خزاں کی مجھے اس کا ہے پتہ ہر گلِ تازہ بہاروں کا نقیب آج بھی ہے

روایتی لفظیات سے استفادہ کر کے جدید خیالات کو پیش کرنا اریب کو خوب آتا ہے اس شعر میں اسی کیفیت کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اریب نے ذیل کے شعر میں مشہور کہاوت ''بد ہونا لیکن بدنام نہیں ہونا'' کا مضمون باندھا ہے۔

ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

شک وشبہ سے ہونے والی بدنامی کی حقیقت سے اریب پوری طرح واقف تھے پھر بھی اپنی عادت سے مجبور تھے۔ سلیمان اریب نے اپنی نظم ''عروج آدم'' کو خلائی جہاز وینس نمبر چار کے زہرہ کی سطح پر اترنے کی خبر پڑھ کر موزوں کیا جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہم سے آوارہ مزاجی کا بھرم ہے ساقی اپنی پرواز میں جبریل کا دم ہے ساقی
لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے تو فلک تک پہنچے یہ بھی تیری نگہہِ لطف و کرم ہے ساقی

جبرئیل کی پرواز کا دم رکھنے والے کا لڑکھڑاتے ہوئے ساقی کے لطف وکرم سے فلک تک پہنچنا ایک عمدہ خیال تو ہو سکتا ہے لیکن اسے ممکنات کی دنیا میں تلاش کرنا سخت دشوار ہے اور یوروپی باشندوں کا خلا میں پہنچنے پر یہ ایک بہترین طنز ہے۔ اریب نے ''نذرِ غالب'' کے عنوان سے غزل لکھی ہے جس کا مقطع درج ہے۔

کہنی پڑی زمین اسدؔ میں غزل اریبؔ — گو میں فلک پہ کہنے کا قائل نہیں رہا

اریبؔ کی شاعری کا تضاد یہاں ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے خلاباز کے فلک تک پہنچنے کو تو نظم کیا جبکہ اس شعر میں جس بات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ بلاشبہ انکی ترقی پسندی اور زمین والوں سے متعلق انکے خیالات ہیں۔

ذیل کے شعر میں اریبؔ جس سحر کے منتظر ہیں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بیٹھے ہیں کب سے راہ میں آنکھیں بچھائے ہم — سنتے ہیں راتوں رات وہ بنتِ سحر گئی

فردا کے منتظر انسانوں کے خسارے کو اس شعر میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے سحر کے منتظر اپنے انجام تک پہنچنے سے قبل ہی موقع پرستوں کے ذریعے سحر کا اغوا کرلیا گیا۔

سلیمان اریب نے غزل' آزاد نظم' نثری نظم' موضوعاتی نظم کے علاوہ رباعی اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

خورشید حسین مضطؔر

انکا نام سید محمد خورشید حسین رضوی اور تخلص مضطؔر ہے۔ انکی تاریخ پیدائش ۲۵/ جولائی ۱۹۲۲ء ہے۔[1] سات برس کی عمر میں ان کو قرانِ مجید ختم کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مدرسہ شبان المسلمین سے مولوی کا امتحان کامیاب کیا۔[2] ۱۹۴۲ء میں انہوں نے امتحان ''طبیب مستند'' (جی۔سی۔یو۔ایم) کامیاب کیا۔[3] انہوں نے بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ غالب اور یگانہ انکے پسندیدہ شاعر ہیں شعر گوئی میں انکو کسی سے تلمذ حاصل نہیں رہا۔ اپنی شاعری کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

غالب کا ہوں معتقد، ہوں پرستار میر کا ۔۔۔ زلہ رُبا ہوں خوانِ انیسؔ و دبیرؔ کا

وہ زائد از پچاس برس سے شعر گوئی میں مصروف ہیں۔ گو انکا کلام روایتی کلام کا تسلسل ہے لیکن ماحول کے بدلتے ہوئے اثرات بھی انکی شاعری پر اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔

میں رہا خاک بسر میرا سفر جاری تھا ۔۔۔ میری راہوں میں خدا بن گئے پتھر کتنے

صورت گرِ ازل کی شانِ تخلیق کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

خود کتنا حسین کتنا دلکش ہوگا ۔۔۔ تتلی کے پروں میں رنگ بھرنے والا

انکا پہلا شعری مجموعہ ''غزال'' ۱۹۹۶ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے انکے کلام میں اثر آفرینی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے تشبیہات کو اچھوتے انداز میں برتا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

کتنے رنگوں میں ہیں صورت گری بیم ورجا ۔۔۔ دل نہ ہو کوئی اجنتا کی گپھا ہو جیسے

یہ کلاسیکل غزل گو شاعر اپنے کلام اور مداحوں کو چھوڑ کر اس دارِ فانی سے یکم جولائی ۲۰۰۶ء بعمر ۸۵ سال کو دارِ بقا کی طرف کوچ کر گیا۔

۱۔ شخصی انٹرویو از حکیم خورشید حسین مضطؔر بتاریخ ۵/ نومبر ۲۰۰۳ء۔

۲، ۳۔ ''غزال'' شعری مجموعہ از حکیم خورشید حسین مضطؔر سنہ اشاعت ۱۹۹۶ء صفحہ ا' ۱۰

شمس الدین تاباںؔ

محمد نصیر الدین اورنگ آباد کے منصبدار تھے شمس الدین تاباںؔ ان کے صاحبزادے تھے۔ تاباںؔ کا اصلی نام محمد عزیز اللہ اور کنیت شمس الدین ہے۔ ۲۱ر گسٹ ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ا ان کی عمر چار ماہ کی تھی اور وہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کیا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ محکمہ سیول سپلائیز میں برسر کار رہتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔۲

شمس الدین تاباںؔ کو حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سے تلمذ حاصل تھا اور وہ تلامذۂ صفیؔ میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔ ابتداء میں صفیؔ اورنگ آبادی نے ان کی شعری تربیت کے لیے ان کو اپنے شاگرد سید سجاد علی صوفیؔ کے سپرد کیا تھا جب انہوں نے زبان وفن کے ابتدائی مراحل طئے کر لیے تو ان کو راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ تاباںؔ ابتداء میں شمیم تخلص کیا کرتے تھے لیکن حضرت صفیؔ نے شمس کی مناسبت سے ان کا تخلص تاباںؔ تجویز کیا۔ تاباں ابتداء ہی سے غزل گوئی کی طرف مائل رہے ان کی غزلوں میں معیار اور صحتِ زبان جیسے نمایاں اوصاف ہیں۔ ''ادبستانِ دکن بہ یادگارِ صفی'' کے وہ معتمد رہ چکے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں ان کا شعری مجموعہ ''زنجیر و زنار'' شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔۳

شمس الدین تاباںؔ کو تنفس کا مرض لاحق ہو گیا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انجمنِ صفیؔ کا یہ ستارہ ۱۰راپریل ۱۹۸۵ء کو ٹوٹ گیا۔۴ احاطہ درگاہ سید شاہ راجو محمد محمد الحسینی ''مصری گنج میں ان کی تدفین عمل مین آئی۔ تاباںؔ کے شاگردوں کا ایک مختصر حلقہ ہے۔ تاباںؔ نے اپنے دو لڑکوں جمیل اور رؤف رحیم کی شعری تربیت میں اہم حصہ ادا کیا۔ ذیل میں

۱، ۲، ۳، ۴۔ امجد سے شاذ تک دکن کے نمائندہ شعراء کا تعارف اور کلام کا انتخاب پیش کش روز نامہ ''سیاست'' ۱۹۸۹ء صفحہ ۴۹

تاباںؔ کے چند اشعار بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں ۔

تجھ سے چھوٹ کرتے وابستۂ غم کیا کرتے
مر نہ جاتے تو ترے سر کی قسم کیا کرتے

جسکے رونے پہ ہنسی ، ہنسنے پر رونا آئے
ایسے دیوانہ کا اندازۂ غم کیا کرتے

تم سے دو گام رہِ عشق میں چلنا نہ ہوا
دیکھتے تم کہ تمھارے لیے ہم کیا کرتے

اس نے یہ کہہ کے جفاؤں کی تلافی کردی
غمِ دل ہے تیری تقدیر میں ہم کیا کرتے

آشفتگانِ خاک بسر کو بُرا نہ کہہ
یہ فرش کے مکیں ہمیں عرش پر ملے

ہم آج اپنے آپ سے بھی مطمئن نہیں
آخر کوئی کسی سے کس امید پر ملے

☆☆☆☆

عرصۂ مرگِ مسلسل کو بڑھا دیتے ہیں لوگ
ہائے کس حالت میں جینے کی دعا دیتے ہیں لوگ

میں ہوں رسوائے محبت نہ ملو تم مجھ سے
بات بے بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں لوگ

فلسفہ حسن و محبت کا سمجھنے کے لیے
راست غم خانۂ تاباںؔ کا پتہ دیتے ہیں لوگ

☆☆☆☆

جو پھول کی پتیاں ہیں نازک تو ان کے کانٹے بھی تیز تر ہیں
صبا سے کہیے قدم سنبھالے ہوئے وہ صحنِ چمن سے گزرے

سہیل آفندی

سہیل آفندی اردو شعراء کے مایہ ناز شاعر علامہ نجم آفندی کے صاحبزادے ہیں۔ انکا نام مرزا مسعود الحسن سہیل آفندی ہے۔ ۱۹ رمئی ۱۹۲۳ء کو وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انکی ابتدائی تعلیم شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ میں ہوئی ۱۹۳۵ء میں اپنے والدین کے ساتھ وہ حیدرآباد منتقل ہوئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ دارالشفاء ہائی اسکول اور نامپلی ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں بی۔ ایس۔ سی پاس کیا۔[1] سہیل آفندی کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا۔ انہوں نے غزل کے علاوہ نظمیں، مرثیے اور منقبتیں بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر گوئی کی ہے انہوں نے اپنی شاعری میں رومانی پہلو، جمالیات، اخلاقیات اور دیگر مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ ذیل میں انکا ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے ذاتِ باری کے تعلق سے کہا ہے

دُعا کے ہاتھ اس احساس سے لرزتے ہیں　　خدا خود میری حالت جانتا ہوگا

---

[1] شخصی انٹرویو از سہیل آفندی بتاریخ ۲۵ ر اگست ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید شہر حیدرآباد کی شاعرہ ہیں وہ شاعرہ کے علاوہ اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، پروفیسر سید امیر علی معصومی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ۹/ نومبر ۱۹۲۳ء کو آگرہ میں پیدا ہوئیں۔[۱] انہوں نے لکھنو یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ البرڈز کالج تہران (ایران) سے ڈی۔ لٹ کیا[۲]۔ انکی شادی بریگیڈیر سعید سے ہوئی۔ وہ شعبہ خواتین ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد، انجمن ترقی پسند مصنفین، حیدرآباد لٹریری فورم (حلف)، میرا شہر میرے لوگ اور محفل خواتین سے وابستہ رہی ہیں[۳]۔ وہ نہ صرف اچھی شاعرہ تھیں بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھیں۔ انکے افسانوں کے مجموعے اور شعری مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ افسانوں کے دو مجموعے ۲۔ برگِ سبز (مجموعہ کلام) ۳۔ ہدیۂ طاہرہ (نعتیہ کلام) ۴۔ گل خونچکاں ۵۔ مہکتے ویرانے ۶۔ دورہ گر ۷۔ خونِ جگر ۸۔ پنچھی باورا ۹۔ آشیاں ہمارا (قومی نظمیں) ۱۰۔ بانوے مصر (فارسی افسانے) ۱۱۔ ارپنا (اردو نظموں کا منظوم تلگو ترجمہ) ۱۲۔ دامنِ گلزار (مجموعہ کلام) ۱۳۔ انگریزی میں دو مجموعہ کلام۔

انکی تصانیف پر ساہتیہ اکیڈمی، میر اکیڈمی، آندھراپردیش، اترپردیش، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے انکو ایوارڈز سے نوازا۔ اسکے علاوہ کلا سرسوتی ایوارڈ، آندھراپردیش عالمی اردو ایوارڈز (نئی دہلی)، عالمی ایوارڈ (امریکہ) نے بھی انہیں اعزازات اور انعامات سے نوازا۔[۴]

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی شاعری، خیالات کی فراوانی، مشاہدات کی گہرائی اور

۱،۲،۳ آندھراپردیش کی اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۵۸

۴ ماہنامہ "آندھراپردیش" حیدرآباد ستمبر ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۶، ۱۷

جذبات کی تروتازگی پر مشتمل ہے۔ انہوں نے بیک وقت تین زبانوں (اردو، فارسی، انگریزی) میں شاعری کی ہے۔ شاعرہ کے ساتھ ساتھ وہ اچھی افسانہ نویس اور نثر نگار بھی تھیں۔ انکی شاعری میں سہل ممتنع اور پُر اثر لہجہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انکی شاعری جہاں روایتی شاعری کی پاسدار ہے وہیں وہ ترقی پسند فکر سے بھی متاثر ہے۔ اس امتزاج سے ان کی شاعری جدید شاعری کا بہترنمونہ نظر آتی ہے۔[۱]

انکی شاعری کی عمر لمبی ہے اور وہ حیدرآباد کی بزرگ شاعرہ کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنا چکی تھیں۔ عام طور سے وہ مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتی تھیں لیکن تعلیم یافتہ، باذوق اور مہذب گھرانوں میں ہونے والی محفلوں میں شرکت کیا کرتی تھیں۔ انکا کلام روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ریڈیو اور دوردرشن سے بھی انکا کلام پیش کیا جاتا رہا ہے۔ انگریزی ادب کیلئے انکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے امریکہ کی عالمی یونیورسٹی (ارزونا) نے انہیں ڈی۔لِٹ کی ڈگری سے نوازا۔ انکی ایک انگریزی نظم ''دنیا کی بہترین پچاس نظموں کے مقابلہ میں شریک ہے''[۲]

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید محفل خواتین کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ یہ زودگو شاعرہ ۷ر اگست ۲۰۰۱ء کو اپنا شعری اور نثری سرمایہ اور اپنی یادوں کا سرمایہ چھوڑتے ہوئے مختصر سی علالت کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔[۳] ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ۔

کیا سچ ہے کہ مجھ کو محبت ہے آپ سے
کیا سچ ہے یہ کہ مجھ کو عداوت ہے آپ سے

مختلف دانشورانِ فکروفن نے ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی علمی اور ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور فرماتے ہیں ''انکے بات کرنے اور شعر پڑھنے کے تیور سے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کے ایک مشہور ہمعصر میر محمدی نور صدیوں کے بعد ایک رنگین خیال خاتون کے روپ میں محفل شعر وسخن میں نمودار ہوئے ہیں۔ ایک خاص اور قابلِ ذکر بات یہ ہیکہ پیدائشی شاعر ہونے کے باعث شعروسخن

۱۔ ''برگ سبز'' ۱۹۶۱ء صفحہ ۲ ۲۔ ''شاداب'' حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ستمبر تا نومبر ۱۹۹۳ صفحہ ۲۱۹

۳۔ ماہنامہ ''آندھرا پردیش'' حیدرآباد ستمبر ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۵

میں نہ کسی سے اصلاح لیتی تھیں اور نہ کسی سے مشورہ کی محتاج رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے ساختہ لکھتی ہیں اور اپنے کلام میں سادگی اور شگفتگی برقرار رکھنے کی بڑی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ایک اچھی شاعرہ کے علاوہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں''۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی رقم طراز ہیں ''میں محترمہ بانو طاہرہ سعید کی نظموں اور غزلوں کو کئی سال سے اردو مجلس اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ادبی محفلوں میں سنتا رہا ہوں۔ بانو طاہرہ نے نہ صرف مغربی اور مشرقی ممالک بلکہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں کی بھی سیر کی ہے اور اس اعتبار سے انکے اشعار کی ہندوستانیت کچھ زیادہ تعجب نہیں ان کا رجحان، غزل کے بجائے نظم کی طرف زیادہ معلوم ہوتا ہے''۔ اس رجحان کے باعث ان کی بہت سی غزلوں میں بھی نظم کا پرتو نظر آتا ہے مثال کے طور پر ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو

بڑی دلچسپیوں سے جشنِ طوفاں ہم نے دیکھا ہے
قریبِ آشیاں بجلی کو رقصاں ہم نے دیکھا ہے
سجاوٹ جن کی، کی جاتی تھی پھولوں اور افشاں سے
اُنہی زلفوں کو بحالِ پریشاں ہم نے دیکھا ہے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں ''بانو طاہر سعید اردو، فارسی اور انگریزی کی ایک خوش فکر اور خوش گو شاعرہ ہیں ان تینوں زبانوں میں انکے کمالِ فن کا اعتراف ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں متعدد بار ہو چکا ہے۔ انہیں نظم اور غزل دونوں پر قدرت ہے۔ ان کا کلام ملک کے بلند پایہ جرائد کی زینت بنتا رہا ہے۔ نظم کی تمام اصناف پر انہیں عبور حاصل ہے''۔

بانو طاہرہ سعید نے غزل، پابند نظم، آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم کے علاوہ ہائیکو، سانیٹ اور قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

بارگاہِ لم یزل میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہوئی بانو طاہرہ سعید کہتی ہیں

میرے پروردگار، اے اللہ

ہے تری کائنات کتنی حسین
حُسن بکھرا کے خود ہے پردہ نشیں

بانو طاہرہ سعید کی شاعری میں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت پائی جاتی ہے۔ وہ عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل سے حصولِ مقصد کیلئے کوشاں رہنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

خود ہی پار لگائیں گے سفینہ اپنا
ناخداؤں کے نہ شرمندہ احسان ہوں گے

وہ کہتی ہیں کہ اگر پھولوں پہ بہار دیکھنا ہے تو خونِ جگر سے گلشن کی آبیاری کرنا چاہیے۔ عصر حاضر میں اولاد کی تربیت کے تعلق سے یہ شعر سرپرستوں کیلئے قیمتی مشورہ ہے۔

سینچئیے پہلے خونِ دل سے چمن
دیکھئے پھر بہار پھولوں کی

درج ذیل شعر میں کتنا دلکش، حسین اور شگفتہ خیال پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ان کے ہونٹوں پہ مسکراتی ہے
مسکراہٹ ہزار پھولوں کی

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے رسالتمابؐ کی خدمت میں نعتیں بھی لکھنے کی سعادت حاصل کی ''ہدیہ طاہرہ'' انکے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جسمیں انہوں نے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سرزمینِ مدینہ منورہ لائقِ صد افتخار ہے جہاں حضور اکرمؐ آرام فرما رہے ہیں مدینہ منورہ میں صدیوں سے شمع رسالت روشن ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ سعید بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دُعا ہیں کہ انکو اُسی شمع کا پروانہ بنا دیا جائے۔

جو شمع مدینہ میں ہے صدیوں سے فروزاں
اِس شمع کا یارب مجھے پروانہ بنادے

انکی دُعا ہے کہ انہیں اسمِ رسالتمابؐ کے علاوہ کچھ یاد نہ رہے۔

کچھ بھی نہ رہے یاد بجز نام محمدؐ
یوں عشق محمدؐ، مجھے پروانہ بنادے

رجائیت پسندی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

رات اندھیری ہے کٹ جائے گی
صبحِ روشن کا انتظار کرو

ڈاکٹر طاہرہ سعید کہتی ہیں کہ شاعر کی طرح زندگی گذارنا چاہیئے جو حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور جنکا عقیدہ رواداری اور محبت ہوتا ہے۔

شاعروں کی طرح جیو لوگو
مذہب عشق اختیار کرو

اُنکی نگاہ میں وہ انسان بد بخت ہے جسے زر اور زور ملا لیکن درد کی دولت سے محروم ہو۔

طاہرہ کتنا ہے وہ بد بخت انساں
زر ملا، زور ملا، درد کی دولت نہ ملی

ڈاکٹر طاہرہ ایرانی نژاد ہیں۔ اپنے وطن کو یاد کر کے وہ کہتی ہیں۔

گلِ و بلبل کا وہ رنگیں چمن یاد آیا
حافظ و سعدی کی غزلوں کا وطن یاد آیا

دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں۔

کیا خبر کیا ہو ایک لمحہ میں   زندگی کا نہ اعتبار کرو

ذیل کے اشعار میں وہ نوجوانانِ ملت سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ زندگی میں نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہی کامیابی کی راہ کو ہموار کرتا ہے۔ حالات سے فرار مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ ہر رات کے بعد نمودِ سحر ہوتی ہے۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ غم کی دولت باعثِ افتخار ہوتی ہے۔

زندگی سے نہ یوں فرار کرو
غمِ دوراں کو ہم کنار کرو
چاند پھر سے نکلنے والا ہے
چار دن اور انتظار کرو
دولتِ غم اگر میسر ہے
اپنی قسمت پہ افتخار کرو

پروفیسر ہارون خاں فرماتے ہیں کہ الفاظ ''فرار کرنا'' اور افتخار کرنا عام طور پر اردو میں اِن شکلوں میں استعمال نہیں کئے جاتے۔[1] والی شہرِ محبت محمد قلی قطب شاہ کے مشہور مصرعے کی تضمین کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہرہ سعید نے ایک مرصع غزل لکھی ہے جسکا مطلع ملاحظہ ہو۔

یہ کیا زندگی ہے جیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

انہوں نے بریگیڈیر سعید سے شادی کے بعد حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا گو وہ ایران نژاد ہیں انکا ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام طویل مدتی رہا ہے لیکن حیدرآباد کے حُسن اور دلکشی نے انکا دل موہ لیا۔ ارضِ دکن سے اپنے لگاو کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں۔

دِلّی بہت حسین ہے، دلکش ہے لکھنو
لیکن کچھ اور ہی ہے ہمارے دکن کی بات

انہوں نے ہندی الفاظ کو فارسی بندشوں کے ساتھ دلکش انداز میں استعمال کیا ہے۔ ذیل کے اشعار سے جسکی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

آکاش پہ دیپ ستاروں کے
دھرتی پر پھول بہاروں کے
سبزہ پر شبنم کے موتی
ساون کی ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی
یہ میرے بکھرے سپنے ہیں
بجلی کی کڑک بادل کی گرج
خونبار شفق، ڈھلتا سورج
مہتاب میں نیند جوانی کی
اور خوشبو رات کی رانی کی
یہ میرے بکھرے سپنے ہیں

[1] ''برگِ سبز'' شعری مجموعہ بانو طاہرہ سعید ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰

اپنے وطن ایران سے تعلقِ خاطر کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ دکن کے افسانے کو وہ اہلِ ایران کو سنانا چاہتی ہیں اور اسطرح وہ ایران اور دکن میں ایک ثقافتی و ادبی رابطہ پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

تمنا ہے کہ ایران پھر سے جاؤں
گلے سے دوستوں کو پھر لگاؤں
دکن کے اُن کو افسانے سناؤں
دکن کا سب کو دیوانہ بناؤں
محبت دوستی اپنا چلن ہے

ڈاکٹر طاہرہ برصغیر کی تقسیم کے تعلق سے کہتی ہیں۔

طاہرہ ، ملک کی تقسیم سہی دل تو ایک ہے
درمیان فاصلے کتنے ہی سہی پیار تو ہے

وہ سیتا جی کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انکے حُسن ،عصمت اور پاکیزگی کی وجہ سے دنیا کی مثالی خاتون قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں۔

جنت کی حور تھی کہ کرن آفتاب کی
دنیا تھی نور و رنگ جمال و شباب کی
آنکھوں میں جیسے عصمتِ مریم کی تھی جھلک
زلفوں میں جیسے گیسوئے بلقیس کی دمک
راوَن کی زشت آرزو بل کھا کے رہ گئی
سیتا کے ست کے سامنے تھرا کے رہ گئی

انہوں نے جہاں نظموں میں امامِ عالی مقام کی خدمت اقدس میں اپنے عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں وہیں پر گرونانک ،محمد قلی قطب شاہ ،سیتا وغیرہ پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔اردو زبان پرانہوں نے ایک نظم لکھی ہے جو پانچ بند پر مشتمل ہے۔اس نظم کا ایک بند درج ذیل ہے

کتنی میٹھی زباں کیسی پیاری زباں — میری اردو زباں فخرِ ہندوستاں

اس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے　　زلفِ زیب النساء کی بھی مہکار ہے
اس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے　　ساز و نغمہ کے ہمراہ تلوار ہے
اس کے دامن میں کتنی ہی رنگینیاں　　میری اردو زباں فخرِ ہندوستاں

ڈاکٹر طاہرہ سعید کے شعری مجموعہ ''مہکتے ویرانے'' کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں۔ ''طاہرہ سعید کا کلام اس وقت تک ملک کے بلند پایہ جرائد کے صفحات کی زینت بنتا رہا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اب یہ مختلف رسائل و اخبارات میں بکھرا ہوا کلام ایک کتابی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے''[1]

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی شاعری کا ایک اہم موضوع وطن کی عظمت، دفاعِ وطن اور ہماری مشترکہ تہذیب و روایات کا تحفظ ہے۔ ایک سپاہی جو ملک کے دفاع کیلئے محاذِ جنگ پر برسرِ پیکار ہے۔ اسکی بیوی کے احساسات کو شعر کے سانچے میں انہوں نے کس عمدگی سے ڈھالا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

محاذ سے فتح پاکر آؤ یہی دعا ہے یہی لگن ہے
غموں میں گرچہ گھری ہوئی ہے تمہاری دلہن مگر مگن ہے

ملک میں ہونے والے فسادات سے ملولِ خاطر ہیں اور آپسی صفوں میں اتفاق کی اہمیت کو وہ واضح کرتی ہیں۔

نازک ہے وقت ہوش میں آنے کا وقت ہے
قدموں کو اور دل کو ملانے کا وقت ہے
آپس کے اتحاد میں عظمت ہے قوم کی
آپس کے تفرقوں کو مٹانے کا وقت ہے

انہوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شعری ادب میں ایک نئی جاپانی صنفِ سخن ''ہائیکو'' در آئی ہے۔ یہ صنفِ سخن تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انہوں نے اس صنفِ سخن میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ذیل میں ایک مثال بطور نمونہ درج ہے۔

---

[1] ''مہکتے ویرانے'' شعری مجموعہ از ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۲

ایک پرندے نے مجھ کو دی دعوت
آ پرواز ساتھ ساتھ کریں
کیسے سمجھاؤں میرے پر ہی نہیں

نثری نظم مغربی ادب کی دین ہے۔ نثری نظم ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہے۔ بحر کے اور اسکے ارکان کے پابندی کی وجہ سے نظم میں جو ترنم پیدا ہوتا ہے وہ نثری نظم میں نہیں ہوتا۔ نثری نظم میں خیال کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تتلیاں پکڑنے کا فن ہے اور اس فن میں ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کو کمال حاصل ہے۔ انکی نثری نظموں کا مجموعہ ''دور رہ کر'' ۱۹۸۷ء کو شائع ہو چکا ہے مجموعہ کا انتساب نثری نظم میں ملاحظہ ہو۔

انتساب

ایک دن تم نے مجھے
صرف کورے کاغذات تحفے میں دیئے تھے
لکھا تھا!
''اپنے دوست کی نگارشات کے لئے''
دیکھنا
اب وہ کورے نہیں رہے
میں انہیں
تم ہی سے منسوب کرتی ہوں

ڈاکٹر طاہرہ سعید کے شعری ذخیرے میں نثری نظموں کے علاوہ موضوعاتی نظمیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مغربی ادب سے درآئی ہوئی نئی صنف ''سانیٹ'' میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں انکا ایک سانیٹ ''سپنے'' ملاحظہ ہو۔

میں نے بھی سپنے دیکھے تھے!
سُرخ گلاب اور چاندنی رات
اُن سے کہوں گی دل کی بات
کیا وہ سپنے جھوٹے تھے؟

سپنے، سپنے ہوتے ہی!
تلخ حقیقت، نشترِ غم
اُنکا نہ ملنا، کیا ستم
دل کے ارماں روتے ہیں
میری طلب تھی کسی کا درشن!
آشا تھی آنکھیں، ہوں گی روشن
کون تھا بیچ میں میرا دشمن؟

البرٹ ٹالمین امریکن شاعر کو اردو زبان سے پیار تھا جسکا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوگیا انکے مجموعے ''مثبت و منفی'' کی چودہ نظموں کا بانو طاہرہ سعید نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

صنف رباعی میں بھی ڈاکٹر طاہرہ بانو سعید نے طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں انکی دو رباعیات درج کی جاتی ہیں۔ پہلی رباعی میں انہوں نے زندگی میں حوادثات کے مقابلہ کیلیے آدمی کو تیار رہنے اور زندگی کے نشیب و فراز سے پا مردی کے ساتھ گذرنے کا مشورہ دیا ہے۔ دوسری رباعی میں وہ رب العزت کی عطا کا ذکر کرتی ہیں اور بندہ کو بندگی کے آداب سے واقف کرواتی ہیں۔

دل کے زخموں کو بھی سی لیتے ہیں سینے والے
موت کی گود میں جی لیتے ہیں جینے والے
ساغرِ زیست کی مئے تلخ سہی، تلخ سہی
مسکرا کر اسے پی لیتے ہیں پینے والے

☆☆☆

وہ دے رہا ہے تم لینا سیکھو
دامن میں نعمتوں کو سمونا سیکھو
دستگیری کو ہے آمادہ کوئی دستِ کرم
تم تو ہاتھ میں ہاتھ دینا سیکھو

ڈاکٹر غیاثؔ صدیقی

میر غیاث الدین علی خاں غیاثؔ ۲۸ رجون ۱۹۲۵ء کو کالی کمان دیوڑھی فقیر پاشاہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کے والد صاحبزادۂ نواب میر معین الدین علی خاں مرحوم کا تعلق خانوادہ آصفیہ سے تھا۔ وہ ایک جید عالم تھے تاریخ اور علوم پر ان کی غیر معمولی نظر تھی ان کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا انکے ذاتی کتب خانہ میں نادر قلمی نسخہ جات بھی تھے۔ ایسے علمی گھرانے میں غیاثؔ صدیقی نے آنکھیں کھولیں۔[۲] غیاثؔ صدیقی نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم فل کی تکمیل کی انہوں نے طب میں ڈپلوما حاصل کیا اور طبابت سے وابستہ رہے وہ ایک اچھے شاعر، نثر نگار اور مبصر تھے ان کو حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سے تلمذ حاصل تھا۔[۳] ان کے تین شعری مجموعے ''آواز کا رنگ''، ''قفس رنگ'' اور ''سمندر ناؤ میں'' زیور طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ ''گونگا درد'' انکے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے ''نیلم کے پنکھ'' (تلگو سے اردو ترجمہ) کی اشاعت عمل میں آچکی ہے اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے ۱۹۹۵ء میں غیاثؔ صدیقی کے شعری مجموعہ ''سمندر ناؤ میں'' پر ایوارڈ دیا۔[۴]

غیاث صدیقی ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ ''سیوا'' خود اپنی ادارت میں نکالتے تھے ۱۹۷۲ء میں ممتاز تلگو شاعر شیشندر شرما کی بیس جدید نظموں کا اردو ترجمہ ''نیلم کے پنکھ'' شائع کروایا۔ یہ ترجمہ مقبول عام ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں غیاث صدیقی کی طبع زاد نظموں کا مجموعہ ''آواز کا رنگ'' شائع ہوا جس کو آندھرا پردیش اور اتر پردیش کی اردو اکیڈیمیوں نے انعامات سے نوازا۔ غیاثؔ صدیقی نے ''گونگا درد'' کے نام سے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین خاکے اور انشائیے لکھے ہیں جو دلچسپ اور پر لطف ہیں۔

۱؎، ۴؎ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں شاعروں اور مصنفین کی ڈائریکٹری ۲۰۰۹ء صفحہ نمبر ۳۰۳

۲؎، ۳؎ غیاثؔ صدیقی شخصیت اور فن مرتبہ وہاب عندلیب اشاعت دوم ۲۰۰۳ء صفحہ نمبر ۱۰۵

غیاثؔ صدیقی نے مختلف شعری اصناف حمد' نعت' غزل اور نظموں میں طبع آزائی کی ہے۔ غیاثؔ صدیقی پابند نظم' آزاد نظم' معریٰ نظم اور نثری نظم کے تخلیق کار ہیں۔ غیاثؔ صدیقی نے ۱۹۴۳ء میں اپنی پہلی غزل مشاعرہ میں سنائی تھی جس میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی تشریف رکھتے تھے اس غزل کا ایک مصرع ہے۔ ع

خدا کی جو رضا مندی وہ بندہ کی رضا مندی

اس مصرع پر زور صاحب ایستادہ ہو گئے اور با آواز بلند کہنے لگے کہ اگر یہ مصرع علامہ اقبالؔ سے منسوب کیا جائے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔[1] وہ صفی اورنگ آبادی سے تلمذ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ لفظ و معنی کے رشتہ کو کبھی جدا نہیں کرتے وہ لفظوں کو تولتے اور پھر اشعار کے دھاگے میں پروتے تھے یہ ان کا خاص وصف تھا انہوں نے سنگلاخ زمین اور شگفتہ و رواں ہر دو بحروں میں مضمون باندھے ہیں۔

دکن میں ''لوریوں'' ''چکی ناموں'' اور ''چرخہ ناموں'' کا لکھنا روایت کا حامل ہے جو بچوں کو سلانے اور کام کی سختی کو بھلانے میں کام آتا تھا جس سے سماجی اور روحانی تربیت کا بھی کام لیا گیا ہے۔ غیاثؔ صدیقی نے اس روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کی پہلی ترقی پسند لوری کہی جو ان کے مجموعے کلام ''قفس رنگ'' میں شائع ہو چکی ہے اس لوری سے متاثر ہو کر فیض احمد فیضؔ نے اپنے مجموعہ کلام ''میرے دل میرے مسافر'' میں ایک لوری جس پر بڑی حد تک غیاثؔ صدیقی کی لوری کی چھاپ ہے لکھی ذیل میں ہر دو لوریوں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

غیاثؔ صدیقی	فیض احمد فیضؔ
سو جا منّے' سو جا	مت رو بچے
کل سے اپنے گھر میں	رو رو کے ابھی
کتنے فاقوں کی مہمانی ہے	تیری امی کی آنکھ لگی ہے
عبوٗ' سلو	مت رو بچے
ہم سایوں سے مانگی بیچ	کچھ ہی پہلے
چپکے سوئے ہیں	ترے ابا نے

[1] غیاثؔ صدیقی شخصیت اور فن مرتبہ وہاب عندلیب اشاعت دوم ۲۰۰۳ء صفحہ نمبر ۱۱۸

ترے ابّا کب سے
پھولوں کی چادر کے نیچے
مٹی کے بے نور مکان میں
سب سے روٹھ کے
سڑتے گلتے جسم کو پہنے
سوئے ہیں
دودھ کہاں سے لاؤں منے
میں نیر بل ہوں تو کومل ہے
کون ہمارا والی
عمرؓ نہیں
گاندھی بھی نہیں
دونوں کی دستک بھی نہیں

(حیدر آباد ۱۹۷۶ء سے قبل)

اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
ترے آنگن میں
مردہ سورج نہلائے گئے ہیں
چندر ما دفنائے گئے ہیں
تو روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شائد
سارے اس دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے آئینگے [۱]
(بیروت ۱۹۸۰ء)

ابن احمد تاب کا شعری مجموعہ ''خامہ دل'' کو اردو ادبی ٹرسٹ حیدر آباد نے شائع کروایا تھا اس موقع پر جشنِ ابن احمد تاب کا مائی پورہ میں منایا گیا جشن کی تیاری کے انتظامات یعقوب قریشی اور تجمل صدیقی کے تفویض تھے مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر وحید اختر اور اقبال متین شامل تھے اس جلسہ میں ابن احمد تاب اپنی غزل سنا کر سامعین سے داد حاصل کر رہے تھے ان کی غزل کا مقطع درج ذیل ہے ۔

شرافتوں کا تقاضہ یہی ہے اب تو تابؔ کہ ہر رذیل کو اس دور میں سلام کرو

مشاعرے کی صدارت غیاث صدیقی کر رہے تھے مندرجہ بالا شعر سن کر غیاثؔ صدیقی نے تابؔ کو فرشی سلام کرنا شروع کر دیا سارا مشاعرہ زعفران زار بن گیا۔

---

[۱] غیاث صدیقی شخصیت اور فن اشاعت دوم اگست ۲۰۰۳ء صفحہ نمبر ۱۰۷ ، ۱۰۸

ذیل میں غیاثؔ صدیقی کی نظموں کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

مجھے تم تپتے صحرا میں نہ چھوڑو — مرے تلووں میں بھی آنکھیں لگی ہیں
بے کسی کے صحرا میں میرا رینگتا سایہ — چاند کا کفن میرے ساتھ اوڑھ کر نکلا
سخاوت کو اٹھے تھے اپنے ہی ہاتھ — ہمارا ہی دامن تھا پھیلا ہوا

ذیل میں غیاثؔ صدیقی کی غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

پیالہ زہر کا پی کر زبانِ حق کھولو — جو مصلحت سے ہے خاموش وہ بھی جھوٹا ہے
میں کب سے یاد نہ آیا تجھے، بتا سچ سچ — حنا کا رنگ ہتھیلی میں کب سے پھیکا ہے
سنا تم آئے تھے جس رات میری نگری میں — گلی گلی میں اسی رات سے اجالا ہے
مئے کدے سے ہر چہرہ ذات اوڑھ کر نکلا — دن کی باری جب آئی رات اوڑھ کر نکلا
فاصلے کم ہوں، شکایات کا بازار گرے — رات ہی رات جو اٹھی ہے وہ دیوار گرے
بات جب ہے کہ غریبوں کو بھی مسند مل جائے — کوئی سرکار اٹھے یا کوئی سرکار گرے

غیاثؔ صدیقی اپنی شاعری میں منفرد آہنگ کی وجہ سے خاص شناخت رکھتے ہیں۔ وہ غزل میں روایات سے انحراف کا رویہ اختیار کئے۔ ترقی پسند رجحانات سے استفادہ ان کی شاعری کا خاصہ رہا۔ اپنے اسلاف کی وضعداری کو ضرور برقرار رکھا لیکن شاعری میں ہمیشہ ترقی پسندی کو ملحوظ رکھا۔ ندرت خیال کی بجائے وہ پاکیزگی خیال کے قائل ہیں اس لئے اپنی شاعری میں روایات سے فرار پر توجہ دیتے ہیں۔ خانوادہ آصفیہ سے تعلق رکھتے کے باوجود مدح سرائی کو روا نہیں رکھا بلکہ حق کے اظہار کے لئے شاعری کو استعمال کرنے کی طرف توجہ دی۔ اسی لئے غیاثؔ صدیقی کی شاعری میں ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ تازگی انہیں تازہ کار شاعر بنا دیتی ہے۔ یہ منفرد آہنگ کا شاعر ۸/ اگست ۲۰۰۲ء بروز جمعرات اس دنیا سے رحلت کر گیا۔[1]

[1] غیاثؔ صدیقی شخصیت اور فن اشاعت دوم اگست ۲۰۰۳ء صفحہ نمبر ۱۰۴

خواجہ شوقؔ

خواجہ شوقؔ کا نام خواجہ حسین شریف اور تخلص شوقؔ ہے۔ وہ ۲۶/ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ م ۱۸ جولائی ۱۹۲۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ؎۱۔ انکے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ انکے اجداد عالمگیری فوج کے ساتھ حیدرآباد آئے اور یہیں پر سکونت پذیر ہوگئے۔ خواجہ شوقؔ کی عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مستعد پورہ مڈل اسکول، آصفیہ ہائی اسکول اور سٹی کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ اُنکے والد محمد اسمٰعیل صاحب کے انتقال کر جانے کی وجہ انکا سلسلہ تعلیم بہ مشکل میٹرک تک جاری رہا۔ ان حالات میں انہوں نے صرف خاص مبارک (نظام اسٹیٹ) میں ملازمت اختیار کرلی ؎۲۔ اُن میں تعلیم کا شوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے ملازمت کرتے ہوئے مولانا حمید الدین صاحب قمرؔ سنبھلی کے ادارۂ شرقیہ اور ادارہ فخریہ سے منشی اور منشی فاضل کی تکمیل کی ؎۳۔ ابتداء میں مولانا مفتی میر اشرف علی (نبیرہ حضرت شائقؔ) کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ چار، پانچ سال بعد وہ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ ہوگئے ؎۴۔ حضرت صفیؔ سے انہوں نے علمِ عروض سیکھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور شاعری کا ذوق اُنکو ورثہ میں ملا تھا۔ اُنکے دادا حضرت سید رفیع الدین کیفیؔ اپنے وقت کے معروف شاعر تھے۔ اسکے علاوہ وہ دور جس میں خواجہ شوقؔ نے ہوش سنبھالا، حیدرآباد نامور شعراء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مشاہیرِ شعراء ضامنؔ کنتوری، حبیبؔ کنتوری، نواب ترابؔ یار جنگ شہیدؔ، نواب شہید یار جنگ، نوابؔ نثار یار جنگ مزاجؔ، غلام دستگیر ابرؔ، علامہ ناصر زید پوری، سید حیدر پاشاہ، بزمؔ آفندی، نجمؔ آفندی، فصاحتؔ جنگ جلیلؔ، اجلالؔ لکھنوی، ابو ثاقب انجمؔ، علی اخترؔ، صفیؔ اورنگ آبادی، مفتی میر اشرف علی، نواب ضیا یار جنگ، احمد علی شاب، امجدؔ حیدرآبادی، علی

۱،۲،۳،۴: چشمِ نگراں از خواجہ شوقؔ صفحہ نمبر ۱۲

منظور، محمد علی سرور، مولانا کامل شطاری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر باقی، آشفتہ لکھنوی، پروفیسر سروری، قدر عریضی، تاج قادری، تاج قریشی، زہر راج ساقی، ست گرو پرشاد رہبر، نرسنگ راج عالی، ڈاکٹر سکینہ الہام، کنول پرشاد، حسرت ترمذی، عبدالمقتدر خاں ناظم، حافظ ابونعیم عیش، راجہ کرن، پنڈت ذکی، جذب عالمپوری، حسن علی، شیو جی فغاں، ہرمز حیدرآبادی، صاحبزادہ میکش، صمد رضوی ساز، نظر حیدرآبادی، مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، علامہ حیرت بدایونی، حیدر علی صفا، عبدالقادر خسرو، قمر ساحری، خورشید احمد جامی، سعید شہیدی، مولانا معزالدین قادری ملتانی، اوج یعقوبی، سلیمان اریب، بہادر علی جوہر، عبدالحمید خاں خیال، غلام علی حاوی کیساتھ انہوں نے طرحی مشاعرے پڑھے۔ اُس زمانے میں طرحی مشاعروں کا چلن تھا۔ خواجہ شوق اپنے ہم عصر شعراء کیساتھ بزمِ مہاراجہ کشن پرشاد، بزمِ ضامن کنتوری، مولانا کامل شطاری کی محفل، بزم زعم، بزمِ حیدر پاشاہ اور دبستانِ صفی وغیرہ میں مشاعرے پڑھے۔

اِنکی طبیعت کا میلان ابتداء ہی سے غزل کی طرف رہا۔ اِسکے علاوہ انہوں نے اور اصنافِ سخن نعت، منقبت، سلام، نظم، قطعہ اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُنکا حافظہ غیر معمولی قوی تھا۔ ابتدائی زمانے میں پوری غزل کاغذ پر لکھ کر انہوں نے کبھی نہیں پڑھی۔ کسی پرزے پر اشعار کا سرِ حُرف احتیاطاً لکھ لیا کرتے تھے جو غزل پڑھنے کیلئے کافی تھا۔ عصر حاضر کے شعراء میں استادانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ انکا مجموعہ کلام ''چشمِ نگراں'' ۱۹۸۴ء میں اور انکی نعتوں، سلام اور منقبتوں کا مجموعہ ''صلِ علیٰ'' ۱۹۹۵ء کو زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ انکو گسٹ ۲۰۰۰ء میں مخدوم ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

انہوں نے مرصع غزلیں کہی ہیں اور روایتی شاعری کی پاسداری کی ہے لیکن اُنکے ہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ آنسو بھی زبانِ غم و آلام نہیں بلکہ تبسم بھی یہ مفہوم ادا کرتے ہیں۔

شوق، آنسو ہی زبانِ غم و آلام نہیں
کچھ تبسم بھی یہ مفہوم ادا کرتے ہیں

وہ زندگی کو جہدِ پیہم تصور کرتے ہیں جسمیں آدمی مسلسل حالات کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔

جہدِ پیہم کے سوا کیا ہے ہمارا جینا
ایک طوفاں سے چلے دوسرے طوفاں کی طرف

لوگ بلند قامت نہ ہوں تو اپنی کوتاہ قامت کو بلندی دینے کیلئے مرحومین سے

اپنی نسبت کا اظہار کر کے اپنے آپ کو بلند قامت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

اپنی کوتاہ قامت کو بلندی دینے لوگ مُردوں کے بھی کاندھوں پر کھڑے رہتے ہیں

اگر لوگ اچھے لباس میں ملبوس ہوں تو انکی یہ پوشاک انکے اچھے ہونے کا باعث نہیں ہوسکتی۔ کردار علحدہ چیز ہے لباس علحدہ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

لباس اچھا ہو تو لازم نہیں کردار اچھے ہوں بہت کم لوگ اس معیار پہ پورے اترتے ہیں

موجودہ سیاسی منظر سے وہ پردہ ہٹاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی فساد، قتل اور لوٹ مار میں شریک لوگ ہی مجرم نہیں ہوتے بلکہ پسِ پردہ سفید پوش قائدین کا اس میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

کئی ذہن رساء پردے کے پیچھے کام کرتے ہیں وہی قاتل نہیں جو لے کے خنجر سامنے آئے

موجودہ دور کے کرب کا انہوں نے کس عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

طئے ہورہی ہے عمر عجب بے بسی کے ساتھ اک سانس اجل کے ساتھ ہے اک زندگی کے ساتھ

خالقِ کائنات کی دین اور انکی آزمائیشوں کے تعلق سے خواجہ شوقؔ کہتے ہیں۔

ان کے انداز کرم خاص ہوا کرتے ہیں دل بڑھانا ہو تو دل توڑ دیا کرتے ہیں

خداوند کریم کی دین عجب ہوتی ہے اگر ان کو مقصود ہو تو آگ لینے جاؤ پیغمبری ملتی ہے۔ وہ جب نوازنا چاہتے ہیں تو خطاؤں پر بھی نواز دیتے ہیں۔ اُنکی دین کسی قانون یا اصول کی پابند نہیں ہے۔

کسی آئین کی پابند نہیں دین اُنکی چاہتے ہیں تو خطاؤں پہ بھی عطا کرتے ہیں

بعض پھول ایسا مقدر پالیتے ہیں کہ وہ گیسو کی، جیب کی اور گریباں کی زینت بن جاتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے پھول ہیں جو بے فصل کھلے ہیں۔

زینتِ جیب وگریباں ہیں نہ زیب کاکل ہم ہیں وہ پھول جو بے فصل کھلا کرتے ہیں

دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں پھول کی کُل زندگی یہ ہے کہ جب تک وہ کلی ہے ٹھیک ہے لیکن کلی کا مسکرا کر پھول بننے کا عرصہ انتہائی مختصر ہوتا ہے اور پھول بن جانا زندگی کے خاتمہ کی علامت ہے۔

کم بھی ہے، گراں بھی ہے بہت عمرِ تبسم جینا ہے تو اے غنچۂ لب بستہ نہ بن پھول

اس شعر میں خواجہ شوقؔ نے جس خوبصورتی سے پیکر تراشی کی ہے وہ دیدنی ہے۔ پیکر تراشی غزل کے حُسن میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ مصوّر قلم سے تصویر کشی کرتا ہے اور شاعر الفاظ سے۔ ملاحظہ ہو۔

اس بولتے پیکر پہ ہے خود حُسن بھی نازاں   لب پھول، نظر پھول، ادا پھول، بدن پھول

کسی کو پابہ زنجیر کیا جاتا ہے اور بعض وقت زنجیر بدلنی پڑتی ہے۔ خواجہ شوقؔ کہتے ہیں کہ عرصۂ اسیری کی اذیت سے زیادہ وہ وقت ہے جو زنجیر بدلنے میں لگتا ہے۔

آزارِ اسیری سے بڑھ کر ہے اذیت میں   وہ وقت جو لگتا ہے زنجیر بدلنے تک

جب تک انسان زندگی کے بندھن میں بندھا ہوا رہتا ہے اسکی قدر و منزلت ویسی نہیں ہوتی جیسا ہونا چاہیئے۔ مرنے کے بعد انسان کے اوصاف یاد آتے ہیں اور لوگ اُسکی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں اسطرح مردہ پرستی معاشرے کا ایک جُز بن گئی ہے۔

زندوں کے ناشناس، پرستار لاش کے   اکثر دکھائی دیتے ہیں لوگ اس قماش کے

ذیل کے شعر میں خواجہ شوقؔ نے بڑی ندرت کیساتھ اپنے خیال کو پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں احساسِ غم کی پاسداری میں گو آنکھیں خشک نظر آتی ہیں لیکن دِل روتا ہے جسکی وجہ دامانِ دل میں نمی پائی جاتی ہے۔

عجب عالم ہے شوقؔ احساسِ من کی پاسداری کا   بظاہر خشک ہیں آنکھیں مگر دامانِ دل نم ہے

خواجہ شوقؔ کا یہ شعر موجودہ بین الاقوامی حالات کا غماز ہے۔

ہیں زبانوں پہ امن کی باتیں   سازشیں چل رہی ہیں در پردہ

بیشتر شعراء نے اپنے اشعار میں یہ مضمون باندھا ہے کہ موت غموں سے نجات دلاتی ہے چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خواجہ شوقؔ بھی غموں سے نجات حاصل ہونے کا موت ہی کو سبب سمجھتے ہیں۔

زندگی شوقؔ بلا بن کے مجھے لپٹی تھی   موت نے آکے مرے سر سے بلا ٹالی ہے

خواجہ شوقؔ کہتے ہیں کہ انکی طبیعت میں وجہ تلخی اُن کے مشاہدات ہیں۔ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ تلخ و تند مشاہدات کے باعث انکی طبیعت

میں تلخی پیدا ہوگئی۔

میرے مزاج میں تلخی یوں ہی نہیں آئی بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے دنیا کو

ذیل کے اشعار میں خواجہ شوقؔ، معاشرہ کے جبر اور عوام کے اس جبر کو سہہ لینے کی عادت یا مجبوری کو بیان کرتے ہیں۔

جبر کی اس آخری حد پر بھی جی لیتے ہیں لوگ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ہونٹ سی لیتے ہیں لوگ

☆☆☆

دل کی حالت کا پتہ چہروں سے تک چلتا نہیں کس سلیقہ سے غموں کا زہر پی لیتے ہیں لوگ

خواجہ شوقؔ کی ایک رباعی درج ذیل ہے جس میں انہوں نے بشر کی نادانی کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بشر کو اپنی دانائی اور علم پر ناز ہے۔ جو صحیح طور پر مخلوق کو سمجھ نہیں سکتا خالق کو کسطرح سمجھ پائیگا۔

دانائی پہ یا علم پہ مغرور رہا نادان بشر پھر بھی بدستور رہا
مخلوق برابر نہ سمجھ میں آئی خالق کا سمجھنا بہت دور رہا

خواجہ شوقؔ نے صنفِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''تجدیدِ سفر'' میں نئے سال کے تعلق سے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نہ ہوں فردا کی امیدوں کے اُجالے مدّھم شمع احساس کی لَو اور ذرا تیز کرو
وقت نے عمر کا پھر ایک ورق اُلٹا ہے نقش افکار میں پھر تازہ لہو بھرتے چلو

اک نئے عزم سے تجدیدِ سفر کرنا ہے
زیست بھی ایک سفر موت بھی ہے ایک سفر
ایک کے بعد ہمیں ایک سفر کرنا ہے

مشاعرہ سالِ نو مغل پورہ میں ۱۹۵۴ء میں منعقد ہوا تھا۔ خواجہ شوقؔ نے شاعرِ محبت و محنت مخدومؔ محی الدین کی فرمایش پر ایک نظم لکھی تھی جسکا ایک بند پیشِ خدمت ہے۔

خوشی کی آس تعارف نہ ہو کہیں غم کا کہ عمر بھر یہی دھوکہ نظر نے کھایا ہے
خوش آمدید تو کہتے ہیں ''سالِ نو'' کو مگر ہنسی لبوں پہ جب آئی تو جی بھر آیا ہے

مشاعرہ یوم آزادی آل انڈیا ریڈیو ۱۹۶۰ء میں خواجہ شوقؔ نے ''نویدِ آزادی''

کے عنوان سے نظم پڑھی تھی جسکا ایک بند جسمیں انہوں نے ایثار و قربانی کو ہر راہِ عمل کیلئے ضروری قرار دیا ہے جسکے بغیر صبحِ زندگی پانا مشکل ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اشک فشانی سے مقصد براری نہیں ہو سکتی۔ حصولِ مقصد کیلئے آنسوؤں کی نہیں لہو کی ضرورت ہے۔ بند ملاحظہ ہو

طلب کرتی ہے ہر راہِ عمل ایثار و قربانی بغیر اس کے، اندھیرے زندگی سے جا نہیں سکتے
نئی تاریخ اگر اپنے لہو سے ہم نہ لکھیں گے تو صرف آنسو بہا سکتے ہیں مقصد پا نہیں سکتے

خواجہ شوق کا شعری سفر جاری ہے۔

یوسف یکتاؔ

یوسف یکتاؔ کا نام محمد یوسف تخلص یکتا اور قلمی نام یوسف یکتا ہے۔ وہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۲۷ء کو شہر حیدرآباد کے محلہ عثمان پورہ میں پیدا ہوئے۔[1] ۱۹۴۸ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کیا انکا پہلا شعری مجموعہ ''گونگی دعا'' ۱۹۹۴ء میں اور دوسرا شعری مجموعہ ''غنچہ عطر بیز'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ یہ مجموعہ حمد، نعت، غزل، نظم اور موضوعاتی نظموں پر مشتمل ہیں۔ ان کے کلام میں شدت نہیں بلکہ سبک روی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں راست گوئی سے زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو پیش کیا ہے۔ انکے حمدیہ کلام کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

میں ہوں یکتا عاصی خستۂ جاں میں بھٹک نہ جاؤں یہاں وہاں
رہِ حق سے ہٹنے نہ پاؤں ہے یہ عرض تیری جناب میں

☆☆☆☆☆

یکتا کو بے حساب ملا جو بھی کچھ ملا — یارب تیرے کرم کی کوئی انتہا نہیں

انکی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو

تجھ کو اے دوست بہت ٹوٹ کے چاہا میں نے — تُو مرے دل مری نظروں میں رہا کرتا ہے

☆☆☆☆☆

غم دے کے خوشی لینے کو تیار نہیں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ان کا شعری سفر جاری ہے۔

---

[1] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں، مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۳ء صفحہ ۴۳۳

صاحبزادہ میر برہان علی خاں کلیم

برہان علی خاں کلیم ۲۳ر اپریل ۱۹۲۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انکے والد صاحبزادہ میر دلدار علی خاں افسر صاحب مرحوم (کالے نواب) اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۵۵ء میں بی۔اے کیا[۲] اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ یکم مئی ۱۹۸۹ء کو بہ حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری آندھراپردیش پبلک سروس کمیشن وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔[۳] شاعری کا ذوق انکو ورثہ میں ملا انکے بڑے بھائی میر حیدر علی خاں نعیم بھی اچھے شاعر تھے۔ ابتداء میں وہ اپنے بڑے بھائی نعیم کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح دکھاتے تھے۔ انکے والد کی ایماء پر نواب قادر الدین احمد تمکین سرمست سے تلمذ حاصل کیا۔ اُنکے انتقال کے بعد وہ خیرات ندیم سے رجوع ہوئے۔ ملک کے بیشتر موقر رسالوں میں انکا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ انکا پہلا شعری مجموعہ ''جھونکے شمیم سخن کے'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔[۴] انکی شاعری میں قدیم اور جدید اسلوب کا امتزاج پایا جاتا ہے اور انکی شاعری میں نئی لفظیات بھی شامل ہیں۔ ذیل میں انکے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

وفا کی راہ میں ہم وقت کی صلیبوں تک ترے قریب سے گذرے تو دور تک پہنچے

میں حق شناس ہوں یارو مجھے فریب نہ دو فریبِ زیست کے مارو مجھے فریب نہ دو

۱،۲،۳،۴ شخصی انٹرویو از میر برہان علی خاں کلیم بتاریخ ۱۶ر نومبر ۲۰۰۳ء

حمید رونق

حمید رونق کا پورا نام احمد عبدالحمید خان اور تخلص رونق ہے۔ ۳۰/ جولائی ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔۱ ان کے والد ڈاکٹر احمد عبدالوحید خاں مرحوم حیدرآباد کے پہلے بیاچ کے ڈاکٹر تھے۔ انکو نثار یار جنگ مزاج سے تلمذ حاصل تھا جو جانشین داغ دہلوی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔

۲۰/جون ۱۹۸۷ء کو انکے ۴۳ سالہ جشنِ اعتراف خدمات کا جلسہ بڑے اہتمام سے اردو گھر مغلپورہ میں منایا گیا۔۲ اسی موقع پر انکا مجموعہ کلام ''کسے سنائیں'' کی رسمِ اجراء عمل میں آئی۔

حمید رونق کی غزل گوئی میں کلاسیکل انداز ملتا ہے انہوں نے داغ اسکول کی روایات کو عصری روایات اور عصری تقاضوں کے ساتھ اپنایا۔ انکے چند اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

غم دیدہ ہوں یارانِ وطن سے بچھڑ کر ۔۔۔ اے گردشِ حالات بتا کون کہاں ہیں

کون تھا رونق رونے والا ماتم کو خود میت اٹھی

امیروں نے اسے نہ منہ لگایا ۔۔۔ غریبی پل گئی میرے مکاں میں

حمید رونق نے صنفِ غزل کے علاوہ نعت گوئی بھی کی ہے۔ وہ حج و زیارت کی نعمت سے محروم رہے چنانچہ انہوں نے ذیل کے شعر میں اسکا یوں اظہار کیا ہے۔

در پہ سرکارؐ نے نہ بلوایا ۔۔۔ آج رونق نے جان بھی دے دی

حمید رونق ۱۸/نومبر ۲۰۰۱ء کو صبح کے اولین اوقات میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔۳

۱،۲ شعری مجموعہ ''کسے سنائیں'' شاعر حمید رونق سنہ اشاعت ۱۹۹۵ء صفحہ ۸

۳ روزنامہ اخبار سیاست مورخہ ۱۹/نومبر ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر مغنی تبسم

پروفیسر مغنی تبسم کا اصلی نام محمد عبد المغنی، تخلص تبسم اور قلمی نام مغنی تبسم ہے۔ ۱۳/ جون ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔۱ انکے والد کا نام محمد عبدالغنی صاحب مرحوم ہے۔ مغنی تبسم نے جامعہ عثمانیہ سے اردو اور فارسی سے ایم۔ اے کیا اور پھر انہوں نے اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی اور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے وہ اس جامعہ کے سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔۲ انہوں نے سابق صدر حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور صدر انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مغنی تبسم صاحبِ طرز شاعر، نثر نگار اور نقاد کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں منفرد مقام کے حامل ہیں انکے دو شعری مجموعے ''پہلی کرن کا بوجھ'' ۱۹۸۰ء اور ''مٹی مٹی میرا دل'' ۱۹۹۱ء شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں اس کے علاوہ ان کی تخلیقات فانی بدایونی حیات، شخصیت اور شاعری ۱۹۶۹ء میں، فانی کی نادر تحریریں ۱۹۶۸ء میں، بازیافت (تنقید) ۱۹۶۹ء میں، ''آواز اور آدمی'' (تنقید) اور '' لفظوں سے آگے'' (تنقید) ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔۳

ڈاکٹر مغنی تبسم نے شہنشاہِ غم اور امام یاسیت کہلائے جانے والے فانی بدایونی پر بصیرت افروز مقالہ لکھ کر تحقیق کو نئی سمت عطا کی جسکی تفصیل خود انکے الفاظ میں ''زندگی بے ثبات ہے، بے ثباتی غم ہے، غم زندگی ہے، بے ثباتی موت ہے، موت زندگی ہے، غم خواہش ہے، خواہش عشق ہے، عشق فنا ہے، فنا بقا ہے، بقا زندگی ہے، زندگی عشق ہے، حسن کمال ہے، عشق نا تمام ہے، زندگی اپنی ہے''۔ اس طرح انہوں نے اپنی جدتِ فکر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے'' فانی کی شاعری سپاس نامہ مرگ اور قصیدۂ غم ہی نہیں، ترانۂ امید بھی

۳،۲،۱ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۶۸

ہے''۔ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔

دے پتہ اپنا، مجھے اپنا پتہ دے کھول دے بھید، ہر اک بھید مٹا دے

بارگاہِ یزدی میں انسان کے فانی نقش کے تعلق سے اقبال کہتے ہیں۔

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

اورڈاکٹر مغنی تبسم یہ کہتے ہیں۔

یہ عجب کھیل ہے اک نقش بنا دے اور اس نقش کو خود ہی مٹا دے

خود آگہی کے احساس کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

جاگنے کا احساس سہہ سہہ کر اپنے اندر ہی سو گیا ہوں میں

جاگنے اور سونے کے عذاب کے بعد جب شعوری کیفیت عود کر آتی ہے تو وہ کہتے ہیں۔

بس اتنی ہی اپنی کہانی آگ ہوا اور پانی

اور جب ان عناصر کا انتشار ہوتا ہے تو منکشف ہوتا ہے۔

ہم کیا اور ہمارا کیا باقی اللہ باقی فانی

مغنی تبسم نے اردو شاعری کے اصنافِ غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ مغنی تبسم کی شاعری میں روایت پرست، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ انہوں نے موضوعاتی، نثری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار نموتاً درج کیے جاتے ہیں۔

سر جھکاتا ہے کہاں تیرا مقدر ہے اگر گھر کی دیوار جدا راہ کا پتھر ہے الگ

☆☆☆☆☆

راکھ کی ڈھیر میں پوشیدہ شرر ہے کتنا اور اس آگ میں جل جانے کا ڈر ہے کتنا

☆☆☆☆☆

اک اِک پیڑ اُکھڑتا دیکھا زور جنگل میں ہوا کا دیکھا

پاس آتے ہوئے صحرا میں کہیں دور جاتا ہوا دریا دیکھا

☆☆☆☆☆

منزل ایسی کوئی نہ تھی کہ سفر ہی میں رہ گیا گھر سے نکل کے راہ گزر میں ہی رہ گیا

☆☆☆☆☆

بے سبب روٹھنا ان کا مجھے حیراں کردے　　اپنے ناکردہ گناہوں پہ پشیماں کردے

☆☆☆☆

چاند ہی نکلے کہ بادل سے کہیں تو نکلے　　برق چمکی تو عجب آس کے پہلو نکلے
پھر ہوئی شام جلے دُور کی یادوں کے چراغ　　پھر ڈھلی رات ستاروں کے بھی آنسو نکلے
آبگینے کے ادھر بابِ طلسمات کھلا　　غم کے صحرا میں تری یاد کے آہو نکلے

☆☆☆☆

سرِ اُفق سے نظر لوٹ کر نہیں آئی　　وہ جا چکا تھا مگر انتظار کیسا تھا
برس رہی تھی جہنم کی آگ صحرا میں　　مگر وہ ایک شجر سایہ دار کیسا تھا

مغنی تبسم کی ایک موضوعاتی نثری نظم ''آخری شام'' ملاحظہ ہو۔

اب کوئی رات نہیں آئے گی
خواب ٹوٹے ہوئے لفظوں کے بکھر جائیں گے
نام آنکھوں میں ٹھہر جائیں گے
کوئی آواز نہ آئے گی نظر
کوئی چہرہ نہ سنائی دے گا
دشت قدموں کو نہیں پائیں گے
راستے لوٹ کے آجائیں گے
تو مری یاد سے آہستہ گزر

مغنی تبسم کا شعری سفر جاری ہے۔

……☆☆☆☆……

بشیر امجد

بشیر امجد کا نام محمد بشیر الدین احمد تخلص امجد اور قلمی نام بشیر امجد ہے۔ وہ ریاست حیدرآباد کے ضلع محبوب نگر کے موضع آلور میں ۵/ڈسمبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری کا ذوق انہیں بچپن سے تھا۔ انکے کلام میں سلاست، انداز میں انفرادیت، لطافت، سوزوگداز اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے غزل میں طبع آزمائی کی ہے اور نعتِ شریف لکھنے کی بھی سعادت حاصل کی ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ''رنگِ حیات'' ۱۹۸۹ء میں ''تصویرِ حیات'' ۱۹۹۳ء میں ''آئینہ حیات'' ۱۹۹۵ء اور ''سازِ حیات'' ۱۹۹۹ء۔ انکے شعری مجموعے آئینہ حیات اور سازِ حیات کو اردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے ایوارڈ سے نوازا۔[۲] ڈاکٹر علی احمد جلیلی انکی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں کہ وہ مروجہ سیدھی سادھی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ انکی شاعری سازِ دل کی آواز ہے۔ انکی غزلیں پُرکیف ماحول میں سانس لیتی ہیں جن میں تبسمِ لطیف بھی ہے اور نالہ دلگداز بھی ہے۔ انکے چند اشعار نموناً درج ذیل ہیں۔

غم کے ماروں سے ذرا پوچھے کوئی　　　وہ نہ آئے بزم میں تو کیا ہوا

☆☆☆☆

تیری زلفِ پریشاں دیکھنا ہے　　　کہ آئینہ کو حیراں دیکھنا ہے

بشیر امجد حیدرآباد میں ۲۳/جنوری ۲۰۰۶ء کو انتقال کر گئے۔

۲۔ آندھراپردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں، مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۳ء صفحہ ۷۶

راشد آزر

حیدرآباد کے مشہور انگریزی کے پروفیسر حسین علیخاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے راشد آزر ہیں انکی والدہ معصومہ بیگم صاحبہ ممتاز سماجی کارکن تھیں جو آندھراپردیش اسمبلی کی رکن اور منسٹر سوشیل ویلفیئر بھی رہ چکی ہیں۔ راشد آزر کا پورا نام مرزا راشد علیخاں ہے انکی تاریخ پیدائش ۳۱ ؍ اگست ۱۹۳۱ء ہے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے گرایجویشن کیا اور ۱۹۵۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی ۱۹۶۳ء میں انہوں نے بی۔ ایڈ کیا اور پیشۂ تدریس سے ۱۹۶۰ء میں وابستہ ہوگئے اور ۱۹۵۰ء میں انجمن ترقی مصنفین سے وابستہ رہے ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''نقشِ آزر'' ۱۹۶۳ء ''صدائے تیشہ'' ۱۹۷۲ء ''آبدیدہ'' ۱۹۷۴ء ''خاکِ انا'' ۱۹۷۹ء ''جمع و خرچِ وفا'' ۱۹۹۰ء، ''منزلِ شوق'' (رباعیات) ۱۹۹۲ء ''زخموں کی زبان'' ۱۹۹۲ء اور ''اندوختہ'' ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ آندھراپردیش' اترپردیش اور بہار کی اردو اکیڈیمیوں نے بیشتر شعری مجموعوں پر انعامات سے بھی نوازا۔ حیدرآباد یونیورسٹی میں ۱۹۸۸ء پوئیٹ آن دی کیمپس کا عہدہ قایم کیا گیا تو اس سلسلہ کے آغاز کے لیے راشد آزر کو منتخب کیا گیا تھا۔[۱]

راشد آزر شاعری اور شاعر کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر کا یوں اظہار کرتے ہیں'' شاعر کا منصب اپنے اور آنے والے زمانے کے لیے زندگی اور جذبات کی تاریخ پورے تنوع کے ساتھ پیش کرنا ہے''۔ اس طرح انہوں نے ان جملوں میں دو باتیں بیان کی ہیں'' ایک تو یہ کہ شاعری کی تجریک، خارجی اور داخلی حقائق کے مابین پیدا ہونے والی جذباتی ردِعمل سے ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ شاعری اس ردِعمل سے پیدا ہونے والی جذباتی

۱۔ ''شاداب'' کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء صفحہ نمبر ۱۲

کیفیت کا منظوم اظہار ہے''۔ بنیادی طور پر راشد آزر مارکسی فلسفہ سے متاثر ہیں اور ان کے نزدیک یہ فلسفہ اتنی اہمیت رکھتا ہے، جتنا کہ سانس لینا۔

راشد آزر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں اور انکے کلام میں غزلیں' رباعیاں' منظوم ڈرامے، معریٰ نظمیں اور آزاد نظمیں ملتی ہیں۔ فلسفیانہ اور موضوعاتی نظمیں بھی اُنکے ہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ انکے کلام میں اُن حوادث کا' جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں عکس نمایاں نظر آتا ہے ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انکے عشق میں سادگی' سچائی اور خلوص ہے لیکن آغاز ہی میں انکی محبت ناکامی اور نامحرومی کا شکار ہو جاتی ہے جسکی وجہ معشوق کی بے وفائی نہیں بلکہ انکے اظہارِ محبت میں حد درجہ احتیاط یا اظہار میں جرات مندی کی کمی ہے جسکی وجہ سے انکا عشق ایک طرفہ ہو جاتا ہے اور ناکامی مقدر ہو جاتی ہے۔ ایسے عشق میں تقدس اس حد تک پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو ہم درویشانہ عشق کہہ سکتے ہیں ایسی ہی کیفیت سے سرتاجِ شعراء میر تقی میر بھی گذرے ہیں جس کو انہوں نے اپنے شعر میں یوں کہا ہے۔

احتیاطِ عشق میں کٹ گئی عمر　　　ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

آیئے اب راشد آزر کی داستانِ عشق میں ناکامی کے صدمۂ جانکاہ کو ان کے اشعار میں دیکھیں۔

ہر ایک گام پہ میں تم کو یاد کرتا تھا　　　مگر بتا نہ سکا تم سے پیار کرتا ہوں
میں پوجتا تھا تمھیں پھر بھی تم سے کہہ نہ سکا　　　تمھاری شرم سے بوجھل نظر پہ مرتا ہوں

اس ناکامی کے بعد نظرِ انتخاب ایک جگہ جم جاتی ہے اور وہ محبوبہ اِن کی بیوی کی حیثیت سے ان کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اس خوشگوار واقعہ سے راشد آزر مسرور ہیں اور اپنی انبساطی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

تمھارے پیار کے پھولوں سے بھر لیا دامن　　　مجھے حیات سے اب اور کچھ نہیں لینا

ایک شاعر نے کہا ہے۔

بڑی جان لیوا ہیں ماضی کی یادیں　　　بھلانے کو جی بھی نہیں چاہتا ہے

یہی حال اور کیفیت سے راشد آزر گزرتے ہیں جب بھی ماضی کی یادوں کی

چنگاریاں شعلہ بنتی ہیں وہ عالمِ اضطراب میں اپنی سابقہ محبتوں کو یاد کر کے کہتے ہیں ۔

میری وہ گرمئی گفتار مجھے لوٹا دو میرے وعدے مرا ہر پیار مجھے لوٹا دو

غمِ جاناں کے بعد وہ غمِ روزگار کا شکار نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

آٹے دال کے بھاؤ میں پھنس کر عشق بھی کرنا بھول گیا ہوں

☆☆☆☆

تم کو جو امید تھی مجھ سے اب اس کو تم بھول بھی جاؤ

علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

زندگی میں مسلسل اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ محبوبہ کا قرب حاصل ہونے کے بعد راشد آزر کو وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہوتا ہے۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے بھی اپنی ایک رباعی میں اسکا یوں اظہار کیا ہے۔

اے عمرِ رواں کی رات آہستہ گذر اے قافلۂ حیات آہستہ گذر

اک شئے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ اے ناظرِ کائنات آہستہ گذر

چنانچہ راشد آزر کو یہ خوف ہے کہ زندگی میں کہیں ایسی نہ رات آئے

تمھاری بانہوں میں ٹھنڈک ہو آبشاروں کی مری رگوں میں لہو برف بن کے جم جائے

امید و بیم کے اس مرحلہ سے گزر رہے تھے ایک نئی اُفتاد آن پڑتی ہے ان کی رفیقِ حیات زندگی کے دوراہے پر انکا ساتھ چھوڑ دیتی ہے موت کے بے رحم ہاتھ اس کو راشد آزر سے ہمیشہ کے لیے چھین لیتے ہیں اُس صدمہ کا انہوں نے آزاد نظم میں اظہار کیا ہے۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

تم ایک پل کے واسطے
مری حیات میں کچھ اس طرح سے آئیں اور پھر
چلی گئیں
کہ جیسے برق ایک پل کو کوندنے کے بعد اک
اندھیرے گھر میں کوئی آنکھ
بند کر کے ایک لمحہ

روشنی کو دیکھ لے

اس مختصر عرصۂ وصال کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

کچھ اس قدر رہے مصروفِ جہد ہم دونوں	کہ ہم کو فرصتِ گفت و شنید بھی نہ ملی

وقت ہر صدمہ کی شدت کو رفتہ رفتہ کم کر دیتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید لوگوں کے سینے غم سے پھٹ جاتے۔ وقت میں مرہم کا اثر ہے وہ زخموں کو مندمل کر دیتا ہے شاید ایسا ہی کچھ راشد آزر کے ساتھ بھی ہوا کوئی ان کی زندگی کے دروازہ پر دستک دیا۔ خواہشیں بیدار ہوئیں محبت کا چراغ روشن ہونا چاہتا تھا لیکن محبوبہ کے قدم عشق کی راہ میں ڈگمگا گئے اور خواب چکنا چور ہو گئے۔ اس بڑھتی ہوئی عمر میں اس گھاؤ کی تکلیف کا احساس شدید ہوتا ہے جس کو انہوں نے یوں کہا ہے ۔

اگر قصور ہے مرا تو بس یہی کہ تمھیں	کھلی کتاب کی مانند پڑھ لیا میں نے

نہ اب تو کوئی گلہ ہے نہ کوئی پچھتاوا	نہ دل میں کوئی کسک ہے نہ اشک آنکھوں میں

ذیل میں راشد آزر کے چند منتخب اشعار نمونتاً درج کیے جاتے ہیں ۔

آزر اگر وقارِ صداقت کی بات ہے	اعلانِ حق وہ ہے جو سرِ دار ہو گیا

☆☆☆☆☆

وقت کا فاصلہ کیا کیا نہ غضب ڈھائے ہے	کل جو اپنا تھا وہ بیگانہ نظر آئے ہے

☆☆☆☆☆

زخم بھر جائیں مگر دل میں کسک رہ جائے	آزر ایسے ہی خیالوں سے دہل جائے ہے

☆☆☆☆☆

گونجتی ہیں تری سرگوشیاں سناٹے میں	زیرِ لب تو نے مرا نام لیا ہو جیسے

☆☆☆☆☆

میں نے تو ٹوٹ کے چاہا ہے تمھیں	تم مرے پیار کو رسوا نہ کرو

☆☆☆☆☆

ہر ایک لمحہ خوشی کا ادھار لیتے ہیں	گزرتی کب ہے ہماری' گزار لیتے ہیں

ترے غیاب میں تجھ سے ترا گلہ کر کے	ہم اپنے دل کا ہر اک بوجھ اتار لیتے ہیں

اردو اصنافِ سخن میں رباعی نسبتاً مشکل صنف ہے۔ رباعی عربی لفظ ربع سے

مشتق ہے لیکن اس صنف میں فارسی ادب میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر عمرِ خیام مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے لیکن ان کی شہرت رباعی گوئی سے بامِ عروج پر پہنچی۔ اردو ادب میں اور اصنافِ سخن کی طرح سرزمینِ دکن کو یہ افتخار حاصل ہے کہ رباعی گوئی کی ابتداء کا سہرا بھی دکنی شعراء کے سر ہے چنانچہ محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، علی عادل شاہ شاہی، نصرتی، ولی اور سراج کو قدیم رباعی گو شعراء کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ رباعی گو مزید شعراء میں انیس، حالی، اکبر، رواں، امجد، یگانہ، جوش، اور فراق قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان سب میں حضرت امجد حیدرآبادی منفرد مقام کے حامل ہیں۔ ابتداً رباعیات کو صوفی حضرات نے رُشد و ہدایات کے لئے استعمال کیا لیکن اب رباعی مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، راشد آزر نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔

رباعی کیلئے بحرِ حزج مخصوص ہے جسکے چوبیس مروجہ اوزان ہیں جن میں بارہ مفعول سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ مفعولن سے۔ راشد آزر کا مجموعہ کلام "منزلِ شوق" جو ۲۰۰ رباعیات پر مشتمل ہے ۱۹۹۲ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آیا ہے۔ راشد آزر نے ان رباعیات میں سارے مروجہ ۲۴ اوزان کا استعمال کیا ہے۔ بعض اوزان زیادہ ہیں اس لیے زیادہ مانوس اور مقبول ہیں اور بعض کم رواں ہیں اس لیے کم مانوس بھی۔ ذیل میں ان کی چند رباعیات بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

خوشبو کبھی پھولوں میں سمٹ کر نہ رہی ندّی کبھی دریاؤں سے کٹ کر نہ رہی
جوہر کا تسلسل ہے یہ مٹنا، بننا خانوں میں کبھی حیات بٹ کر نہ رہی

☆☆☆☆☆

دامن کا گریباں سے رشتہ کیا ہے اِس سانس کا اِس جان سے رشتہ کیا ہے
در، یوں تو کھلا سب کے لیے ہے، لیکن گھر کا کسی مہمان سے رشتہ کیا ہے

☆☆☆☆☆

دستک مرے ہاتھوں میں چُھپی ہے دیکھو آنکھوں کے کناروں پہ نمی ہے دیکھو
شیشوں سے دریچے کے نہ جھانکو چھپ کر دروازے پہ اُمید کھڑی ہے دیکھو

☆☆☆☆☆

دل ہے تو کبھی درد بھی ہوگا دل میں تُو ہے تو ترا حسن بھی ہے محفل میں

قاتل ہے تو خوں ہوگا سرِ دامن پر　　خنجر بھی چھپا ہوگا کفِ قاتل میں

☆☆☆☆☆

عاشق کے بھی کچھ ناز ہوا کرتے ہیں　　وحشت کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں
آنکھوں ہی میں رہتیں نہیں دل کی باتیں　　سینے میں بھی راز ہوا کرتے ہیں

اشتراکی تحریک کے زور پکڑنے کے بعد جب سُرخ سویرا نمودار ہوا تو اُسکے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کا بھی آغاز ہوا۔ ترقی پسند شعراء اپنی شاعری میں انقلابی پیغام کو عام کرنے لگے جو پروپگنڈہ کی شکل اختیار کرگیا۔ شاعری میں اچھی خاصی نعرہ بازی ہونے لگی۔ ادب میں اگر صرف پروپگنڈہ مقصد ہو تو ادب اسکا متحمل نہیں ہوسکتا۔ پیغام رسانی کے مقصد کے ساتھ ساتھ ادب کے تقاضوں کی بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کمیونزم کے جوش کے خاتمہ کے ساتھ ترقی پسند تحریک بھی زوال پذیر ہوگئی۔ لیکن ایسا ادب اور ایسی شاعری جسمیں ادب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا تھا جسمیں صرف پروپگنڈہ بازی مقصد نہیں تھا محفوظ رہ گئے۔ چنانچہ ساحرؔ، فیضؔ، مجروحؔ، کیفیؔ، مخدومؔ وغیرہ وہ شاعر ہیں جنکی شاعری میں داخلی اور خارجی تجربات کا اظہار ہوتا تھا باقی ہیں اور اردو ادب میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ایسے ہی شعراء میں راشد آزرؔ بھی شامل ہیں۔

قرضِ جاں (شعری مجموعہ) راشد آزرؔ کا نواں مجموعہ کلام ہے جسمیں نظموں کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں غزلیں بھی شامل ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ راشد آزرؔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے متاثر ہوتے ہوئے بھی روایات سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اُنکی نظموں میں خارجی تجربات اور ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے وہیں انکی غزلیں داخلیت، وارداتِ قلبی اور جذبات و احساسات کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ انکی غزلوں میں روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ مضامین کی تازگی بھی ملتی ہے۔ اُنکی غزلوں کے دو شعر نمونتاً درج ذیل ہیں۔

رخسار بھبک اٹھتے ہیں اشکوں کی تری سے　　پھولوں پہ نکھار آتا ہے شبنم کی نمی سے

☆☆☆☆☆

رات بھر اس کا افسانہ لکھ کر ہم　　اتنا روئے سب کتابت بہہ گئی

راشد آزرؔ کا شعری سفر جاری ہے۔

شاذ تمکنت

شاذ تمکنت کا نام سید مصلح الدین اور شاذ ان کا تخلص تھا۔ شاذ تمکنت ۳۱ رجنوری ۱۹۳۳ء بروزِ منگل حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱؎ ۱۹۴۱ء میں انہیں نامپلی ہائی اسکول میں شریک کروایا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے میٹرک کامیاب کیا اور سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کیلئے شریک کروایا گیا اُسی سال انکی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ ۲؎ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے اپنی والدہ کی یاد میں پہلی نظم کہی۔ ۳؎ ۱۹۵۵ء میں سیف آباد سائنس کالج میں انکو عارضی ملازمت ملی اور انہوں نے حیدرآباد ایوینگ کالج میں اعلیٰ تعلیم کیلئے داخلہ لیا اور ۱۹۵۹ء میں بی۔اے کامیاب کیا۔ اسی سال انکی شادی محمدی بیگم بنتِ حافظ حسن محی الدین صاحب سے ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے سرینگر ریڈیو کے زیرِ اہتمام کل ہند مشاعرہ میں شرکت کی۔ ۴؎ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ملازمت ترک کر کے ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں بہ درجہ اول ایم۔اے میں کامیابی حاصل کی۔ ۵؎ اس کے بعد یونیورسٹی آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل میں بحیثیت لکچرار انکا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۶۳ء میں انکی ورنگل کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور انکو بحیثیت لکچرار بدروکا کالج آف کامرس میں زبانِ زائد اردو پڑھانے کیلئے مقرر کیا گیا۔ ۶؎ ۱۹۶۶ء میں انکے پہلے شعری مجموعہ ''تراشیدہ'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۷؎ ۱۹۶۷ء میں انوار العلوم کالج حیدرآباد میں بحیثیت لکچرار انکا تقرر عمل میں آیا۔ ۸؎ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۳ء وہ پونا کالج میں اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کارگزار رہے اور وہاں پر جشنِ شاذ کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ ۹؎ ۱۹۷۷ء میں شعبۂ اردو

۱؎ امجد سے شاذ تک دکن کے نمائندہ شعراء کا تعارف اور کلام انتخاب پیش کش ''سیاست'' ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۵۸

۲؎، ۳؎ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے ۱۹۸۶ء صفحہ ۸ ۴؎، ۵؎ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے ۱۹۸۶ء صفحہ ۹

۶؎، ۷؎، ۸؎، ۹؎ " " " " " " صفحہ ۱۰

جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت ریڈر انکا تقرر عمل میں آیا۔ ۱؎ اسی سال انکے دوسرے شعری مجموعہ ''نیم خواب'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۲؎ ۱۹۸۱ء میں ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''ورقِ انتخاب'' ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہوا۔ ۳؎ جو دراصل اُنکے اُس وقت تک کے کلام کا انتخاب تھا شاذ تمکنت کو ہندوستان کے تمام اہم مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں شرکت کی۔ اُنکے لکھے ہوئے منظوم فیچرس بھی ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوئے۔

۱۹۸۳ء میں انہوں نے مخدوم محی الدین کی حیات اور کارناموں پر مقالہ لکھا جس پر انکو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ ۴؎ ۱۹۸۱ء سے انکی علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یرقان اور جگر کا عارضہ لاحق ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۸/اگسٹ ۱۹۸۵ء کو شاذ تمکنت نے اسرئی دواخانہ مغل پورہ میں زندگی کی آخری سانس لی۔ درگاہِ یوسفینؒ ناملی حیدرآباد کے احاطہ میں انکی تدفین عمل میں آئی۔ ۵؎

شاذ تمکنت کے پسندیدہ شعراء میر، غالب، مومن، سودا، مصحفی، داغ، انیس، حالی، جوش، فراق، جگر، یگانہ، حسرت، فیض، احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید عدم، ابن انشاء، اختر الایمان، ناصر کاظمی اور احمد فراز ہیں۔ ۶؎ ان کے پسندیدہ ادیب کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ ۷؎ مشتاق احمد یوسفی ان کے محبوب مزاح نگار تھے۔ ۸؎ ۱۹۷۷ء میں شعری مجموعہ ''نیم خواب'' پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کو انعام سے نوازا۔ ۹؎ ۱۹۷۹ء میں آل انڈیا میر اکیڈیمی لکھنؤ نے میر ایوارڈ عطا کیا۔ ۱۹۸۵ء میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انہیں بعد از مرگ ایوارڈ عطا کیا اور ۱۹۸۶ء میں اردو فورم جدہ نے انکو ادبی ایوارڈ بعد از مرگ پیش کیا۔ ۹؎

شاذ تمکنت کی شاعری میں تخیل کی بلندی، پرشکوہ الفاظ اور مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ بیان ملتا ہے جس کے سبب اردو شاعری میں وہ ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ فراق نے جس روایت کی ابتداء کی شاذ تمکنت نے اسکو مکمل کیا۔ ان کے ہاں موضوعاتی نظموں کا

۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۰

۵؎ امجد سے شاذ تک دکن کے نمائندے شعراء کا تعارف اور کلام انتخاب پیش کش ''سیاست'' ۱۹۸۸ء صفحہ ۸

۶؎ ۷؎ ۸؎ ۹؎ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۲

بھی کافی ذخیرہ ہے۔ ان کے عہد میں ان کے ہم عصر شعراء اریبؔ، شاہدؔ، مخدومؔ اور وجدؔ آسمانِ شاعری پر دمکتے ستارے بن کر جگمگا رہے تھے۔ شاذؔ تمکنت کی مناجات ''کب تک میرے مولیٰ'' کو ہندوستان کے مشہور قوال پدم شری عزیز احمد خاں وارثی نے گایا تھا جو برصغیر میں بڑی مقبول ہوئی، محافل سماع میں سامعین بڑے ذوق اور شوق سے ''مناجات'' سنتے ہیں اور ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ انکی ایک اور نظم ''موج و ساحل سے ملو'' کو برصغیر کے مشہور فنکاروں نے گایا جسکو برصغیر میں سند قبولیت حاصل ہوئی۔

شاذؔ تمکنت کی شاعری کا دور اُس وقت شروع ہوا جب کہ ترقی پسند تحریک دم توڑ رہی تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں ترقی پسند تحریک نے اپنے چہرے پر انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی نقاب اوڑلی تھی۔ شاذؔ تمکنت کی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی ضرور رہی ہے لیکن انہوں نے ترقی پسند تحریک کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے روایتی شاعری کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اپنے عہد کے مشہور شعراء جوشؔ اور فراقؔ سے اکتساب کیا اِسطرح انہوں نے انفرادی اسلوب میں شاعری شروع کی۔ انہوں نے اپنے پہلے مجموعے کلام ''تراشیدہ'' میں اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کی ہے۔

''میں نے غمِ ذات اور غمِ کائنات کو علحدہ علحدہ خانوں میں نہیں بانٹا بلکہ میری دانست میں غمِ ذات عبارت ہوتا ہے غمِ کائنات سے۔ ایک فرد کا غم اسکا اپنا ہوتے ہوئے بھی در پردہ افراد کے دُکھ سُکھ کی ترجمانی کرتا ہے۔ کائنات کے خارجی موضوعات بھی اس وقت تک کامیاب شعر کا جامہ نہیں پہن پاتے جب تک کہ اُس میں شخصیت کا غمِ ذات کا پُٹ نہ ہو۔۔۔۔ میں شعر کسی پیغام کی خاطر یا درس دینے کیلئے نہیں کہتا۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ شعر ہو یا افسانہ اول اول فنکار اپنی تسکین کیلئے، اپنی اَنا کو سکون بخشنے کی خاطر تخلیق کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ متاعِ ہنر آخر آخر اتنی دل پذیر ہو جائے کہ شاعر اپنے پر اہلِ دہر کا قیاس کرے''

شاذ تمکنت ابتداء میں ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے ابھرے لیکن ادبی حلقوں میں اپنے منفرد اسلوب اور لہجہ کی وجہ سے منفرد غزل گو کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالی۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں میں انہوں نے اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کی پیکر تراشی سلیقہ سے کی ہے۔ پیکر تراشی کیلئے انہوں نے تشبیہات کو بڑے دلکش انداز میں برتا

ہے۔ اُنہوں نے جو تشبیہات استعمال کی ہیں اُن میں ان پیکروں کے اوصاف کو بھی شامل کیا ہے ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔

لب بستہ فسردہ چاندنی میں میدان کے سلگتے حاشیے پر
اک اونگھتے مقبرہ کے اندر آنسو کا چراغ جل رہا ہے

☆☆☆☆☆

جب کرن آتی ہے پابوسیِ شبنم کے لئے جگمگا اٹھتے ہیں وجدان کی طاقوں کے دیے

اُنہوں نے شاعرِ محنت و محبت مخدوم محی الدین کی یاد میں ایک نظم لکھی ہے جو اپنے طرز کا بے مثال مرثیہ ہے جسکے چند اشعار ذیل میں بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

تو فرد کب تھا، بزم تھا، کائنات تیرے ساتھ تھی،
زمانہ تیرے ساتھ تھا، کائنات تیرے ساتھ تھی
زیان کے سود، سود کے زیاں کی داستاں تری
وہ سیر چشمیاں تری
وہ محفلیں، وہ رت جگے، وہ جشنِ مئے وہ قہقہے
وہ یار باشیاں تری
تکلمِ شگفتہ و تبسمِ نگاہ میں
وہ دل نوازیاں تری
نہیں کہ آج دوسرا کوئی نہیں ہے دہر میں
سحر کیساتھ یہ خلش کہ تو نہیں ہے شہر میں

انہوں نے اپنی عشقیہ نظموں میں فراق و وصال کی کیفیات کو دلگداز لہجہ میں رقم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے محبوب کے سراپا کی تصویر کشی میں دلکش تشبیہات کا استعمال کیا ہے

آنسو کی دُھند، یاد کے جگنو، طویل سونچ بیتے ہوئے دِنوں کی جھلک یاد آگئی
پیماں کی بیلیں پاؤں سے آکر لپٹ گئیں وعدوں کے پھول، بن کی مہک یاد آگئی

شاذ تمکنت کی غزلوں کے وہ اشعار جن میں اُنہوں نے ہجر و فراق کی

کیفیات کو بیان کیا ہے انتہائی دل گداز ہیں انکی غزل کے چند دردانگیز اشعار ملاحظہ ہوں۔

جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بارِ دگر روشنی آنکھوں کی بہہ جائے گی آنسو بن کر
رورہا ہوں کہ تیرے ساتھ ہنسا تھا برسوں ہنس رہا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدۂ تر
میں نے ہر رات یہی سوچ کے آنسو پونچھے منہ دکھانا بھی ہے دُنیا کو بہ ہنگامِ سحر

چند متفرق اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے انتہائی دردانگیز انداز میں ہجر وفراق کی کیفیات کو شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔

وہ لوگ جو تجھے ہر روز دیکھتے ہوں گے اُنہیں خبر نہیں کیا شئے ہے حسرتِ دیدار

☆☆☆☆

شب وروز جیسے ٹھہر گئے کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے ترے ہجر میں یہ پتا چلا مری عمر کتنی دراز ہے

☆☆☆☆

آج کھولا تھا درِ خانۂ دل ایک بھی چیز سلامت نہ ملی

ہجر وفراق کے علاوہ معاملاتِ عشق کو بھی انہوں نے نہایت نزاکت کیساتھ شعری سانچے میں ڈھالا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ایک رات آپ نے امید پہ کیا رکھا ہے آج تک ہم نے چراغوں کو جلا رکھا ہے

☆☆☆☆

روزِ وحشت کا تقاضہ ہے کہ صحرا کو چلیں روز اپنے آپ کو زنجیر پہناتے ہیں ہم

☆☆☆☆

پیاسا ہوں ریگ زار میں دریا دکھائی دے جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

شاذ تمکنت کو نعت گوئی کی سعادت بھی حاصل ہے انکے دو نعتیہ اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے انکی عقیدت اور حضورؐ سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

سچ ہے تمہارا سایۂ پیکر نہ تھا مگر ہم سر برہنہ ہیں کب کہ سایہ تم ہی تو ہو
روضہ کی دید اپنی تمنائے بندگی بندوں کی کیا خدا کی تمنا تم ہی تو ہو

مختلف اکابر شعراء نے عشق کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کیا ہے جنابِ میر کا عشق درویشانہ اور شاذ کا عشق شریفانہ ہے۔ ذیل کے شعر میں وہ اپنے محبوب کو باور کراتے

ہیں کہ وہ خود اُس کے جی سے اُتر جائیں گے اس طرح ان کے محبوب کو کسی رسوائی کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔

اس نزاکت سے تیرے جی سے اُتر جاؤں گا   جس طرح تیرے بدن سے تیرا زیور اُترے

ذیل کے شعر میں شاذ اپنے محبوب کو آگاہ کرتے ہیں کہ انکا وجود انکے محبوب کیلئے بڑی اہمیت کا حامل ہے اگر وہ حسبِ ضرورت اُسکی رہبری نہ کر پائیں تو اُسکو نا قابلِ تلافی نقصانات کا سامنا ہو سکتا ہے۔

میں تیری راہ کا پتھر سہی یہ بات تو سُن   آگے کھائی ہے اگر راہ کا پتھر ہٹ جائے

شاذ تمکنت کی شاعری کے تعلق سے مشاہیر ادب کی رائے ملاحظہ ہو۔ فراق گورکھپوری ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں ''شاذ تمکنت، ہندوستان کے جواں سال و جواں فکر شاعر ہیں۔ انکی غزلیں اور نظمیں مشہور رسالوں میں شائع ہو کر ملک کے اہلِ نظر کو متوجہ کر چکی ہیں، انکی شاعری کا خاص جوہر خلوصِ طبیعت و جدت فکر ہے۔ انکے بیان میں تازگی اور لہجے میں گھلاوٹ ہے۔ انکے شعر لمسیات وحسیات کی کیفیتوں سے مملو ہیں۔

انکی لفظیات کی مہک دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ رنگ وصوت کا یہ خوشگوار امتزاج انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ ابھی انکی عمر نسبتاً کم ہے، لیکن انکی شاعری کے آثار ہونہار ہیں۔ مجھے یقین ہے، آگے چل کر جو ادبی سرمایہ وہ ہمیں دیں گے وہ نا قابلِ فراموش ہوگا۔ انکا اب تک کا کلام بھی نہایت بیش قیمت ہے''

مخدوم محی الدین نے ۱۹۶۶ء میں انکے تعلق سے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے ''شاذ تمکنت اردو کے ان چند نوجوان شاعروں میں سے ہے، جس نے پچھلے دس بارہ برس کے اندر اپنی غزلوں اور نظموں کی جدت اور ندرت کی وجہ سے ادبی دنیا میں نام اور مقام پیدا کر لیا ہے۔

شاذ کے کلام کی دلکشی کا راز اُسکی قدیم روایتوں سے وابستگی اور نئے تجربوں کی جستجو سے ہم آہنگی میں ملتا ہے۔ شاذ ایک دردمند اور پُر تکلف فنکار ہے، جو نئی خوبصورت مگر بھاری ترکیبیں بنانے کے ساتھ ساتھ سہل اور سہانے الفاظ کو مصرعوں میں جوڑنے کا شائق ہے۔ حسین الفاظ کا انتخاب زندگی کے حُسن سے شیفتگی کی غمازی کرتا ہے اور کلام کو ہنس مکھ چہرہ عطا کرتا ہے۔

شاذ کوئی مردم بیزار شاعر نہیں۔ اُسے زندگی سے عشق ہے، اسی عشق نے اسکے دل کو درد مند اور شعر کو مہذب بنا دیا ہے۔ اُسکا درد اُسکا احساسِ تنہائی کلبیّت کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا اُسکا درد ''نئی نسل'' کا درد ہے جو کچھ مادّی کچھ رومانی اور کچھ ذہنی ہے، یہ درد نیا بھی نہیں۔ شاذ واعظ ہے نہ طبیب، وہ تو ایک عاشق ہے جو مشتاق آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا اور درد مند دل سے محسوس کرتا۔۔۔۔۔۔ احساس اور جذبہ کو نقش اور نغمہ کی شکل میں دنیا کو واپس کرتا چلا جا رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ دنیا شاذ کی مناسب قدر کریگی''

۱۹۷۳ء میں اختر الایمان نے شاذ کے تعلق سے لکھا ہے'' پچھلے بیس برس میں اردو شاعری میں جو نئے نام آئے ہیں ان میں شاذ تمکنت کا نام بہت اہم ہے۔ شاذ کی شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے، لفظوں کا استعمال، تشبیہات اور موضوع کے ساتھ لفظوں کی ہم آہنگی کے علاوہ انکی غنائیت اور غنائیت میں فکر کا عنصر جو نعرہ نہیں، انکی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہ خوبی نظموں ہی میں نہیں بلکہ انکی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ان دونوں اصناف پر انہیں جو قدرت حاصل ہے انکے معاصرین میں خال خال ہی کوئی اس خوبی کا حامل ہے، یہی خوبی انہیں اپنے معاصرین سے الگ بھی کرتی ہے اور ممیّز بھی۔ انکی شاعری یقیناً اردو شاعری کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔''

علی سردار جعفری نے شاذ کے تعلق سے اپنی منظوم رائے پیش کی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

شاذ اک جوالہ تھا
پیکرِ عشق و جنوں، حُسن کا متوالا تھا
اس کی آواز میں پھولوں کی مہک
رنگِ بہاراں کی تپش
خارِ مغیلاں کی خلش
محفلِ درد میں آیا تو غزل خواں آیا
زُلفِ محبوب کے مانند پریشاں آیا

غمِ انساں سے گریزاں آیا
وہ نہیں اس کی غزل باقی ہے
پرتوِ صبحِ ازل باقی ہے

شاذؔ تمکنت نے غالبؔ اور اقبالؔ کی غزلوں کی تضمین اس عمدگی سے لکھی ہیں کہ یہ تضمین اصل غزلوں کا جُز معلوم ہوتی ہیں۔ ذیل میں تضمین بر غزلِ غالبؔ کے دو بند نموتاً درج کیے جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں شاذؔ کہ ہے دیدہ ور اسدؔ — مانا کہ خوار وخستہ ہے بے بال و پر اسدؔ
گو ہے رہینِ گردشِ شام و سحر اسدؔ — "بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

☆☆☆☆☆

اب بھلا کیا ذکر کیجئے کیا رہا کیا جل گیا — ہائے کیا کیا ساز و برگِ عیشِ رفتہ جل گیا
صورتوں کا ذکر کیا آئینہ خانہ جل گیا — "دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا"

تضمین بر غزلِ اقبالؔ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

طلوعِ جلوہ پسِ اوجِ بام ہے شاید — مئے کشیدۂ لمحاتِ خام ہے شاید
مسافتِ بشری چند گام ہے شاید — "یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں"

شاذؔ تمکنت لفظوں کے انتخاب اور تراکیب کے وضع کرنے اور انکے استعمال کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عکس ہر منظرِ جاں تاب اُتارا میں نے — یوں نکھارا ترے فانوس کی دیوار کا رنگ

☆☆☆☆☆

رفعتِ فکر کی منزل پہ پہنچ کر اکثر — کتنے نادیدہ جہانوں کو صدا دی میں نے
کتنے نوخیز عناصر کو بہ عنوانِ نمو — اپنے افکار کے دامن کی ہوا دی میں نے

رئیس اختر

رئیس اختر کا اصل نام رئیس احمد خان ہے انکا تخلص رئیس اور قلمی نام رئیس اختر ہے۔ رئیس اختر ۲۶ رجون ۱۹۳۳ء کو سابقہ ریاست حیدرآباد کے ضلع بیدر میں پیدا ہوئے انکے والد کا نام غلام نبی خان صاحب تھا۔ انہوں نے چادر گھاٹ کالج سے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء انٹر میڈیٹ تکمیل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے فائنل تک ان کا سلسلہ تعلیم جاری رہا۔[۱] پھر وہ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے اور آندھراپردیش ہاؤزنگ بورڈ حیدرآباد میں بحیثیت انسپکٹر کام کرتے ہوئے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ابتداء ہی سے وہ علمی اور ادبی اداروں سے وابستہ رہے۔ انکے شعری مجموعے ''آئینۂ دل'' ۱۹۷۹ء، ''اشکوں کے پھول'' ۱۹۹۴ء اور ''روحِ دل'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔[۲] انکے علمی اور ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انکو متعدد بار ایوارڈز سے بھی نوازا گیا انکے شعری مجموعہ ''آئینۂ دل'' پر مغربی بنگال اور آندھراپردیش اردو اکیڈیمیوں نے ۱۹۸۰ء میں ایوارڈ سے نوازا۔ انکے دوسرے شعری مجموعہ ''اشکوں کے پھول'' ۱۹۹۴ء اور ''روحِ دل'' پر ۲۰۰۰ء میں اردو اکیڈیمی اے۔پی نے ایوارڈ عطا کیا۔[۳] رئیس اختر کا کلام ملک کے بیشتر رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ادارۂ شاہکار نے بیسٹ پوئٹ (Best Poet) کا ایوارڈ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں ماہنامہ ''شاداب'' نے رئیس اختر نمبر نکال کر ان کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔[۴] رئیس اختر کی پہلی غزل جامعہ عثمانیہ کے مجلّہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ جبکہ وہ بی۔اے سالِ اول کے طالبِ علم تھے۔[۵]

۱،۲،۳ آندھراپردیش کے اردو ادیبوں اور شاعروں و مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵

۴ ماہنامہ ''شاداب'' حیدرآباد کے شعراء نمبر ۹۳ صفحہ ۱۳۵ ۵ شعری مجموعہ ''روحِ دل'' ۱۹۹۸ء صفحہ ۷

زائد از چالیس سال سے رئیس اختر شعری دنیا میں اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ انکا کلام آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا ہے اور دوردرشن سے بھی ٹیلی کاسٹ ہوا کرتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر ہیں اور غزل کی ہیت میں انہوں نے نعت، سلام، مناجات اور منقبتیں بصد احترام اور عقیدت لکھے ہیں۔ مسحور کن ترنم سے سامعین کو متاثر کر دیتے ہیں اور غزل کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ ۲۵ برس سے شنکر جی کل ہند مشاعرہ کے آغاز کی ذمہ داری ان ہی کے کندھوں پر رہتی ہے ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں کے کل ہند مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں ۱۹۹۲ء میں بزم عثمانیہ جدہ کے مشاعرہ میں مدعو کئے گئے۔ ۱۹۹۷ء میں انڈین ایمبیسی جدہ کی دعوت پر کل ہند مشاعرہ میں شرکت کی اکتوبر ۲۰۰۳ء میں انڈین ایمبیسی کی دعوت پر جدہ اور ریاض کے مشاعروں میں شرکت کی۔ تین مرتبہ سرورِ کائنات آقائے دو جہاں رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کیا ۷ مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کی۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے ''اشکوں کے پھول'' میری نظر میں یہ لکھا ہے'' جہاں تک غزل کی زبان کا سوال ہے آج زبان جس بے احتیاطی اور بے راہ روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اس انتشار میں رئیس اختر نے زبان کو اس کے فطری رچاؤ کے ساتھ قبول کیا ہے اور غزل کے ورثہ میں پائے ہوئے الفاظ کے ساتھ غزل کے باہر کے الفاظ بھی اس احتیاط کے ساتھ چنے ہیں کہ غزل کے مزاج کا بانکپن قایم رکھا ہے یہی سبب ہے کہ جب ہم ان کے اشعار پڑھتے ہیں تو فطری شگفتگی سے قطع نظر زبان کی لطافت سے بھی لذت یاب ہوئے ہیں''[1]۔ بعض کل ہند مشاعروں میں وہ ناظم مشاعرہ کی خدمت بھی انجام دے چکے ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار بطورِ نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

کب تلک لاش تیری اُٹھائے پھروں   چل تجھے مفت ہی زندگی بیچ دوں
عمر بھر ساتھ تو میرا دیتی رہی   کس طرح تجھ کو اے بے کسی بیچ دوں
ہے اسی سے رئیس آبرو زیست کی   کیا سمجھ کر متاعِ خودی بیچ دوں

☆☆☆☆☆☆

یہ شب و روز بھی اوراقِ پریشاں کی طرح   بارہا وقت کی آندھی میں بکھر جاتے ہیں

---

[1] اشکوں کے پھول شعری مجموعہ از رئیس اختر سنہ اشاعت ۱۹۹۴ء صفحہ ۵

اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ　　کچھ تو بتلائیں رئیسؔ آپ کدھر جاتے ہیں

☆☆☆☆☆☆

وہی جینے کا فن رکھتے ہیں اس دورِ تشدّد میں　　حصارِ موت میں جو زندگی کی بات کرتے ہیں

سیاست آشنا جب سے ہوئے احباب کیا کہیے　　چھپا رکھے ہیں خنجر، دوستی کی بات کرتے ہیں

☆☆☆☆☆☆

نظر میں حُسنِ شرافت سنبھال کر رکھنا　　ہے لازوال یہہ دولت سنبھا کر رکھنا

یہ میرے دور کی تہذیب ہیں علامت ہیں　　خلوص، پیار، محبت سنبھال کر رکھنا

ملے متاعِ دو عالم بھی تو قبول نہ کر　　قلندروں کی روایت سنبھال کر رکھنا

رہے نظر میں شعر بھی رئیسؔ اختر　　سلف کی ہے یہ امانت سنبھال کر رکھنا

☆☆☆☆☆☆

کیا خبر آپ تھے کس سمت سے آنے والے　　ہم نے ہر سمت نظر اپنی بچھا رکھی ہے

☆☆☆☆☆☆

پہچان بھی سکی نہ مجھے میری زندگی　　مدت کے بعد ہم جو سرِ رہ گزر ملے

☆☆☆☆☆☆

ہم کو دعائیں دو کہ گھر اپنا جلا دیے　　ورنہ تمھارے شہر میں تھی روشنی کہاں

☆☆☆☆☆☆

اے رئیسؔ اور اب اسکو کیا چاہیے　　پاس جسکے غزل کی وراثت رہے

☆☆☆☆☆☆

آپ کیوں رہتے ہیں مجھ جیسے گنہگار کیساتھ　　کونسا رشتہ ہے گرتی ہوئی دیوار کے ساتھ

☆☆☆☆☆☆

تنہائی کیوں نہ ساتھ تجھے گھر ہی لے چلوں　　اس شہر کے ہجوم میں تو جائیگی کہاں

☆☆☆☆☆☆

رئیسؔ اختر کا تیسرا شعری مجموعہ ''روحِ دل'' نعتِ شریف، سلام اور منقبتوں پر مشتمل ہے۔ رئیسؔ اختر نے رسالتمآبؐ کی خدمتِ اقدس اپنا نذرانہ عقیدت پیش کر کے ادبی شاعری کے علاوہ نعت گو شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی علحدہ پہچان بنالی ہے۔ ان کے چند نعتیہ اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

یہ نہ سمجھو کہ خالی مدینہ ہے یہ　　عرش تک جانے آنے کا زینہ ہے یہ

☆☆☆☆☆☆

میرے آقا مجھے اور کیا چاہیے　　تم کو دیکھا تو مجھ کو خدا مل گیا

☆☆☆☆☆☆

نظارہ کر چکے ہیں کلیمؑ آپ طور کا　　اب جلوہ دیکھ لیجیے میرے حضورؐ کا
آقا بھی نور کے ہیں بدن بھی ہے نور کا　　سایہ کہاں ملے گا کسی کو حضورؐ کا

انکی نعتِ شریف کے دو اشعار ملاحظہ ہو۔ جو روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مشاہدات، تاثرات، جذبات اور احساسات کو ایک نئے آہنگ کے ساتھ نظم کیا ہے۔

کبھی رہا نہ مرا کاسۂ طلب خالی　　درِ رسولؐ سے لپٹی ہوئی دعا ہوں میں
مری نظر میں کہاں تابِ دید ہے یارب　　نبیؐ کے دیکھنے والوں کو دیکھتا ہوں میں

رئیس اختر کو ذاتِ نبیؐ، حضرت علیؓ اور بزرگانِ دین سے والہانہ عقیدت و محبت ہے جسکا اظہار انکے نعتیہ اور منقبتی کلام سے ہوتا ہے اسکے علاوہ انہوں نے مختلف مشاہیر جن سے وہ متاثر ہیں انکی سماجی، شعری اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے انکی خدمات کو سراہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

صفت ہر ایک درخشندہ تیرے نام میں ہے　　کلام کس کو کمالِ ابوالکلام میں ہے

مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ انہوں نے حیرت بدایونی، امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، علی صدیقی، علی احمد جلیلی، اور حادی قادری کے تعلق سے بھی منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جناب محبوب حسین جگر مرحوم شریک مدیر روزنامہ سیاست کے بارے میں انہوں نے اپنی نظم ''نورِ سحر گیا'' میں اپنے احساسات اور تاثرات کو دلسوز انداز میں پیش کیا ہے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔[1]

رہتے تھے جس کے سایہ میں ہم وہ شجر گیا　　دے کر غموں کی دھوپ ہوا میں بکھر گیا
جائیں کدھر کو کچھ بھی ہمیں سوجھتا نہیں　　لے کر وہ اپنے ساتھ ہماری نظر گیا
دل سوگوار ہے کہ اسے پائیں ہم کہاں　　بھیگی ہوئی ہے آنکھ کہ وہ دیدہ ور گیا

وہ بین الاقوامی اور ملکی حالات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور معاشی، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی انتشار اور کمزور اور غریب ممالک اور طبقات کے استحصال سے وہ بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ انکی ایک نظم ''اصلاحِ معاشرہ'' کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

---

1. شعری مجموعہ ''سفینۂ گل'' شاعر رئیس اختر سنہ اشاعت مارچ ۲۰۰۲ء صفحہ ۷

ہر طرف ہے اک سماجی انتشار　　　ہم سفر ہیں بے سرو سامانیاں

قومی یکجہتی کے تعلق سے مندرجہ ذیل اشعار انکی بصارت اور انکے تفکر کا آئینہ دار ہے۔

کب تک یہ چاروں سمت رہے دہشتوں کا رقص　　　کب تک فضائیں آگ اور شعلوں کا دور ہو

کب تک نظر میں صرف دھواں ہی دھواں رہے　　　یہ کیسا دور کیسی سیاست ہے اِن دنوں

غزل کو نیا لہجہ دینے والے شعراء میں رئیس اختر ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عصری، کرب اور تہذیب اور اقدار کے زوال کو پیش کیا ہے جسکی جھلکیاں انکے اشعار میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ملک کو آزادی ملنے کے بعد اہل وطن، روشن مستقبل کی امید رکھتے تھے لیکن شومئ قسمت سے ایسا نہیں ہوسکا۔ شاہد صدیقی ان واقعات سے متاثر ہوکر کہتے ہیں۔

رات کے گذرتے ہی ایک اور رات آئی　　　ہم تو سمجھتے تھے کہ دن نکلنے والا ہے

اِسی موضوع پر رئیس اختر کا شعر ملاحظہ ہو۔

سنتے ہیں کہ شب کٹ گئی دن بھی نکل آیا　　　آنکھوں میں اندھیرا تو بدستور بہت ہے

موجودہ حالات کی کربنا کی کا کس عمدگی سے انہوں نے احاطہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

آج کے حالات میں انسان ہے یوں سہا ہوا　　　آندھیوں کی زد میں جیسے ہو دیا رکھا ہوا

انہوں نے نہ صرف عصری انتشار اور کرب پر اظہارِ خیال کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ روایتی مضامین پر بھی قلم اٹھایا لیکن نئے لہجہ اور نئے اسلوب میں۔ اشعار ملاحظہ ہو۔

منتظر اُس کے جوابات کا رہتا ہوں رئیس　　　زندگی بھر کوئی نامہ جسے لکھا بھی نہیں

☆☆☆☆

ہمیں دیکھو کہ ہم تہذیب ہیں کل کی جہاں والو　　　سنو ہم کو کہ ہم شائستگی کی بات کرتے ہیں

انکا اندازِ بیاں سادا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ابہام سے گریز کیا ہے۔ انکے کلام میں تلمیحات، کنایات، تشبیہات اور استعارات خال خال ہی نظر آتے ہے۔ انکا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے جو اسکا آئینہ دار ہے

کبھی تفسیر ہوں سارے جہاں کی　　　کبھی کون ہوں، یہ سوچتا ہوں

ہوا محسوس سناٹوں میں ایسا　　　کہ میں اپنے خیالوں کی صدا ہوں

رئیس اختر کی شاعری کے تعلق سے جناب عابد علی خاں مرحوم مدیر روزنامہ "

سیاست'' حیدرآباد نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے'' رئیس اختر صورت ہی سے ایک متین اور سنجیدہ آدمی نظر آتے ہیں اور انکی شاعری بھی انکے اس حُسن صورتی کی آئینہ دار ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہے اور کوچۂ دلدار سے دار تک پہنچنے کی سب ہی روایات آپکو انکے کلام میں مل جائیں گی۔ لیکن انکی ہر غزل میں ایک دو اشارے ایسے بھی ملیں گے جن سے متاثر ہو کر سونچنا پڑیگا کہ آپ رئیس اختر ہی کو پڑھ رہے ہیں یا معتقدمین میں سے کسی کے نقوشِ قرطاس سے اپنے دیدہ و دل کو شاداب کر رہے ہیں۔ رئیس اختر اس قسم کی شاعری نہیں کرتے جو جامیٹری یا الجبراء سے مل جاتی ہو وہ انسانی جذبات کی عکاسی کا حوصلہ رکھتے ہیں اور غزل کی اس ''مخصوص تہذیب'' سے بھی واقف ہیں جو اپنے آپ کو نظم سے مُمیز کرتی ہے''[۱]

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی رئیس اختر کی شاعری کے تعلق سے رائے ملاحظہ ہو

''رئیس اختر اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ انکے اور شعری مجموعوں کی طرح، کوئی شبہ نہیں اس مجموعہ ''سفینۂ گل'' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اردو شاعری کا مہذب اور معیاری ذوق رکھنے والے یقیناً ''سفینۂ گل'' کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے''[۲]

رئیس اختر کا شعری سفر جاری ہے۔ ان کا چوتھا مجموعہ کلام ''سفینۂ گل'' بھی منظر عام پر آچکا ہے''میرا ادبی سفر'' نثری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ برصغیر کے نامور شاعر جناب خورشید احمد جامی کے ''انتخاب کلام جامی'' کے مرتب ہیں ۲۰۰۰ء میں سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی ایک طالبہ اسریٰ طیبہ نے انکی شخصیت اور فن پر ایم۔ فل کیا آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ۲۰۰۲ء میں کارنامۂ حیات ایوارڈ سے نوازا۔ مشہور میوزیکل کمپنی (H.M.V.) نے انکی غزل کا ریکارڈ چترا سنگھ کی آواز میں جاری کیا۔

۱۔ شعری مجموعہ ''سفینۂ گل'' شاعر رئیس اختر سنہ اشاعت مارچ ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۱
۲۔ " " " " صفحہ ۱۰

صلاح الدین نیّر

صلاح الدین نیّر ضلع بیدر تعلقہ ہمنا آباد میں ایک مذہبی، دینی اور تجارتی چھوٹے زمیندار گھرانے میں ۲۵ رفبروری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے ان کے والد کا نام الحاج محمد شمس الدین صاحب تھا جو ایک تاجر کے علاوہ جامع مسجد ہمنا آباد کے خطیب تھے۔[۱] صلاح الدین نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے میٹرک بی۔او۔ایل اور ایم۔او۔ایل (پوسٹ گرایجویشن) جامعہ عثمانیہ سے کیا اسکے علاوہ انہوں نے علوم شرقیہ کے امتحانات اردو عالم، اردو فاضل، منشی فاضل اور ادیب کامل امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔[۲] اور وہ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے بحیثیت سیکشن آفیسر پنچایت راج ڈپارٹمنٹ سکریٹریٹ وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ صلاح الدین نیر فعال شخصیت کا نام ہے۔ زود گو شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی پہچان بنالی ہے انکو استادِ سخن ماہر عروض علامہ قدر عریضی کے علاوہ نامور شاعر اوج یعقوبی (جنھیں ٹی۔انجیا چیف منسٹر کے دورِ حکومت میں ملک الشعراء کا لقب دیا گیا تھا) سے تلمذ حاصل رہا۔

صلاح الدین نیر نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ اچھے نثر نگار اور صحافی بھی ہیں۔ ''خوشبو کا سفر'' انکی ادارت میں زائد از ۷ برسوں سے شائع ہورہا ہے۔ وہ کئی علمی اور ادبی اداروں سے وابستہ ہیں۔ اب تک انکی تیس ۳۰ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ۱۲ شعری مجموعے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) ''گلِ تازہ'' ۱۹۶۵ء — (۲) ''زخموں کے گلاب'' ۱۹۷۲ء

(۳) ''صنم تراش'' ۱۹۷۸ء — (۴) ''شکن در شکن'' ۱۹۷۹ء

(۵) ''خوشبو کا سفر'' ۱۹۸۳ء — (۶) ''رشتوں کی مہک'' ۱۹۸۶ء

[۱] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۱۷

(۷) ''سفر جاری ہے'' ۱۹۸۸ء (۸) ''ایک ایسا رشتہ'' ۱۹۹۰ء
(۹) ''کیا کیا جائے'' ۱۹۹۴ء (۱۰) ''گلفشاں'' ۱۹۹۹ء
(۱۱) ''نیلم زرفشاں'' ۲۰۰۰ء (۱۲) ''چراغِ آرزو جلتا رہیگا'' ۲۰۰۳ء [۱]

انکی بیشتر کتابوں پر آندھرا پردیش، اترپردیش، مغربی بنگال اور بہار کی اردو اکیڈیمیوں نے انعامات سے نوازا ہے۔ صلاح الدین نیرؔ نے حیدرآباد کے علاوہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں میں بلکہ دوحہ، ریاض اور کویت میں منعقدہ مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کی ہے۔ [۲]

صلاح الدین نیرؔ نے اردو شاعری کی مختلف اصنافِ سخن مثلاً نعت، غزل، نظم، قطعات اور منقبتوں وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے ان کی ابتدائی شاعری حسن و عشق کی وارداتوں کا احاطہ کرتی ہیں لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا انکے فن میں متانت اور سنجیدگی کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ صلاح الدین نیرؔ کے فن اور شخصیت پر گلبرگہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ۱۹۹۱ء میں ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ [۳] جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم عبدالوہاب غوری، صلاح الدین نیر حیات اور کارنامے کے زیرِ عنوان پی۔ایچ۔ڈی کیلئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ [۴] ادارۂ ادبیاتِ اردو سے ۱۹۵۹ء سے وابستہ ہیں اور ادبی ٹرسٹ کے آفس سکریٹری ہیں۔ اردو مجالس انجمنِ ترقی اردو کے ۱۸ برس تک معتمدِ عمومی رہے۔ [۵] ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ کتب خانے کے رکن ہیں۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے بورڈ آف گورنرز رہ چکے ہیں۔ مختلف اوقات میں اردو اکیڈیمی کے زیرِ انتظام شاعروں کے مسودات اور مطبوعات کے جج رہ چکے ہیں۔ [۶] ماہنامہ ''خاتونِ دکن'' کے ۱۲ برس تک مدیر اعزازی رہ چکے ہیں۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے جوائینٹ سکریٹری رہ چکے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے اولین ارکان میں شمار ہوتا ہے۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' کی مجلس ادارت میں رہ چکے ہیں ماہنامہ ''خوشبو کا سفر'' کے مدیر ہیں جو زائد از ۷ برسوں سے بہ پابندی شائع ہورہا ہے۔ [۷] ۱۹۵۹ء میں معتمد بین الکلیاتی اردو فیسٹویل کے مشاعروں

---

[۱] ''چراغِ آرزو جلتا رہیگا'' (مجموعہ کلام) از صلاح الدین نیرؔ ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۲۴
[۲] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۱۷
[۳، ۴، ۵، ۶، ۷] شخصی انٹرویو از صلاح الدین نیرؔ بتاریخ یکم جنوری ۲۰۰۴ء

کے معتمد رہ چکے ہیں۔ اردو کالج کے زمانۂ طالبِ علمی بی۔او۔ایل بزمِ اردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ تلگو یونیورسٹی کے علاوہ حکومتِ آندھرا پردیش نے بیسٹ اردو شاعر اعزاز سے نوازا۔ ہندی یونیورسٹی مدراس نے ان کو اردو کے بہترین شاعر کا ایوارڈ دیا۔ ساڑھے گیارہ سال کی مدت تک ۵ کتابیں شائع کیں ۱۹۰ شخصیتوں پر مضامین اور خاکے لکھے جو ۱۲۷۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اردو شاعری میں پدم بھوشن، گیان پتھ ایوارڈ یافتہ تلگو، اردو کے شاعر ڈاکٹر سی۔نارائن ریڈی کے استاد ہیں۔ سوائے ڈاکٹر راجندر پرشاد تمام صدور جمہوریہ ہند کو کلام سنا چکے ہیں [1]

تازہ شعری مجموعہ "چراغِ آرزو جلتا رہے گا" ہے جس میں غزلوں، نظموں، قطعات کے علاوہ نعتیں بھی شامل ہیں۔ انکے نعتیہ کلام کے چند اشعار ذیل میں بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔ جن میں وہ ایسے خوش نصیب خاک نشینوں سے ملنے کی تمنا کرتے ہیں جن کو رسولؐ پاک کی نگاہوں میں رہنے کا شرف حاصل ہے اور پھر وہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگ مردِ قلندر ہوتے ہیں بظاہر جن کے ہاتھ خالی رہتے ہیں لیکن خداوندِ کریم کا ان پر ایسا کرم شاملِ حال رہتا ہے کہ وہ خالی جھولیوں کو بھرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

مجھکو ان خاک نشینوں سے ملا دے یارب — جو محمدؐ کی نگاہوں میں رہا کرتے ہیں
ہم میں کچھ ایسے قلندر بھی رہا کرتے ہیں — ہاتھ میں کچھ نہیں پھر بھی دیا کرتے ہیں

ذیل کے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ یادِ نبیؐ میں انہوں نے جو آنسو بہائے ہیں وہ انکا سرمایہ حیات ہے۔

آپ ہی کے نام کے دو چار آنسو کے سواء — کیا ہے میرے پاس پلکوں پہ سجانے کے لئے

رسالتمابؐ جو رحمت العالمین ہیں انکی دین اور شفاعت پر نیرؔ کامل بھروسہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاجت مندوں کے لئے درِ رسولؐ آخری ٹھکانہ ہے جہاں ہر سائل کا کاسہ بھر دیا جاتا ہے۔

یہاں سے اُٹھ کے وہ جائیں گے اب کہاں نیرؔ — فقیرزادوں کا یہ آخری ٹھکانہ ہے

عشقِ نبویؐ میں ڈوب کر وہ کہتے ہیں کہ وہ خاکِ پائے نبی بن گئے ہیں۔ اور انکی بخشش کے لئے کافی ہے۔

---

[1] شخصی انٹرویو از صلاح الدین نیرؔ بتاریخ یکم جنوری ۲۰۰۴ء

لگی ہے اب میری مٹی کہیں ٹھکانے سے　　میں خاکِ پائے نبیؐ بن گیا ہوں اب نیر

دعا کو شرفِ قبولیت کے حاصل ہونے کیلئے بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑانا ہی کام آتا ہے رقتِ طاری ہو اور بارگاہِ رب العزت میں معروضہ پیش کیا جائے تو شرفِ قبولیت کے امکانات ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی تناظر میں انکا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

بخشش کا یہ وقت ہے شاید　　بھیگ رہا ہے میرا دامن

سرکارِ دو عالم کو جب معراج کیلئے خداوندِ کریم نے طلب فرمایا اور آپ بیت المقدس سے ہوتے ہوئے آسمانوں کی سیر کرتے ہیں۔ بیت المقدس میں تمام نبیوں اور رسولوں نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی۔ آپؐ کو جنت اور دوزخ دکھائے گئے۔ اس دوران ساری توجہ الٰہی آپ ہی کی جانب مبذول رہی اور ساری کائنات ساکت وصامت رہی اس وقت تک جب تک کہ حضورؐ درِ نبیؐ پر واپس نہ ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسولؐ عربی معراج سے واپس تشریف لائے تو بستر بھی گرم تھا۔ اور دروازے کی زنجیر بھی ہل رہی تھی۔ اس واقعہ کو نیر نے یوں منظوم کیا ہے۔

سفر ایسا ہی تھا عرشِ بریں کا　　ابھی تک گرم ہے آقا کا بستر

صلاح الدین نیر نے اپنی غزلوں میں صرف روایات کی پاسداری ہی نہیں کی بلکہ غزلوں میں موضوعات کا تنوع بھی روا رکھا ہے۔ موجودہ سیاسی حالات، معاشرہ کے مسائل، ملک میں فرقہ وارانہ فسادات، معاشی کرب اور تلاشِ روزگار اور نقلِ مکانی کا انہوں نے اپنی غزلیات میں احاطہ کیا ہے۔ ملک کے اندرونی فسادات سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک غزل لکھی ہے جس کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

آپ نے جن کو بھی شامل کیا سرکاروں میں　　ہیں وہی لوگ ہی در پردہ گنہگاروں میں
خوں بہا مانگنا چاہیں بھی تو کس سے مانگیں　　حاکمِ شہر ہے لاشوں کے خریداروں میں
ایسے بچوں کو بھی لہرایا گیا نیزوں پر　　ہم نے دیکھا تھا جنہیں پھولوں میں گلزاروں میں
تھی بہن آپ کی، بیوی بھی تھی ماں بھی ان میں　　جن کو بے پردہ کیا آپ نے بازاروں میں
غالباً پھر کسی مقتل سے چلے آئے ہو　　خون کے دھبے نظر آتے ہیں دستاروں میں
کیا کروں جا کے میں انصاف کے دروازے پر　　والیِ شہر بھی بیٹھا ہے گنہگاروں میں

صلاح الدین نیر رجائیت پسند ہیں اور حالات کی بہتری کا یقین رکھتے ہیں۔

اک نئی صبح ضرور آئے گی اک دن نیر — اپنی آواز کہاں قید ہے دیواروں میں

زمانے میں ایسا ہوتا آیا ہے کہ لوگ بھی بکے ہیں اور قلم بھی بکے ہیں۔ قلم کاروں نے دنیاوی منفعت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زر، زمین اور اعزازات کی خاطر ضمیر فروشی کی ہے۔ نیر کہتے ہیں ایسی بخشش جو قلم فروخت کر کے حاصل کی جاتی ہے خیرات ہے۔

میرے ہاتھوں سے قلم چھین کے اعزاز نہ دو — ایسی بخشش بھی تو اک طرح کی خیرات ہوئی

حالاتِ حاضرہ سے وہ بے حد متاثر ہیں اور کہتے ہیں کہ کب تک لوگ ایسے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ ان نامساعد حالات کے تعلق سے کلیم عاجز کہتے ہیں۔

ایسی بہار آئی کہ اب کہ بہار میں — سایہ نہیں کسی شجرِ سایہ دار میں

ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت — اُن کی بہار اور ہماری بہار میں

نیر تیرگیٔ شب سے تنگ آ گئے ہیں اور روشنی اُن کی آرزو بن گئی ہے۔

کب تلک میں اندھیروں سے لڑتا رہوں — میرے گھر کو روشنی چاہئے

عام طور سے لوگ دشمنوں سے تو چوکنا رہتے ہیں لیکن دوستوں کی درپردہ دوستی کے پیچھے دشمنی سے واقف نہیں رہتے اس لئے ان کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ خمار بارہ بنکوی کہتے ہیں۔

دوستوں کو آزماتے جائیے — دشمنوں سے پیار ہوتا جائیگا

کسی اور شاعر نے کہا ہے۔

حیرت نہ کیجو یہ اصولِ تضاد ہے — دھوکہ وہیں ہوگا جہاں اعتبار ہے

نیر کہتے ہیں۔

میرے ماتھے پہ زخم رہنے دو — یہ کسی دوست کی نشانی ہے

حالاتِ حاضرہ، موجودہ گھناؤنی سیاست، فرقہ واریت اور علاقہ واریت سے ملک عجیب کربناک حالات سے دوچار ہے۔ ان تکلیف دہ حالات کی انہوں نے یوں منظر کشی کی ہے۔

ہم مسافر ہیں ابھی پوری طرح واقف نہیں
کونِ حاکم شہر کا ہے قاتلوں سے پوچھیئے

صلاح الدین نیر ارضِ دکن جس کو ارضِ محبت بھی کہتے ہیں جس کے تعلق سے خوبصورت قطعات بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں دو قطعے درج کئے جاتے ہیں

یہ ہے شہر اردو ، محبت کا ساگر ہر ایک گل یہاں کا مہکتا گلِ تر
کھلے دل سے کرتے ہیں ہم خیر مقدم ہم اہلِ دکن ہیں محبت کے پیکر

☆☆☆

خود اک انجمن ہیں مرے شہر کے لوگ چمن در چمن ہیں مرے شہر کے لوگ
بہت نرم دل ہیں یہ سچ تو ہے لیکن نگاہِ دکن ہیں مرے شہر کے لوگ

صبح نوید سپیدی لے کر نمودار ہوتی ہے۔ مساجد میں اذاں اور منادر میں گھنٹے بجتے ہیں۔ ہمارا ملک سیکولر نظریہ کا حامل ہے اور مذہبی رواداری اسکا مسلک ہے۔ لیکن بعض لوگ جن کی آنکھوں پر تعصب کی عینک لگی ہوئی ہے اُن کو نویدِ صبح کے وقت کی یہ عبادتیں ناگوار گذرتی ہیں۔ نیر کے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے۔ اور وہ اپنے مشاہدہ سے پیدا ہونے والے جذبہ کو شعری سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

تکلیف ہے آوازِ اذاں سے جنہیں کہدو بے وقت پرندے بھی تلاوت نہیں کرتے

آزادی کے بعد ملک کا ایک طبقہ نقلِ آبادی کرتا ہے اس نقلِ آبادی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا کسی شاعر نے یوں نقشہ کھینچا ہے

برنگِ بوے گل اہلِ چمن، چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں سے بے چارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

لیکن نیر نے نقلِ آبادی کے تعلق سے اپنا نظریہ یوں پیش کیا ہے۔

مل جاتے ہیں ہنستے ہوئے مٹی میں وطن کی جو سچے وطن دوست ہیں ہجرت نہیں کرتے

ملک کے حالیہ فسادات سے نیر دہل کر رہ گئے ہیں اور وہ آپسی اتحاد کو وقت کی

ضرورت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فریقین کو باہمی اتحاد، محبت، رشتوں کا تقدس اور ایک دوسرے کی ماں بہنوں کی عفت کی حفاظت کرنا چاہیے

سلمٰی جہاں رہتی ہے وہیں رہتی ہے رادھا ہم لوگ امانت میں خیانت نہیں کرتے
ہوتے ہیں وہی سر سے رِدا چھیننے والے جو اپنی ہی بہنوں کی حفاظت نہیں کرتے
بے معنی ہیں ان کے لیے رشتوں کا تقدس جو اپنے ہی ہمسایے کی عزت نہیں کرتے
کیوں دیکھتے رہتے ہو ہمیں شک کی نظر سے ہم لوگ تو دشمن سے بھی نفرت نہیں کرتے

صلاح الدین نیؔر کا مجموعہ کلام ''تیرا کیا ہوگا اے گلِ تازہ'' ۲۵ رجون ۲۰۰۴ء کو شائع ہوا۔ اس مجموعہ کلام کے تعلق سے وہ کہتے ہیں کہ یہ انکے حقیقی وارداتِ قلبی اور اولین دور کے شعری رجحانات ہیں جن کو انہوں نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ انکے عنفوانِ شباب کے دور کی شاعری ہے ''گلِ تازہ'' جو شاید ایک فرضی کردار ہے جس سے انکی جذباتی وابستگی رہی ہے۔ ابتداء میں انکی یہ نظمیں ادبی رسالہ خاتون میں اور حیدرآباد کے روزنامہ ملاپ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ شاعری اُنکے دلی جذبات کی ترجمان ہے۔ ذیل کے شعر میں بلا کی کسک ہے اور بیتاب آرزو کا ذکر موجود ہے

دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں چراغِ آرزو جلتا رہیگا

ان کے کلام میں شریفانہ محبت اور اپنے محبوب سے شدید وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔

تمھارا پیار تو سینے میں دفن ہے میرے کسی کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کیا ہو تم

راہِ عشق بڑی دشوار ہوتی ہے۔ محبوب کی پردہ پوشی کو لوازمہ عشق سمجھا جاتا ہے۔ جنابِ میؔر فرماتے ہیں۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

نیؔر اپنے محبوب کو رسواء ہونے دینا نہیں چاہتے۔

تمام عمر جلوں گا میں شمع کی صورت میں جل بھی جاؤں گا لیکن دھواں نہ اُٹھے گا

اپنے محبوب سے انکی وارفتگی ملاحظہ ہو۔

تمہیں پتہ ہے کہ میں کتنا چاہتا ہوں تمہیں بجز تمھارے مجھے اور کچھ بھی یاد نہیں

صلاح الدین نیر نے موضوعاتی نثری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کا شعری اور ادبی سفر جاری ہے۔

مضطؔر مجاز

مضطؔر مجاز (سید غلام حسین رضوی) ۱۳؍فبروری ۱۹۳۵ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انکے والد سید زاور حسین رضوی کا تعلق بلند شہر (یو۔پی) سے تھا۔ سید زاور حسین رضوی صاحب خداترس اور صوفی منش بزرگ تھے۔ نواب چھتاری (سابق وزیرِ اعظم ریاست حیدرآباد) ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ نواب چھتاری جب حیدرآباد آئے تو انہوں نے سید زاور حسین رضوی کو حیدرآباد بلوایا اسطرح انہوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی اور حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا اور اسی سرزمین میں پیوندِ خاک ہوگئے۔ مجاؔز جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد وہ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے اور بہ حیثیت ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹیو وظیفۂ حسن خدمت پر علحدہ ہوئے۔ مضطؔر مجاز اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر دسترس رکھتے ہیں۔[1] مضطؔر مجاز اچھے شاعر، مترجم، مبصر اور نقاد کی حیثیت سے اردو علمی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔

مضطؔر مجاز کو شاعری کا ذوق کم عمری سے رہا۔ انکا اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں کے شعر وادب کا مطالعہ وسیع ہے۔ کلامِ غالب اور کلامِ اقبال سے مضطؔر مجاز کو والہانہ لگاؤ رہا ہے۔ انہوں نے اقبالؔ کے چار فارسی مجموعوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں اور برِصغیر کے اردو علمی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ مضطؔر مجاز نے ''طلوعِ مشرق'' کا منظوم اردو ترجمہ ۱۹۷۵ء ''ارمغانِ حجاز'' کا اردو منظوم ترجمہ ۱۹۷۷ء ''جاوید نامہ'' کا اردو منظوم ترجمہ ۱۹۸۱ء اور ''پیامِ مشرق'' کا منظوم اردو ترجمہ ۱۹۹۶ء میں کیا اور یہ سارے منظوم تراجم شائع ہوچکے

---

[1] آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ نمبر ۳۷۲

ہیں۔ ''طلوعِ مشرق'' پر ۱۹۷۶ء میں یو۔ پی۔ اور اے۔ پی کی اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ عطا کیا۔ ''ارمغانِ حجاز'' پر ۱۹۷۷ء میں یو۔ پی اردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا۔ ''جاوید نامہ'' کے منظوم ترجمہ پر ۱۹۸۱ء میں مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے ایوارڈ عطا کیا اور ''پیامِ مشرق'' کے منظوم اردو ترجمہ پر ۱۹۹۷ء میں یو۔ پی۔ اردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا۔ ان تراجم کے علاوہ شعری مجموعہ ''موسمِ سنگ'' جو طبع زاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ انکی غزلوں کا مجموعہ ''اک سخن اور'' ۱۹۸۴ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا۔

مضطر مجاز کی طویل نظم ''شہرِ بقا'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ ''موسمِ سنگ'' پر ۱۹۸۰ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے انعام عطا کیا۔ ان کی غزلوں کے مجموعے ''اک سخن اور'' پر ۱۹۹۷ء میں اے۔ پی اردو اکیڈیمی نے انعام سے سرفراز کیا۔ اور ان کی طویل نظم ''شہرِ بقا'' پر ۱۹۹۹ء میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام عطا کیا۔ مضطر مجاز نے نہ صرف اندرونِ ملک مشاعرے پڑھے بلکہ بیرونی ممالک امریکہ، لندن اور سعودی عرب میں بھی منعقدہ مشاعروں میں شرکت کی اور اپنا اثر آفرین کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔[۱] غالب کی فارسی غزلوں کے بھی وہ منظوم اردو ترجمے کر رہے ہیں۔

عالم خوندمیری نے مضطر مجاز کے منظوم اردو ترجموں کے تعلق سے سچ کہا ہے ''ضمیرِ اقبال تک پہنچنے کے لیے مضطر مجاز نے بڑی روحانی اور شعری جہد کی ہے، جس کے بغیر کوئی قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ اقبال کی فارسی تخلیق کو منتقل کرنے کیلئے فارسی اور اردو کے محاورے سے واقفیت کافی نہیں، زبان سے دل تک پہنچنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ مضطر میں یہ صلاحیت موجود ہے، جس کا اندازہ ان کے ترجموں کی بے ساختگی اور روانی سے ہوتا ہے۔ مضطر اس روحانی اور شعری تہذیب سے واقف ہے۔ اقبال جسکے اس صدی میں سب سے بڑے وارث تھے۔ انکے ترجمے ان بدنصیبوں کو جو اس تہذیب کے زبان سے واقف نہیں ہیں، اسکی روح تک پہنچنے میں رہنمائی کرتے ہیں''۔[۲]

پروفیسر سید وحید الدین کہتے ہیں کہ ''اچھی شاعری کے مترجم کو اچھا شاعر ہونا

۱۔ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ نمبر ۲۷۳

۲۔ مضطر مجاز ''پیامِ مشرق'' مطبوعہ اقبال اکیڈیمی ۱۹۹۶ء سرورق کے پشت پر رائے

ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اچھا شاعر، اچھا مترجم بھی ہو اگر مترجم کا موضوع کوئی معمولی شاعر نہیں بلکہ اقبالؔ جیسا عظیم المرتبت شاعر ہو تو اس کی دشواریوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے فن کی تعبیر کے امکانات ہر زمانہ میں نئی راہوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ مضطرؔ مجاز کے تراجم کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے شاعر کے اسلوب اظہار کا تحفظ کیا ہے۔ اقبالؔ کی جن نظموں میں غنائی اور صوتی حُسن خاص طور پر نمایاں ہے اسکو انہوں نے برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہاں کوئی ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہوسکتا لیکن اصل کی طرف رہنمائی کرسکتا اور اسکو سمجھنے میں معاون ہوسکتا ہے"۔[۱]

مضطرؔ مجاز کی شاعری کو پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں "حیدرآباد میں مخدوم، جامی، اریب اور عزیز قیسی کے بعد جدید شعراء کی جو نسل سامنے آئی ہے اس میں مضطرؔ مجاز اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔۔۔ مضطرؔ مجاز کو زبان اور فن پر دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتیں کئی جہات میں بروئے کار لائی ہیں وہ اچھے نظم نگار بھی ہیں اور اچھے مترجم بھی ہیں۔" اقبالؔ کے فارسی کلام کے منظوم ترجموں میں اپنی خلاقیت کے جوہر دکھائے ہیں اور غزلیہ شاعری میں بھی انفرادی شان پیدا کی ہے۔ تشبیہات کی پیشکش اور محاورہ بندی کے علاوہ صنائع کا استعمال فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ مضطرؔ مجاز کی شاعری مسرت بخش بھی ہے اور بصیرت افروز بھی ہے۔ اپنے احساسات کے اظہار کے لئے مضطرؔ مجاز نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ طنز کی کاٹ، شوخ گفتاری اور سنجیدگی سے مرتب ہے۔ یہ اسلوب سنجیدہ غیر سنجیدگی، سنجیدگی سے عبارت ہے"۔[۲]

شاعرِ مشرق نے اپنے فارسی کلام میں پروردگار سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کائنات کس کی پیدا کردہ ہے۔ انسان، ملائکہ، فرشتے، جن اور شیطان کا وہی خالق ہے۔ ارشادِ باری ہے کہ شیطان کے شر اور مکر سے محفوظ رہنا چاہیے۔ علامہ اقبالؔ باری تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ شیطان کیا اسکا پروردہ نہیں ہے۔ اسکا مضطرؔ مجاز نے اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے

---

۱ جاوید نامہ کے فلیپ پر

۲ مضطرؔ مجاز "اک سخن اور" مجموعہ کلام فلیپ پر پروفیسر مغنی تبسم کی رائے

جہاں آخر ہے پیدا کردہ کس کا   ہے اُس کا جذبہ بے پردہ کس کا
تیرا کہنا ہے شیطان سے حذر کر   بتا مجھکو ہے پروردہ کس کا

شاعرِ مشرق، سوزِ رومیؒ، سوزِ خسروؒ اور حضرت سنائیؒ کے صدق و اخلاص کے اوصاف عطا کے متمنی ہیں۔ وہ مزید یہ کہتے ہیں کہ ان میں اتنا سوزِ بندگی موجود ہے کہ انکو اگر خدائی بھی بخش دی جائے تو وہ سوزِ بندگی کے عوض یہ سودا قبول نہیں کریں گے۔

عطا کر شورِ رومیؒ سوزِ خسروؒ   عطا کر صدق و اخلاصِ سنائیؒ
کچھ اتنا مجھ میں سوزِ بندگی ہے   نہ لوں گر مجھے بخشے خدائی

مضطر مجاز نے اپنے منفرد اسلوب میں حضور کائناتؐ کی خدمتِ اقدس میں اپنے احساسات کو منظوم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُس ذاتِ گرامی کے طفیل میں راہِ نجات حاصل ہوئی ہے۔

اُمیؐ خوش لقب کے صدقے   اک راہ سوئے صراط سوجھی

حضرت موسیٰؑ جب طور پر دیدارِ حق کیلئے تشریف لے گئے تو ہاتفِ غیب نے ندا دی کہ نعلین اتار کر بصد ادب آئیں۔ لیکن جب محبوبؐ خدا، معراج کے لئے تشریف لے گئے تو حکمِ الٰہی ہوا کہ وہ نعلین کے ساتھ تشریف لائیں۔ اسی مضمون کو انہوں نے اپنے شعر میں یوں باندھا ہے۔

ادب سے تھرتھراتی ہیں زمینیں آسمانوں کی   کہ ہے اک آنے والے جو بہ مع نعلین آتے ہیں

رسالتمآبؐ جنکا لقب رحمۃ العالمین ہے جو معلمِ اخلاق بھی ہیں۔ جنکی سیرت کائنات کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ جنہوں نے پتھر کھا کر پتھر مارنے والوں کو راہِ راست پر آنے کی دُعا دی۔ انہوںؐ نے ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی کو پسند فرمایا۔

لہو تر بہ تر نعلین، باندھے پیٹ پر پتھر   لٹا کر تن کی راحت، لے کے من کا چین آتے ہیں

مضطر مجاز کو اہلبیتؑ سے بے پناہ عقیدت ہے۔ وہ حضرت امامِ حسینؑ کے غم کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

غمِ حسینؑ کے آگے غمِ حیات کوئی   قسم خدا کی، سمندر بھی ہے تو شبنم ہے

حضرت سیف الدین شرفی اپنے اک شعر میں فرماتے ہیں۔

اسمِ آعظم کی نہاں ہوتی ہے تاثیراس میں   بارہا دیکھ لیا نام تمھارا لے کر

مضطرؔ مجاز کہتے ہیں۔

ہمارے واسطے اسمِ حسینؑ ابنِ علیؑ   کشاکشِ حق و باطل میں اسمِ آعظم ہے

حسنینؑ کو دوشِ نبیؐ پر سوار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مضطرؔ مجاز کہتے ہیں۔

وہ جس کے واسطے نعمہ اجمل ہے دوشِ نبیؐ   وہ دوش عرشِ معلّٰی سے کیا کوئی کم ہے

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ، حضرت آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے پر کہتے ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں   کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کا

مضطرؔ مجاز کہتے ہیں۔

نکالا تھا تو نے ہی گھر سے مجھے   جدائی کو میری ابھی اور جھیل

دورِ قدیم سے شاعروں کے ساتھ متشاعروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ صاحب مرتبت شعراء نے بھی طبقہ متشاعر کو زندگی بخشی۔ چنانچہ حضرت مصحفیؔ، حضرت صفیؔ اور جناب اوج یعقوبی کے نام اس خصوص میں خصوصیت سے لئے جاتے ہیں۔ اجڈ قسم کے لوگ بھی جنکی مہربانیوں سے صاحبِ دیوان شاعر بن گئے اور چند جو سخن فہمی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اپنے آپ کو بزعمِ خود سخن ور سمجھتے ہیں۔ ایسے شاعروں کے تعلق سے مضطرؔ کہتے ہیں۔

تھوڑی بہت بھی آتی ہوگی جسکو نوشت و خواند   اپنے وقت کا غالبؔ اور اقبالؔ کہلائے گا

☆☆☆☆

سن لو رباعی یا غزل، سہرا، قصیدہ یا ہزل   اس شہر میں ہر گام پر ہے اک سے اک شاعر پڑا

موجودہ طرزِ معاشرت میں مغربیت پسندی کے تعلق سے اکبرالہ آبادی نے کہا۔

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہاری دل میں   اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

مضطرؔ مجاز نے بھی موجودہ طرزِ معاشرت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے۔

پھول کاغذ کے تو گلدان میں بس جائیں گے   گھر کے جو لوگ ہیں خوشبو کو ترس جائیں گے

مضطرؔ مجاز کی شاعری صرف گل و بلبل کی شاعری نہیں۔ بلکہ اُنکے کلام میں پند و نصائح بھی ملتے ہیں۔ غیبت جو نا صرف ایک برائی ہے بلکہ مذہبا گناہِ کبیرہ بھی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ غیبت کی لعنت بھائی کے گوشت خوری سے بھی بدتر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بھائی کا گوشت کھانے سے بہتر ہے میرے بھائی! چل کر شراب خانے میں بیٹھیں، پئیں شراب

ذیل کے شعر میں وہ ''جنگل'' کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر سمت عمارتیں موجود ہیں لیکن آدمی نظر نہیں آتے۔

جنگل عمارتوں کے کھڑے تھے چہار سمت ڈھونڈا تو آدمی کا نشان دور تک نہ تھا

لاس اینجلس میں روڈنی کنگ کے واقعے کے بعد امریکہ میں ہونے والے فسادات کے پسِ منظر میں وہ کہتے ہیں۔

چھپا چھپا کے جو اُس سے رکھے تھے چند آنسو اُسی کے سامنے مضطرؔ ہنسی ہنسی میں گرے

عمل کے تعلق سے دانشورانِ قوم نے ہمیشہ ملت کو متوجہ کیا ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں متعدد مقامات پر اس عنوان پر لکھا ہے بلکہ ان کے کلام کا محور درسِ عمل ہے مضطرؔ مجاز نے بھی اس موضوع پر اپنی فکر کا اظہار کیا ہے اور کہتے ہیں

گرنے میں، ڈوبنے میں، ابھرنے میں کیا ہے لطف دریا میں ایک بار اترتے تو دیکھتے

حضرت بلالؓ جو موذنِ مسجد نبوی تھے۔ جنکی اذاں کو رسولِ کریمؐ پسند فرماتے تھے۔ جن کی اذاں میں سوز تھا۔ انکے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

خوبیِ قسمت سے سب کے رنگ ہیں کالے یہاں سوز اذانوں میں مگر کس کی اذاں سے لاؤ گے

موذی کو قبلِ ایذا ہلاک کردینے میں حکمت ہے۔ اگر شوقیہ طور پر سانپ کو پال لیا جائے تو کسی نہ کسی وقت وہ سانپ باعثِ ہلاکت بن سکتا ہے۔

یہ شوق ہی غلط ہے کہ ناگن پھرا ے عزیز! ناگن ہے آستین کی پالی ہی کیوں نہ ہو

کسی شاعر نے کہا ہے۔

حُسن والے حُسن کا انجام دیکھ ڈوبتے سورج کو بہ وقتِ شام دیکھ

مضطرؔ مجاز کہتے ہیں۔

پھرتا ہے آفتاب لئے کاسۂ گدائی تھی جتنی دھوپ چاند ستاروں میں بٹ گئی

انہوں نے اپنے اشعار میں تلمیحات کو بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ذیل میں درج اشعار ملاحظہ ہو۔

حکمرانی ملے چوروں کی کہیں کہیں مرجینا کا پیکر دیکھوں

☆☆☆☆

مثلِ اصحاب کہف حیراں و سرگرداں پھرے یوں لگا مضطرؔ کہ خود ہم لوگ رخصت ہو گئے

مضطر مجاز کائنات کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے ڈھلتی عمر والے حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کہتی ہے سر چڑھ کر سفیدی بالوں کی دروازے پر صبح کھڑی ہے جاگ اے شخص

ملک میں آزادی کا آفتاب طلوع تو ہوا تھا لیکن ظلمت کی ردا اوڑھے ہوئے۔ سحر آئی لیکن تیرگی کا لباس زیبِ تن کئے ہوئے، آزادی کے ثمرات کا ملنا تو کجا ملک کو فسادات اور فرقہ پرستی کے ہولناک مناظر کا سامنا کرنا پڑا۔ شاعر، حساس ہوتا ہے اور مشاہدات جب جذبہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور جب وہ شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو ایسے اشعار صفحہ قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں چنانچہ ان ہی حوادث سے متاثر ہو کر کلیم احمد عاجز کہتے ہیں۔

یہ پکار سارے چمن میں تھی، وہ سحر ہوئی، وہ سحر ہوئی مرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اُسکی خبر ہوئی

☆☆☆☆

اس چمن میں کیا یہی دستور ہے پھول کے تم مستحق پتھر کے ہم

☆☆☆☆

میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں ابھی چار دن ہوئے کہ جلا ہے آشیانہ

اور مضطر مجاز بھی اِن سانحات سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

آگ بازاروں میں، خوں گلیوں میں، دہلیز پہ لاش ذہن دل اجڑے تو آباد ہوئے شہر ایسے

وقت کی آنکھ نے دیکھے تو نہ ہوں گے مضطرؔ تیرگی بانٹنے والے بھی مہ و مہر ایسے

سلیمان خطیب نے ''یاد'' کے تعلق سے کہا ہے۔

یاد بولے تو دل میں چھپانے کی بات چپ ذرا سوچ کو مسکرانے کی بات

''یاد'' کے تعلق سے مضطر مجاز کہتے ہیں۔

ہو کتنی بڑی بھیڑ نظر سب سے بچا کر مِل لیتی ہے ہر بھیڑ میں آ کر تری یادیں

زیب غوری مرحوم کی یاد میں لکھے ہوئے اشعار میں سے دو شعر ذیل میں درج

کئے جاتے ہیں۔

اول تو ہم پیتے نہیں ہیں اور پینا ٹھہرے   تو تیری آنکھوں سے پئیں گے ساغر واغر کیا
زیبؔ کا ہو اللہ کرے فردوسِ بریں میں مکاں   شعر ویر کیا، غزل وزل کیا، مضطرؔ وضطر کیا

اردو شاعری کی اصناف میں ''ہجو'' ایک زمانے میں مقبول صنف رہی ہے۔ متاخرین شعراء میں صدقؔ جائسی کے بعد اس صنف میں مضطرؔ مجاز کی ہجویانہ نظم ملتی ہے۔ جس کے پڑھنے سے انشاءؔ اور مصحفیؔ کے دور کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ذیل میں وہ نظم درج کی جاتی ہے۔

سایہ کتنا ، قد کتنا ہے؟   اس پر شدّ و مد کتنا ہے!
جسم پہ گردِ ازل ہے کتنی؟   روح میں نورِ ابد کتنا ہے!
آنکھ میں آبِ خلوص ہے کتنا؟   قلب پہ رنگِ حسد کتنا ہے؟
سر میں ہوائے کید ہے کتنی؟   دل پہ غبارِ کد کتنا ہے؟
کیا کپڑوں سے کھل سکتا ہے   روح کا حالِ بد کتنا ہے؟
بیلوں کو لپٹا کے گلے سے   خوش بوڑھا برگد کتنا ہے؟
کھلتے کھلتے ہی کھلتا ہے   شخص میں دام و دد کتنا ہے؟
سائے کی بات نہ کر ، یہ بتلا   مضطرؔ تیرا قد کتنا ہے؟

مضطرؔ مجاز کا شعری سفر جاری ہے اور حال ہی میں ان کو ان کے مجموعی شعری خدمات پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جانب سے ۲۵ ہزار روپے کا کیسہ زر پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صادق نقوی

میر صادق احمد نقوی ۶/ اکٹوبر ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انکے والد میر احمد حسین نقوی مرحوم سٹی کالج کے مشہور معلم تھے۔ انکی والدہ سکینہ بیگم عفت اچھی شاعرہ تھیں انکے نوحوں کا مجموعہ ''ثبوتِ نجات'' مقبولِ عام ہے۔ صادق نقوی کے نانا محمد علی موثر ایک صاحبِ طرز شاعر تھے انکے حقیقی چچا سید بادشاہ حسین نقوی برصغیر کے مشہور صحافی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ''اردو میں ڈرامہ نگاری کے عنوان سے اردو میں ڈرامہ پر پہلی کتاب لکھی جو آج بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے''۔ ۱

صادق نقوی کی تربیت میں ان کے چچا بادشاہ حسین نقوی کا اہم حصہ ہے۔ ایسے علمی ماحول میں صادق نقوی نے آنکھ کھولی۔ صادق نقوی کی پہچان صرف شاعر، ادیب، مورخ، صحافی، مقرر، ذاکر اہلِ بیت سے ہی نہیں بلکہ ایک اچھے اسپورٹس مین کی حیثیت سے بھی ہے۔ ان کا فٹبال کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے انٹر یونیورسٹی فٹبال ٹورنمنٹ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ ۲

صادق نقوی مختلف علمی اداروں سے وابستہ ہیں باب العلم سوسائٹی حیدرآباد کے وہ معتمد ''بزمِ فردوسِ ادب'' کے سرپرست اور ''میرا شہر میرے لوگ'' کے نائب صدر ہیں۔ وہ اسلامک ریسرچ جنرل ''دی نور'' کے بیس سال سے ایڈیٹر ہیں یہ جریدہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے اور علمی حلقوں میں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صادق نقوی کی شاعری کی ابتداء ۱۹۵۵ء میں ہوئی یہ زمانہ ان کی دورِ طالب علمی کا تھا۔ انکو

۱، ۲۔ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۴۴، ۲۳۵
اور ''شاداب'' کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۱۰

علامہ نجم آفندی سے تلمذ حاصل ہے۔ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔پہلا مجموعہ ''روشن لکیریں'' ۱۹۷۹ء میں ، دوسرا مجموعہ '' جذبۂ صادق'' ۱۹۸۳ء میں جو مذہبی شاعری پر مشتمل ہے۔تیسرا مجموعہ ''روشن زاویے'' ۱۹۹۰ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔شعری مجموعہ ''روشن لکیریں'' اور ''اشکِ صادق'' پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ایوارڈ سے نوازا۔ اور انکے شعری مجموعے ''روشن زاویے'' پر آندھرا پردیش اور اتر پردیش کی اردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا ہے۔''اشکِ صادق'' ۲۷ سلام پر مشتمل ہے۔[1]

مجالسِ عزا میں مرثیہ سے پہلے سلام پڑھا جاتا ہے۔سلام، غزل کی ہیت میں لکھا جاتا ہے۔غزل کی طرح سلام میں بھی مطلع اور مقطعہ کا اہتمام رہتا ہے۔غزل اور سلام میں قوافی کی ترتیب بھی یکساں ہوتی ہے۔سلام میں ہر شعر میں غزل کی طرح علحدہ مضمون باندھا جاتا ہے۔سلام میں اشعار کی تعداد عام طور سے دس، بارہ ہوتی ہے۔[4] سلام کی بحریں غزل کی بحروں کی طرح ہوتی ہیں۔مرثیہ کو اگر شجر کہا جائے تو سلام شجر کی شاخ ہے سلام میں مصائبِ شہدائے کربلا، مناقبِ اہلِ بیتِ اطہار اور شہدائے کربلا کے واقعات، شجاعت و شہادت جیسے مضامین کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

صادق نقوی کے کلام میں پیاس، تشنگی، کربلا، سوکھے پھول، سوکھے زرد پتے، صحرا، شعلے اور سورج جیسے استعارے ملتے ہیں۔ان کے کلام سے ان کی اہلِ بیت سے محبت اور مودت کا اظہار ہوتا ہے۔[2]

صادق نقوی کے چند اشعار جن سے مندرجۂ بالا حقیقت کا ثبوت ملتا ہے درجہ ذیل ہیں ؎

صادق نے شرف حضرتِ شبیر سے پایا ذاکر بھی ہے، شاعر بھی ہے، مولیٰ کے کرم سے

☆☆☆☆☆

تیری محفل میں دنیا سے اُٹھانا میرے مولیٰ یہ صادق کی دعا ہے

☆☆☆☆☆

جب بھی صادق سج گئی ہے محفلِ ذکرِ حسینؑ میرا مٹی کا مکاں ایواں نظر آنے لگا

☆☆☆☆☆

ماتم کے بعد اشکِ عزا حبِ اہلِ بیت جاوں گا روزِ حشر یہ ساماں لیے ہوئے

☆☆☆☆☆

1. ''اشکِ صادق'' صفحہ ۳، ۴
2. ''اشکِ صادق'' صفحہ ۱

شاعر و ذاکر ہوں صادقؔ حضرتِ شبیرؑ کا مجھکو جنّت میں میرے مشکل کشا لے جائیں گے

حضرتِ عباسؑ کی خواہش تھی کہ وہ دریائے فرات سے بی بی سکینہ کیلئے پانی لائیں گو انہوں نے پانی سے مشکیزہ بھر لیا تھا لیکن خیمہ تک نہ پہنچ سکے اور جامِ شہادت نوش فرمایا مگر ایک قطرۂ آب نہ پیا۔ اس مضمون کو صادق نقوی نے یوں باندھا ہے۔

پیاسے عباسؑ جو دریا سے پلٹ کر آئے اپنی قسمت پہ بہت پھوٹ کے رویا پانی

میدانِ کارزار میں جہاں حق و باطل ایک دوسرے کے مقابل تھے وقتِ آخر حضرت حُر طاغوتی قوتوں کا ساتھ چھوڑ کر اہلِ حق کی طرف آگئے۔ اس کو صادقؔ نقوی نے یوں بیان کیا ہے۔

پائے شبیرؑ پہ سر رکھتے ہی بدلی تقدیر حُر جہنم سے چلے اور سوئے کوثر آئے

صادقؔ نقوی کا ایک شعر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ وہ مشکل ہے مگر ممکن ہے نام ہو میرا لکھا حُر کا مقدر نکلے

یہ بھی عجیب فیضانِ اہلِ بیت ہے کہ انکے مناقب بیان کیے جائیں تو انکے مصائب سامنے آجاتے ہیں اور اگر مصائب کا ذکر ہو تو خود بہ خود انکے مناقب نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سوچتا ہوں لب دریا کو خدا نے شاید نام عباسؑ کا لے کر ہے بہایا پانی
اوس گرتی ہے تو رہ رہ کے خیال آتا ہے تشنگیٔ علی اصغر پہ ہے روتا پانی
دِل کی گہرائی سے عباسؑ کو آواز تو دو دیکھو صادقؔ ابھی مل جائے گا ٹھنڈا پانی

☆☆☆☆☆

دیکھ سکتے ہو اسے جب ہو شعورِ تشنگی خشک نیزے پہ لکھی باوفا کی پیاس ہے

☆☆☆☆☆

تیرہ برس کی سن میں صفوں کو الٹ دیا خیبر شکن کا ظرف تھا علمِ حسنؑ کے ساتھ

حضرت عباسؑ بڑے شجیع اور فن سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی تلوار زنی دیکھ کر حیدرِ کرار کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ان ہی اوصافِ مشترکہ کو صادق نقوی بیان کرتے ہیں۔

ایسے محسوس ہوا تیغ بکف ہیں حیدر نکلے خیمہ سے جو عباسؑ تو لشکر جاگے

حسینی لشکر میں ہم شبیہ رسولؐ اللہ حضرت علی اکبرؓ بھی شامل تھے امام عالیٰ مقام خود بہ نفس نفیس نماز میں امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میدانِ کربلا میں ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ لوگوں کو حضور اکرمؐ کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

صبح عاشور کو صحرا میں اذاں جب گونجی ایسے محسوس ہوا جیسے پیمبر آئے

حضرت عباسؓ پرچم حسینی کو تھامے ہوئے تھے۔ آپ کی شخصیت پیکرِ وفا تھی صادق نقویؔ انکی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اۓ علمدارِ حسینی تیری عظمت کے نثار خون کی سرخی سے لکھی ہے وفا کی تشنگی

صادق نقویؔ کہتے ہیں کہ ذکر حسینؑ عبادت ہے، مدح علیؑ آخرت کی پونجی ہے اور اطاعت رسولؐ مقصد حیات۔

ذکرِ حسینؑ مدح علیؓ طاعتِ رسول اعمال اتنے کافی ہیں میرے حساب سے

میدانِ کربلا میں مظالم کی انتہاء بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ لختِ جگر فاطمہؓ جنکو عالم اسلام زہرہؑ ثانی کے نام سے جانتی ہے کے سر سے ردا کھینچ لی گئی تھی اور وہ ننگے سر، برہنہ پا میدانِ کارزار میں تصویرِ غم بنی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

زہرہ کی بیٹیاں تھیں کھلے سر برہنہ پا مصرعہ یہ پڑھ رہا ہوں عزا کی کتاب سے

کربلا کے سب سے کم عمر شہید حضرت اصغرؓ جنکو پانی کے بجائے اشقیا نے موت کا جام پلایا اور جنہوں نے امامِ عالی مقام کے ہاتھوں میں جامِ شہادت نوش کیا اس وقت انکی محترم والدہ رباب کے غم اور صبر کا اندازہ کرتے ہوئے دل تڑپ اٹھتا ہے۔

اصغر کی لاش دیکھ کے ہاتھوں پہ شاہ کے کیسے کیا ہے صبر کہ پوچھو رباب سے

صادق نقوی نے پر اثر قطعات بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں بطورِ نمونہ ایک قطعہ درج ہے۔ جس میں صادق نقوی نے افراد اہلبیت پر جو جور و ستم ہوئے اسکا خاکہ کھینچا ہے۔

وہ پھول سے بچے وہ عزائم و ارادے پھر چشمِ فلک نے نہیں دیکھے وہ جیالے
آنکھوں میں شہادت کی تمنا کا سویرا سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ تبسم کے اجالے

صادق نقوی کا علمی و ادبی سفر جاری ہے۔

فیض الحسن خیاؔل

فیض الحسن خیاؔل کے والد کا تعلق نظامِ حیدرآباد کی فوج سے تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں انہوں نے حصہ لیا اور انکی جانبازی کے صلہ میں انکو ضلع ورنگل قصبہ پاکھال میں (۶۰) ایکر زمین اور ایک میڈل سے نوازا گیا۔ وہ حضرت یحییٰ پاشاہ صاحبؒ سے ارادت رکھتے تھے۔[۱] اسطرح اس مذہبی گھرانہ میں فیض الحسن خیاؔل نے آنکھیں کھولیں۔ انکی ابتدائی تعلیم قلعہ گولکنڈہ کے مڈل اسکول میں ہوئی، بعد ازاں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کامیاب کیا اسکے بعد جامعہ اردو علی گڑھ سے امتحانِ ادیب، فاضل اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔او۔ایل اور بی۔اے۔ڈی پاس کیا۔[۲] انکو طالبِ علمی کے زمانہ ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ابتداء میں موضوعاتی نظمیں لکھا کرتے تھے اور پھر وہ غزلیں کہنے لگے۔ انہوں نے سارے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظم اور غزل سے جڑے رہے۔ ابتداء میں حضرت قدؔر عریضی سے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے بعد میں اوؔج یعقوبی سے فنِ عروض سیکھا اور انکے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔[۳]

انکا پہلا شعری مجموعہ ''موجِ صباء'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''صبح کا سورج'' ۱۹۷۲ء میں۔ تیسرا شعری مجموعہ ''کانچ کا شہر'' ۱۹۷۹ء میں اور چوتھا شعری مجموعہ ''قندِ ہند'' ۱۹۹۳ء میں منصۂ شہود پر آیا اس چوتھے مجموعہ میں تین نعتیں، ایک منقبت ۳۴ غزلیں اور ۲ نظمیں ہیں۔[۴]

فیض الحسن خیاؔل کی غزلوں میں حدیث با یار گفتن یا رقیب کے خلاف جلی کٹی

۱، ۲ ''قندِ ہند'' اپریل ۱۹۹۵ صفحہ ۶۰ ۳ '' '' '' صفحہ ۶۱
۴ '' '' صفحہ ۸

باتیں نہیں بلکہ داستانِ حیات اور جہدِ حیات کے رموز پائے جاتے ہیں۔ گوانہوں نے نظم گوئی بھی کی ہے لیکن ان کی غزلوں کی تعداد نظموں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی شاعری کا مقصد زخموں پر سلیقے سے مرہم رکھنا ہے۔ انہوں نے آدابِ فن کی خاطر فن کو قربان نہیں کیا اردو ادب کو مختلف تحریکوں اور رجحانات کا سامنا کرنا پڑا لیکن فیض الحسن خیالؔ کسی مخصوص تحریک یا رجحان سے متاثر نہیں ہوئے۔ حیات کے کرب کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

زندگی بکنے چلی آئی ہے بازاروں میں　　اِس جنازے کے بھی کچھ دام لگاؤ یارو

ملک میں جو بے چینی اور کرب پایا جاتا ہے اسکی طرف انہوں نے توجہ کی ہے اور کہتے ہیں۔

ہر طرف آگ کا طوفاں ہے جہاں تک پہونچے　　دیکھیے شہر کے حالات کہاں تک پہونچے

سماج کے رو بہ زوال ہونے، انسان کی پستی اور اسکی بے بسی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

چارہ گر بھی وہی، قاتل وہی، حاکم بھی وہی　　کیسے فریاد مری نوکِ زباں تک پہونچے

جب قاتل خود حاکمِ وقت ہو تو فریاد کس سے کی جائے۔

دوستو اپنے مکانوں سے نکل کر دیکھو　　جس کے آنگن میں اجالا ہے پریشاں ہے بہت

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اُجالا، اندھیروں کے بعد خوش آئند علامت ہوتا ہے لیکن نہیں معلوم کس کے گھر کی آگ سے شاعر کے گھر کے آنگن میں اجالا ہے۔ ملک کے سیاسی حالات اور فسادات کے تعلق سے وہ دلگیر ہیں اور کہتے ہیں۔

نام لیکر کبھی مندر کا، کبھی مسجد کا　　مشغلہ ڈھونڈ رہے ہیں ستم آرائی کا

لیکن خیالؔ بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں اور امید کی شمع ان کے ہاں فروزاں ہے۔

نفرتوں کا جو ہے موسم وہ بدل جائے گا　　وقت اب آگیا قاتل تیری پسپائی کا

اقتدار کے جبر کے تعلق سے ان کا تیکھا طنز ملاحظہ ہو۔

سنا ہے شہر میں دیوانے پھر سے آئے ہیں　　اِنہیں پہ قتل کے الزام سب لگا دینا

مشہور کہاوت ہے کہ ”دل خانۂ خدا ہوتا ہے“۔ خیالؔ اِسی مضمون کو اپنے شعر میں یوں باندھتے ہیں۔

دل مرا توڑیئے لیکن یہ ذرا یاد رکھیئے　　لوگ کہتے ہیں کہ ہر دل میں خدا ہوتا ہے

قوم کے نوجوانوں کو عمل کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مسافروں کا اگر حوصلہ جواں ہوتا نہ جانے کونسی منزل پہ کارواں ہوتا

عصرِ حاضر کے سیاسی رہنماؤں پر ان کا طنز ملاحظہ ہو ۔

لے نہ ڈوبے کہیں اوروں کا سہارا یارو ناخداؤں کو سہاروں کا خیال آتا ہے

ذیل کے اشعار میں فیض الحسن خیالؔ نوجوانانِ قوم کو عمل کی طرف راغب کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

چھین لیں گے ہاتھ سے ساقی کے بڑھ کر جام خود میکشوں میں گر ذرا بھی جرأتِ رندانہ ہے

☆☆☆☆☆

برق لہرائے خزاں چھائے کہ شعلے برسیں آشیاں اپنا بنا لیں گے بنانے والے

قوم کی زبوں حالی کا یوں ذکر کرتے ہیں ۔

گری بجلی جلے دو چار تنکے دھرا کیا تھا ہمارے آشیانے میں

فیض الحسن خیالؔ کے پیشِ نظر انفرادی سود و زیاں نہیں بلکہ قوم کا اجتماعی فائدہ یا نقصان رہتا ہے ۔

سوال اپنے نشیمن کا نہیں ہے لگی ہے آگ سارے گلستاں میں

فیض الحسن خیال کی نظم ''شعلہ ٔحسن'' کا یہ حصہ ملاحظہ ہو

اک شاعر بھی اس شہر کا اک شہری ہے
میری غزلوں کو پڑھو
گاؤ ترانے دل کے
شعلہ ٔحسن پگھل جائے گا
میری غزلیں سن کر
موسم کی طرح پگھل جائے گا رفتہ رفتہ
برف بن جائے گا گلنار لپکتا شعلہ

ان کے چند متفرق اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں ۔

جس کو مٹی بھی میسر نہیں مئے خانہ کی اس کو پھر کس لیے میخوار یہاں تکتے ہیں

☆☆☆☆☆

ایک دو جام کی توفیق نہیں ہوتی جسے ایسے ہر شخص کو ہم پیرِ مغاں کہتے ہیں

☆☆☆☆☆

صلیبوں پر ملے گی یا چمن میں یہی تو زندگی سے پوچھنا ہے

☆☆☆☆☆

کام آیا ہے چراغوں کی طرح جل جانا ہم سے مانوس ہوا جاتا ہے پروانہ کیوں

☆☆☆☆☆

شعورِ اہلِ خرد کے حدودِ دیر و حرم صلیب دار سلامت دیوانہ پن کے لیے

سرزمینِ حیدرآباد سے ان کی والہانہ محبت کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

چلے تو صبح بنارس، رکے تو شامِ اودھ
بس اسکے بعد کی ہر اک ادا دکن کے لیے

فیض الحسن خیالؔ کا شعری سفر جاری ہے۔

رحمٰن جامؔی

رحمٰن جامی کا نام عبدالرحمٰن تخلص' جامؔی اور قلمی نام رحمٰن جامؔی ہے وہ ۸؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ریاست حیدرآباد کے ضلع محبوب نگر میں پیدا ہوئے[۱]۔ بحیثیت مینیجر اکاونٹس اینڈ ایڈمینسٹریشن خدمات انجام دیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''جامِ انا'' جو غزلوں پر مشتمل ہے ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے جس پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انہیں انعام سے نوازا۔ ''قسطاط (مجموعہ اصناف سخن)'' ۲۰۰۱ء میں ''ارغن (اصناف شاعری)'' ۲۰۰۲ء میں ''سبو (مجموعہ کلام)'' ۲۰۰۲ء انکے اور دو شعری مجموعے ''بیخودی (عنفوان شباب کی غزلیں)'' اور ''دوآبہ (عنفوان شباب کی نظمیں) ۲۰۰۵ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ خودنوشت سوانح عمری ''یہ جہاں رنگ و بو''، ''پیوند'' کہانیوں کا مجموعہ اور ''نکاتِ ہنر'' جو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں[۲]۔

رحمٰن جامؔی پُر گو شاعر ہیں انکے پاس ابھی کافی شعری ذخیرہ موجود ہے رحمٰن جامؔی کو جو بات دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، پابند نظم، آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم، رباعیات، قطعات، سانیٹ، ماہیے، ہائیکو، ثلاثی، مرقعے اور اینٹی لوری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے برخلاف اسکے دوسرے شعراء کے پاس یہ ساری اصناف نہیں ملتیں۔ کسی نے چند اصناف پر اور کسی نے دوسری چند اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن رحمٰن جامؔی نے نہ صرف مروجہ اصنافِ سخن بلکہ بیرونی ممالک کے ادب سے در آئی ہوئی ساری اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ انکے حمدیہ کلام کے چند اشعار نمونتاً درجِ ذیل ہیں۔

۲،۱ شاداب کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۸۷، اور شخصی انٹرویو از رحمٰن جامؔی ۲۷؍جنوری ۲۰۰۵ء

اے خدا تو ہی کارساز بھی ہے
اے خدا تو ہی بے نیاز بھی ہے
اے خدا تو ہی اہلِ راز بھی ہے
تیرا بندہ بہانہ باز بھی ہے

اے خدا اس کو رہ پہ لا لینا
اس کو تو آگ سے بچا لینا

انکی نعتِ شریف کا ایک شعر درجِ ذیل ہے۔

حسین ایک صورت مدینہ میں ہے — خدا جس پہ عاشق ہوا ہے وہی

امام حسینؓ کی خدمتِ اقدس میں وہ گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لکھی ہے اپنے خون سے صداقت کی داستاں — تقدیرِ دوجہاں ہے نواسہ رسولؐ کا

انہوں نے شخصی مرثیے بھی لکھے ہیں۔ اپنے بھتیجے محمود کی یاد میں انہوں نے مرثیہ رقم کیا ہے جسکا ایک شعر ذیل میں درج ہے۔

چھین کر کون لے گیا تم کو — کوئی ملتا نہیں نشاں محمود

انہوں نے چھوٹی اور بڑی ہر دو بحروں میں غزل گوئی کی ہے، دوغزلہ سہ غزلہ اور چوغزلہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ رحمٰن جامیؔ عمل پر یقین رکھتے ہیں اور تدبیر سے تقدیر بنانے کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں۔

کشتی مری حیات کی جو پار اُتر گئی — دریا چڑھا ہوا تھا مگر عزم تھا مرا

انکی پابند نظم جو سابق ریاستی وزیرِاعلیٰ چندرا بابو نائیڈو کے بیان اگست ۲۰۰۰ء سے متاثر ہوکر انہوں نے لکھی تھی اس کا ایک بند ملاحظہ ہو[1]

شہر اپنا بنے گا پرنور
مان لینے پہ ہوگئے مجبور
سن کے نعرہ ہوئے یوں مسرور
گویا. گم نام تھے ہوئے مشہور

[1] مجموعہ اصناف سخن "قسطاط" سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء صفحہ ۶۷

ہو گئے اپنے آپ پر مغرور
حیدرآباد بنے گا سنگاپور

انکی آزاد نظم ''آج کا شہر'' کا ایک بند ملاحظہ ہو

ہر ایک رہ گزر حادثوں کی جائے پناہ ہجومِ حُسنِ پریشاں کی اک نمائش گاہ
جہاں پہ آ کے خودی ہو گئی ہے خود ہی تباہ

انکی ایک نثری نظم ''جھوٹ'' ملاحظہ فرمائیے

کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے فرض کرنا پڑتا ہے
(جس سے ریاضی کا گہرا تعلق ہے) فرض کرنے اور جھوٹ بولنے میں
کوئی (زیادہ) فرق نہیں ہے

ذیل میں رحمٰن جامؔی کی ایک رباعی درج ہے۔

مشہور ہیں اِس دور میں ہم بھی جامؔی منصور ہیں اس دور میں ہم بھی جامؔی
اللہ کو جو منظور ہے وہ ہوگا مجبور ہیں اس دور میں ہم بھی جامؔی

انہوں نے مغربی ادب سے درآئی ہوئی صنفِ شاعری ''سانیٹ'' پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ صنفِ سانیٹ تین چار چار مصرعوں کے بند اور آخر میں ایک شعر پر مشتمل ہوتی ہے۔ ابتدائی تین بند کے ہر چار مصرعوں کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ پہلا اور چوتھا' دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تین بند کے بعد آخری تین شعر ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ ذیل میں انکی صنفِ سانیٹ کا ایک بند بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے

عالم عالم ذکر ہے تیرا تیرا اونچا نام ہوا ہے
نیک تیرا ہر کام ہوا ہے بزم میں پیہم ذکر ہے تیرا

انہوں نے ترائیلے بھی لکھے ہیں۔ یہ صنفِ شاعری بھی مغربی ادب کی دین ہے جو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس میں پہلا مصرعہ چوتھے اور چھٹے مصرعہ میں دہرایا جاتا ہے۔ پہلا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا مصرعہ ہم قافیہ ہم ردیف ہوتے ہیں۔ دوسرا، چھٹا اور آٹھواں مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ انکا تخلیق کردہ ایک ترائیلہ ''خواہش''

ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

صبا تجھ کو اب آجا بند کرلوں　　　بہت آوارگی اچھی نہیں ہے
چمن میں اپنے ہی پابند کرلوں　　　صبا تجھ کو اب آجا بند کرلوں
کھلا دروازہ اپنا بند کرلوں　　　گلوں سے دوستی اچھی نہیں
صبا تجھ کو اب آجا بند کرلوں　　　بہت آوارگی اچھی نہیں ہے

رحمٰن جامی نے ''ثلاثی'' جو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ردیف اور قافیہ کی قید نہیں ہوتی ہے۔ ثلاثی ہائیکو اور ماہیے کی ہیئت سے مختلف ہوتی ہے۔ ذیل میں انکی ایک ثلاثی درج کی جاتی ہے۔

سنو اک بات کہنا چاہتا ہوں　　　قریب آؤ تو کان میں کہہ دوں
ارے یہ کیا ہوا معلوم کیسے؟

رحمٰن جامیؔ نے پنجابی صنفِ شاعری ''ماہیے'' میں بھی طبع آزمائی کی ہے ماہیے بھی تین مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس صنف کی تشکیل یوں ہوتی ہے کہ اسکا ہر مصرعہ مفعول اور مفاعلن کی تکرار میں ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک ماہیا بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

بہتات رہے لوگوں کی
مفعول　مفاعلن
ہندر میں اے جامی
فعل　مفاعلن
کیا بات رہے لوگوں کی
مفعول　مفاعلن

رحمٰن جامیؔ نے جاپانی صنفِ شاعری ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جاپانی سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں اس صنف کا آغاز ہوا۔ ہائیکو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ شارٹ سلیبلس اور لانگ سلیبلس میں اس سخنِ شاعری میں طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ شارٹ سلیبلس سبب سے اور لانگ سلیبلس میں وتد سے کام لیا جاتا ہے۔ اس صنف کی تشکیل میں ۵+۷+۵ کا طریقہ ملحوظ رکھا جاتا ہے یعنی پہلے مصرعہ میں پانچ، دوسرے مصرعہ میں سات اور تیسرے میں پانچ سبب (شارٹ سلیبلس اور لانگ سلیبلس

میں پہلے مصرع میں پانچ وتد دوسرے مصرعہ میں سات اور تیسرے مصرعہ میں پانچ وتد استعمال میں آتے ہیں۔ ذیل میں ایک شارٹ سلیبلس کی تقطیع پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو

مزدوری کر یار
مزدوری کے دم سے ہی
چلتا ہے سنسار

اب اس کی تختی ملاحظہ ہو

مز دو/ری کر/یار
۱ ۲ ۳ ۴ ۵
فعلن فعلن فاع

مز دو/ری کے/دم سے/ہی
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷
فعلن فعلن فعلن فع

چلتا/ہے سن/سار
۱ ۲ ۳ ۴
فعلن فعلن فاع

''رحمٰن جامی کی شاعری روایتی تجربے ایک تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر مس عائشہ صدیقہ نے یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔[1] رحمٰن جامی کا شعری سفر جاری ہے۔

......☆☆☆☆......

[1] اخبار منصف مورخہ ۱۸ فروری ۲۰۰۵ء

ناصر کرنولی

ناصرؔ کرنولی کا نام عبدالرحمن خان تخلص ناصرؔ اور قلمی نام ناصرؔ کرنولی ہے۔ وہ یکم رجولائی ۱۹۳۷ء کو کرنول میں پیدا ہوئے۔۱ عثمانیہ کالج کرنول سے گریجویشن اور ۱۹۶۰ء میں جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم۔اے کیا۔۲ انہوں نے ویک وردھنی ایوننگ کالج میں صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔۳ زمانۂ طالب علمی سے انہوں نے شعر گوئی شروع کی۔ مولانا سید غضنفر علی زیدی مرحوم اور جُرم محمد آبادی جیسے اساتذۂ سخن کی رہنمائی سے ان کی شاعری میں نکھار پیدا ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے اردو ماہنامہ ''پونم'' جاری کیا جس کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔۴

نظریاتی اعتبار سے وہ ترقی پسند رجحانات کے حامل اور ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہیں۔ ادب میں وہ کسی ازم کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ایسے ادب کو پسند کرتے ہیں جو زندگی کی صحت مند اقدار کی ترجمانی کرتا ہو۔ روایات سے انحراف کے نئے تجربے اگر شعرو ادب میں وسعت کا باعث بنتے ہوں تو وہ انکا خیر مقدم کرتے ہیں۔

''نفس نفس'' انکا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۷۸ء میں منصۂ شہود پر آیا۔۵ وہ غزل گو شاعر ہیں۔ انکی مرصع اور مترنم بحروں میں لکھی ہوئی غزلیں اہلِ حیدرآباد بھول نہ پائیں گے۔ انکی غزلوں کے چند اشعار نموتناً درجِ ذیل ہیں۔

برساتا ہے تقدیسِ محبت کے گگن پھول　　جس وقت پہن لیتی ہے شرمیلی دلہن پھول

☆☆☆☆☆

مانا کہ سازگار چمن کی فضا نہیں　　لیکن فضا بدلنے کا کیا حوصلہ نہیں

ناصرؔ کرنولی کا شعری سفر جاری ہے۔

۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ماہنامہ ''شاداب کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء صفحی ۳۲۱

محسن جلگانوی

محسن جلگانوی کا نام غلام غوث خان، تخلص محسن اور قلمی نام محسن جلگانوی ہے۔ وہ ۱۵؍اکٹوبر ۱۹۳۹ء کو چوپڑہ (مصطفیٰ آباد) میں پیدا ہوئے ۱؎ جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کی۔ انہوں نے سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ جدیدیت سے متاثر ہیں اور جدید لب ولہجہ کے شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں انکا پہلا شعری مجموعہ ''الفاف'' شائع ہوا۔ اس شعری مجموعہ پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ۱۹۸۰ء میں انکو ایوارڈ سے بھی نوازا۔ انکے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

یہ زندگی عذاب بھی ہم پر سزا بھی ہے　　لگتا ہے اپنے ساتھ بد دُعا بھی ہے

☆☆☆☆☆

بڑا ضمیر بڑا ظرف چاہتا ہے میاں　　یہ اپنے آپ کا اپنے خلاف پڑھنا بھی

۱؎ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں، مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۳ء صفحہ ۳۳۹

مصحفؔ اقبال توصیفی

مصحفؔ اقبال توصیفی کا نام عبدالمغنی، تخلص مصحفؔ اور قلمی نام مصحفؔ اقبال توصیفی ہے۔ وہ بدایوں (یو۔پی) میں ۸ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے ۱۹۶۱ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ایس۔سی کیا انکا کلام برِصغیر کے بیشتر جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ انکے دو شعری مجموعے ''فائزا'' ۱۹۷۸ء میں اور ''گماں کا صحرا'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ انکے شعری مجموعہ ''فائزا'' پر ۱۹۷۹ء میں اور دوسرے شعری مجموعہ ''گماں کا صحرا'' پر ۱۹۹۵ء میں اردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے ایوارڈ سے نوازا۔[۲] مصحف کی شاعری جدید اردو شاعری میں خاص مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے غزل اور نظم ہر دو اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ انکے ہاں موضوعاتی نظمیں اور نثری نظمیں ملتی ہیں۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''دور کنارہ'' طبع ہو چکا ہے اور آچکا ہے۔[۳] وہ اپنے محبوب سے یہ کہتے ہیں کہ ان کی محبت کا بھرم ملحوظ رہے۔ جیسے انسان کا جسم لباس سے ڈھکا ہوا رہتا ہے۔ اسی طرح اگر غم کا پسِ منظر ظاہر ہو جائے تو غم بے لباس ہو جاتا ہے اس مضمون کو انہوں نے اپنے شعر میں یوں باندھا ہے۔

کچھ بھرم رکھ میری محبت کا
دیکھ۔ اک غم کو بے لباس نہ کر

ذیل کے شعر میں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کو

۱،۲　آندھراپردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں، مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۶۶

۳　شخصی انٹرویو از مصحف اقبال توصیفی مورخہ ۲۰ر مارچ ۲۰۰۵

اپنی بربادی پسند ہے لیکن محبوب کا وعدہ جو غلط ہی کیوں نہ ہو ان کو وقتی خوشی دے گا اور وہ حزن وملال سے محفوظ رہیں گے ۔

جھوٹ ہی کہہ کے میرا دل رکھ لے
مجھ کو برباد کر ، اداس نہ کر

کہا جاتا ہے کہ انسان بلندی سے گر کر بھی محفوظ رہ سکتا ہے لیکن نگاہوں سے گر نے کے بعد اسکا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔ اسی خیال کو انہوں نے شعری جامہ پہنایا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

میں ریزہ ریزہ بکھر جاؤں گا سنبھال مجھے
نگاہ سے نہ گرا ، دل سے مت نکال مجھے

اپنے محبوب کے اشکوں، پلکوں اور چشمِ تر کا خاکہ جو انہوں نے کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

تو اپنے اشکوں کے سارے گوہر مجھے دے دے
یہ پلکیں چوم لوں یہ چشمِ تر مجھے دے دے

مصحفؔ اقبال توصیفی کا شعری سفر جاری ہے۔

رشید جلیلی

انکا تعلق خانوادۂ فصاحت جنگ جلیل سے ہے۔ وہ ۶ رجنوری ۱۹۴۰ء کوحیدرآباد میں پیدا ہوئے۔۱ ۱۹۸۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے انہوں نے اردو میں ایم۔اے کیا۔۲ انکے والد عثمان احمد آرزو بھی شاعر تھے۔انکے نانا صدیق احمد اثر جو فصاحت جنگ جلیل کے خلفِ اکبر تھے۔انکا پہلا مجموعہ کلام ''آرزو کے چراغ'' ۲۰۰۳ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ابتداء میں وہ صدیق احمد جلیلی کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح دکھایا کرتے تھے بعد میں انہوں نے علی احمد جلیلی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔۳ انہوں نے غزل کے علاوہ نظم، حمد، نعت اور قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے کلام میں انبساطی کیفیت ہی نہیں بلکہ رنج وغم بھی شامل ہیں۔ چھوٹی بحروں اور سہل ممتنع میں شعر کہنا انکا وصفِ خاص ہے۔انکی چھوٹی بحروں کی غزلیں پڑھنے سے سعید شہیدی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔رشید جلیلی کے اشعار نموتاً درجِ ذیل ہیں۔

نا امیدی کی آندھیوں میں بھی آرزوں کے چراغ جلتے ہیں

کرم کر کے بخشا رشید اس نے ورنہ تمہاری دعا میں تھی تاثیر کتنی

کانٹے چمن کے پھول سمجھ کر ہی لے چلیں سایہ نہیں تو دھوپ کی چادر ہی لے چلیں

۱،۲ ''آرزو کے چراغ'' شعری مجموعہ از رشید جلیلی سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۷۳

۳ ''آرزو کے چراغ'' شعری مجموعہ از رشید جلیلی سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء صفحہ ۸

روف خلشؔ

روف خلش کا نام سید رؤف تخلص خلشؔ اور قلمی نام روف خلش ہے وہ ۴؍ جنوری ۱۹۴۱ء کو کرنول میں پیدا ہوئے۔۱؎ انہوں نے جواہر لال نہرو ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی حیدرآباد سے ۱۹۶۵ء میں آرکٹکچر میں ڈپلوما حاصل کیا۔۲؎ ان کے تین شعری مجموعے ''نئی رُتوں کا سفر'' ۱۹۷۹ء میں ''صحرا صحرا اجنبی'' ۱۹۸۹ء میں اور ''شاخِ زیتون'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ آندھراپردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۰ء میں پہلے شعری مجموعہ اور دوسرے شعری مجموعہ پر ۱۹۸۹ء میں ایواڈ عطا کیا۔ تیسرے شعری مجموعہ کو مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کے علاوہ آندھراپردیش اردو اکیڈیمی نے ایوارڈ سے نوازا۔۳؎ غزل کے علاوہ انہوں نے صنفِ نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں انکے دو شعر نمونتاً درج کیے جاتے ہیں۔

ہم سر پھرے ضرور ہیں لیکن ہیں وضع دار بے اعتدالیاں ہیں مگر رکھ رکھاؤ ہے

☆☆☆☆☆

مانندِ شجر ہو تم رکتا ہے رکے موسم خوشبو کو ہوا دے کر، شاخوں کی طرح ہلنا

روف خلشؔ کا شعری سفر جاری ہے۔

۱؎ ۲؎ ۳؎ آندھراپردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۴۲

مومن خاں شوقؔ

مومن خاں شوق ۱۵ ارجون ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] ۱۹۶۴ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔کام کیا اور ایف۔ایس۔اے۔اے (انڈیا) کرنے کے بعد زرعی یونیورسٹی راجندر نگر سے وابستہ ہو گئے[۲] اور وہیں سے بہ حیثیت سپرٹینڈینٹ وظیفہ پر سبکدوش ہوئے انہوں نے اردو زبان کی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کے ۵ شعری مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ ''بدلتے موسم'' ۱۹۸۱ء میں دوسرا شعری مجموعہ ''چاندنی کے پھول'' ۱۹۸۷ء میں تیسرا شعری مجموعہ ''نشاطِ آرزو'' ۱۹۹۳ء میں 'چوتھا شعری مجموعہ ''کرن کرن اجالا'' ۱۹۹۸ء میں اور پانچواں شعری مجموعہ ''یہ موسمِ گل'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئے۔ انکے شعری مجموعے بدلتے موسم، چاندنی کے پھول اور کرن کرن اجالا پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انہیں ایوارڈ سے نوازا۔[۳]

انہوں نے تشبیہات کو اپنے کلام میں بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔

ایک لڑکی دکن میں ملی شوقؔ کو غالبؔ و میرؔ کی شاعری کی طرح

انکے کلام میں دلکشی' سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ دوستی کا تقاضہ ہے کہ دوست کے عیوب کی بھی نشاندہی کی جائے۔ چنانچہ مومن خاں شوق کہتے ہیں۔

ظاہر نہ کیجئے میری اتنی بھی خوبیاں پکھ عیب میرے مجھکو بتا کر تو دیکھئے

انکا شعری سفر جاری ہے۔

۱،۲،۳ آندھرا پردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۴ء صفحہ ۲۳۹

ڈاکٹر ہادیؔ قادری

ڈاکٹر ہادیؔ قادری کا نام سید محی الدین قادری تخلص ہادی اور قلمی نام سید محی الدین ہادی قادری ہے۔ انکے والد کا نام سید شاہ طاہر قادری عطا تھا۔ ڈاکٹر حادی ۱۸؍جون ۱۹۴۲ء کو شہر حیدرآباد کے محلے حسینی علم میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں نظامیہ طبی کالج سے طبیب مستند جی۔سی۔آئی۔کا تکمیلہ کیا، ۱۹۷۲ء میں ایم۔فل (عربی) اور ۱۹۹۴ء میں جامعہ نظامیہ سے مولوی فاضل کامیاب کیا۔ اور ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ وہ انوار العلوم کالج میں صدر شعبہ عربی رہ چکے ہیں انکے دو شعری مجموعے ''صوتِ ہادی'' ۱۹۸۹ء میں اور ''تحیاتِ ہادی'' (نعتوں کا مجموعہ) ۱۹۹۶ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اسکے علاوہ انکی اور بھی تصانیف مثلاً ''نقشِ تابندہ''، ''مختصر تاریخ ادب اردو'' اور ''مختصر احوال علماء و اولیائے حیدرآباد'' وغیرہ بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ انکی تصنیف صوفی صفاتِ صحابہ پر ۱۹۹۷ء میں آل انڈیا میر اکیڈیمی کی جانب سے امتیازِ میر کا ایوارڈ عطا کیا۔ انکو عراق میں منعقد ساتویں بین الاقوامی کانفرنس میں عربی مقالہ پڑھنے کا اعزاز حاصل ہے۔[۱] ڈاکٹر ہادی قادری نے اپنی شاعری میں عصرِ حاضر کے مسائل کا احاطہ کیا ہے وہ اپنی غزل گوئی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

وسعت وہ غزل میں ہے کہ دنیا کو سمیٹ لے
ہادیؔ ہیں نئے طرز کے انبار غزل میں

دکن میں ایک محاورہ ''برادرِ حقیقی دشمنِ تحقیقی ہے'' اس مضمون کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے شعر میں باندھا ہے۔

جس نے تکلیفِ دلی آپکو پہنچائی ہے
میں کہوں سونچے بنا' آپکا وہ بھائی ہے

موجودہ خانقاہی روایتوں سے علامہ اقبالؔ بھی بیزار تھے۔ اسی تعلق سے ڈاکٹر ہادی کہتے ہیں۔

بن گئے ہیں سجادہ' علم و دین سے بے بہرہ
پاس کچھ نہیں باقی' خانقاہ باقی ہے

ڈاکٹر ہادیؔ قادری کا شعری سفر جاری ہے۔

[۱] آندھرا پردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۴۲۷

غیاث متین

پروفیسر غیاث متین کا اصل نام سید غیاث الدین تخلص متین اور قلمی نام پروفیسر غیاث متین ہے۔ ان کے والد کا نام سید قمر الدین صاحب مرحوم تھا۔ وہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے ۱۹۶۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ ایڈ کیا اور ۱۹۷۰ء میں انہوں نے امتیاز سے ایم۔ اے۔ پاس کیا۔[۲] ان کو ایم۔ اے میں امتیازی کامیابی پر گولڈ میڈل بھی عطا کیا گیا۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت پروفیسر، چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ حیدرآباد میں لٹریری فورم (حلف) کے بانی رکن اور جنرل سکریٹری ہیں۔[۳] اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ۲۰۰۰ء میں ان کو بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ عطا کیا۔[۴]

غیاث متین جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''زینہ زینہ راکھ'' ۱۹۸۰ء میں اور ''دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ'' ۱۹۹۳ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔[۵] شعری مجموعہ زینہ زینہ راکھ پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی اور بنگال اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۱ء میں انعامات سے نوازا، اور ۱۹۹۳ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کے دوسرے شعری مجموعے ''دھوپ دیواریں، سمندر، آئینہ'' پر انعام عطا کیا۔[۶] یہ صاحب طرز شاعر ہیں۔ حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر کئی مشاعروں میں انہوں نے اپنا کلام سنایا۔ ۲۰۰۴ء میں جدہ میں منعقد

۱، ۲، ۳، ۵۔ آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۰۴

۴، ۶۔ " " " " " ۳۰۵

کئے گئے مشاعرے میں بھی انہوں نے شرکت کی۔ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا ہے رات　　　اس کی باتوں کا سلسلہ ہے رات

ان کی ایک نثری نظم "تم بھی عجیب..." ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کبوتر بھی
آسمان میں منڈلاتے ہوئے
گہرے سرخ بادلوں کو دیکھ کر
اپنے پر باندھ لیتے ہیں
اور کابک میں بیٹھے ہوئے
غٹرغوں، غٹرغوں....
خیر جانے دو
تم بھی عجیب پرندے ہو
کسی بھی موسم میں
پانی پر
اپنے پر مارنے سے باز نہیں آتے

علی الدین نوید

علی الدین نوید کا نام محمد علی الدین تخلص نوید اور قلمی نام علی الدین نوید ہے۔ ۱۴؍ جولائی ۱۹۴۴ء کو وہ ہمنا آباد (ضلع بیدر) میں پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے ۱۹۶۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی پاس کیا اور اسی جامعہ سے انہوں نے ۱۹۷۲ء میں بی۔ ایڈ کیا اور کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے ایم۔ اے (اردو ادب) کیا۔[۲] وہ حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کے بانی ارکان میں شمار کئے جاتے تھے اور اس فورم کے نائب صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے خدمت انجام دیں۔[۳] انکے دو شعری مجموعہ ''صدف تمام ریت ریت'' ۱۹۷۹ء میں اور ''دھواں دھواں چراغِ جاں'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پہلے مجموعہ پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ۱۹۷۹ء میں ایوارڈ سے نوازا اور دوسرے شعری مجموعہ پر ۱۹۹۳ء میں انہیں اسی اکیڈیمی نے ایوارڈ سے نوازا۔[۴] ان کو تقریباً ۲۵ سال کل ہند مشاعروں میں کلام سنانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔[۵] بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر تھے۔ لیکن انہوں نے نظم اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انکا کلام برِ صغیر کے موقر جریدوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔[۶] گو انکا لہجہ ''عصری'' تھا لیکن روایتی شاعری سے انہوں نے کبھی انحراف نہیں کیا۔ انکی ایک نظم ''موز'' آندھرا پردیش کے تعلیمی نصاب میں اردو کی دوسری جماعت کے لئے شامل ہے۔[۷] انہوں نے ایک فیچر فلم اور ٹیلی فلم کیلئے گیت بھی لکھے تھے۔ قومی یکجہتی کے موضوعات پر انکا کلام دوردرشن حیدرآباد سے ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا ہے۔[۸] دکن کا ایک مشہور

۱۔۲۔۴۔ آندھرا پردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۳۱۴

۳۔۵۔۶۔۷۔۸۔ شاداب کا حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۳۵۱

محاورہ ''جیسا کروگے ویسا پاؤ گے'' اس محاورہ کے مضمون کو انہوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں باندھا ہے۔

زمین کے بھی کچھ اپنے اصول ہوتے ہیں
ببول بوئیں تو کیوں کر گلاب نکلیں گے

اپنے وطن کی مٹی سے علی نوید کو کتنا پیار تھا اسکا اندازہ انکے درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

اسی زمین کی مٹی سے ہم بنے ہیں نوید
اسی زمین سے روزِ حساب نکلیں گے

یہ خوش گو اور پُر گو شاعر اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ کر ۲۶ رفبروری ۲۰۰۴ء بروز جمعرات، ۱۰ بجے دن کو اس ارفانی سے کوچ کر گیا۔[۱]

☆☆☆

مظفر النساء ناز

مظفر النساء ناز ۱۹۴۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔[۲] انہوں نے رانچی یونیورسٹی سے ۱۹۸۹ء میں بی۔ایڈ کیا۔[۳] انکو صلاح الدین نیر سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعرہ ہیں۔ انکے تین شعری مجموعے ''بات پھولوں کی'' ۱۹۸۶ء میں ''روشنی'' ۱۹۹۸ء میں اور ''کتنا روشن میرا گھر ہے'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات محسوسات اور تجربات کو شعری سانچے میں دلکش انداز میں ڈھالا ہے۔ سلاست انکی شاعری کا خاص وصف ہے۔ ذیل میں انکے اشعار نموتاً درج کیے گئے ہیں۔

آپ آگئے ہیں آپ کی رونق ہے چارسُو ۔۔۔ برسوں سے اس غریب کا خالی مکان تھا

☆☆☆☆

بستی میں اُسکی جا کے یہ دیکھا ہے ہم نے ناز ۔۔۔ ایسا بھی ایک گھر ہے جہاں پردیا نہیں

۱۔ اخبار سیاست مورخہ ۲۷ رفبروری ۲۰۰۴ء ۲،۳۔ آندھرا پردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء، صفحہ ۳۹۵

علی ظہیرؔ

علی ظہیر کا نام سید علی ظہیر، تخلص ظہیر اور قلمی نام علی ظہیر ہے۔ وہ ۱۹ فبروری ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے[۱] جامعہ عثمانیہ سے انہوں نے بی۔ای (سیول) ۱۹۷۰ء میں تکمیل کیا۔[۲] انکے مجموعہ کلام ''رات کے ہزار ہاتھ'' ۱۹۷۶ء، ''انگلیوں سے خون'' ۱۹۸۴ء، ''دوسرا قدم'' ۱۹۹۰ء اور ''جب زمینوں سے شجر اگتے ہیں'' ۱۹۹۴ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوئے۔ انکے مجموعہ کلام ''انگلیوں سے خون'' پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ایوارڈ سے نوازا۔[۳] گو انہوں نے غزل اور نظم ہر دو صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ وہ طویل موضوعاتی نظموں کے خالق ہیں۔ انکی طویل نظم ''دوسرا قدم'' پُر اثر اور معنی خیز ہے وہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں تحریکوں کے اثرات سے متاثر ہوئے۔ انکی غزلوں کے چند اشعار نموتاً درجِ ذیل ہیں۔

میرا سب لے لو مجھے ایک محبت دے دو شہر میں ایسی بھی آواز لگا کر دیکھوں

☆☆☆☆

وہ تو تھا آدمی کی طرح ظہیرؔ اسکا چہرہ فرشتوں جیسا تھا

☆☆☆☆

یا علی کہنے سے بنتی ہے بگڑتی بات بھی فکر مت کرائے ظہیرؔ اب غم جدا ہو جائیگا

☆☆☆☆☆

[۱،۲،۳] آندھرا پردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۶۵

ڈاکٹر راہیؔ

ڈاکٹر راہیؔ کا اصل نام ڈاکٹر علی الدین احمد اور راہیؔ تخلص ہے۔ وہ ۵/اپریل ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں نے بی۔اے۔ایم۔ایس آیورویدک کالج اے۔پی سے کیا وہ اپنا مطب خود چلاتے ہیں ابتداء میں محمد عبدالغفار رفیق (جو ہر مز صاحب کے شاگرد تھے) سے تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد عدیلؔ سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ وہ اد . رائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہے ان کا پہلا شعری مجموعہ دستک'' ۱۹۸۰ء دوسرا شعری مجموعہ ''تب وتاب'' ۱۹۹۲ء اور تیسرا شعری مجموعہ ''مہک'' ۱۹۹۷ء شائع ہو چکا ہے۔ شعری مجموعہ مہک بر ۱۹۹۷ء میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

غزلوں کے علاوہ انہوں نے نثری نظم، موضوعاتی نظم، معریٰ نظم، مسدس، قطعات، رباعیات، ترانے، گیت، قصیدے، مرثیے، نوحے، منقبتیں، سلام، نعت اور مناجات کے علاوہ فرانسیسی شاعری کی مقبول ترین صنف ''ترائیلے'' میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں انکے اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں۔

شکریہ برق مسکرانے کا　　راستہ مل گیا ٹھکانے کا

☆☆☆☆☆

جسکو سما سکیں نہ دو عالم کی وسعتیں　　وہ غم سمیٹ کے پھیل گیا ہے وجود میں

فاطمہ تاج

فاطمہ تاج ۲۵/اکٹوبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔[۱] انکے والد سید جمال الیل مدنی مدینہ منورہ کے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عربی کے قصیدہ گو شاعر تھے۔ فاطمہ تاج کے والد کا تعلق دلّی سے تھا۔ وہ اپنے والدین کے مختلف المقام ہونے پر شاعرِ مشرق کے شعر کا حوالہ دیتی ہیں۔

عجمی خم ہے تو کیا مئے تو حجازی ہے مری   نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

انکے تین شعری مجموعے "اب کے برس" ۱۹۹۲ء میں "خوشبوئے غزل" ۱۹۹۵ء میں اور "حوصلہ (نظموں کا مجموعہ)" ۱۹۹۷ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اسکے علاوہ انکے نثری نگارشات بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ انکی شاعری روایتی شاعری کی پاسدار ہے۔ کلام میں رنگِ تغزل نمایاں ہے۔ انکو فعال زندگی عزیز ہے گلشن کے خار نکال پھینکنے سے زیادہ خاروں کی چبھن سے انکو لذت ملتی ہے۔ انکی شاعری میں رجائیت، روایات کی پاسداری، نغمگی اور دلکشی کا امتزاج نظر آتا ہے وہ حالات سے خائف ہونا پسند نہیں کرتیں بلکہ جہدِ مسلسل سے منزل تک پہنچنا انکی شاعری کا حاصل ہے۔ چند اشعار نمونتاً درجِ ذیل ہیں۔

محسوس ہوا تھا ترے قدموں کی صدا تھی   دروازہ جو کھلا تو فقط سرد ہوا تھی

☆☆☆☆

سوال یہ کسی معمارِ شہر سے پوچھو   بنائے کتنے مکاں اور گرادیے کتنے

☆☆☆☆

انہیں بہار کی خواہش ہمیں خزاں ہے عزیز   یہ اپنی اپنی طبیعت ہے کیا کیا جائے

فاطمہ تاج کا شعری سفر جاری ہے۔

---

[۱] آندھراپردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۸۹

رؤف خیرؔ

رؤف خیرؔ کا نام محمد عبدالرؤف تخلص خیرؔ اور قلمی نام رؤف خیرؔ ہے۔ وہ ۱۵ / نومبر ۱۹۴۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔[۱] انہوں نے اردو سے ایم۔ اے کیا اور گورنمنٹ جونیر کالج ہنمکنڈہ ورنگل میں بہ حیثیت لیکچرر کارگذار ہیں۔[۲] انکا شعری مجموعہ ''اقراء'' جو نظم' غزل' ترائیلے اور سانیٹ پر مشتمل ہے ۱۹۷۷ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا اور دوسرا شعری مجموعہ ''ایلاف'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔[۳] ۲۰۰۱ء میں انہوں نے علامہ اقبالؔ کے پیامِ مشرق میں شامل فارسی قطعات ''لالہ طور'' کو اردو میں منظوم ترجمہ کیا جو بہ نام ''قنطار'' منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ انکے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

کوئی نشان لگاتے چلو درختوں پر کہ اس سفر سے تمہیں لوٹ کر بھی آنا ہے

☆☆☆☆

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت ہے منزل پہ پہنچنے کی ہمیں دھن بھی بہت ہے

☆☆☆☆

ہم اس زمینِ شر پہ ہیں خیرؔ کی طرح ہم کو نہ بانٹئے حرم و دیر کی طرح

رؤف خیرؔ کا شعری سفر جاری ہے۔

۱٬۲٬۳ شاداب کا حیدر آباد کے اردو شعراء نمبر صفحہ ۱۰۸

حسن فرخ

حسن فرخ کا نام علی حسن خان، تخلص فرخ اور قلمی نام حسن فرخ ہے۔ وہ ۱۲؍اکٹوبر ۱۹۵۴ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اوپن یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔۲ اردو اکیڈیمی آندھراپردیش میں بہ حیثیت پبلک ریلیشن آفیسر خدمات انجام دے چکے ہیں۔۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۵ء روزنامہ رہنمائے دکن سے وابستہ رہے۔۳ ماہنامہ ''پیکر'' اور ہفتہ وار ''تیشہ'' انکی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ آکاشوانی حیدرآباد اور دوردرشن کیندر حیدرآباد نے بھی انکی خدمات سے استفادہ کیا۔۴ انکے تین شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا واسطہ'' ۱۹۷۵ء میں ''مالم یعلم'' ۱۹۸۲ء میں اور ''آبگینے (مرثیہ)'' ۱۹۶۹ء میں۔انکے دو شعری مجموعوں پر آندھراپردیش، بہار اور اترپردیش کی اردو اکیڈیمیوں نے انعام سے نوازا۔ انہوں نے غزل اور نظم ہر دو اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ انکے کلام کی خصوصیت سلاست، روانی اور شگفتگی ہے۔ذیل میں ان کے شعر ہیں۔

یوں سسکتے ہوئے سچائی کا اظہار چلے ۔۔۔ جیسے پُر شور سڑک پر کوئی بیمار چلے

☆☆☆☆

حسن کے شعروں میں لفظوں کی دل کشی ہی نہیں ۔۔۔ جھنجھوڑ دے جو دلوں کو وہ دردِ پیہم ہے

حسن فرخ کا شعری سفر جاری ہے۔

۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ آندھراپردیش اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹

کتابیات

سلسلہ نشان	مصنف/مولف	نام کتاب	سنہ اشاعت
۱	اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش	آندھرا پردیش کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی ڈائرکٹری حیدرآباد،	۲۰۰۰ء
۲	اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش	بساطِ رقص (چوتھا ایڈیشن)	۱۹۹۸ء
۳	اوجؔ یعقوبی	غنچہ لب بستہ	۱۹۷۹ء
۴	امجدؔ حیدرآبادی	گلستانِ امجد	تاریخ اشاعت ندارد
۵	" " "	ریاضِ امجد	تاریخ اشاعت ندارد
۶	" " "	حجِ امجد	تاریخ اشاعت ندارد
۷	" " "	جمالِ امجد	تاریخ اشاعت ندارد
۸	" " "	رباعیاتِ امجد (حصہ اول تا سوم)	تاریخ اشاعت ندارد
۹	" " "	ایوبؑ کی کہانی	۱۳۶۸ھ
۱۰	امیر حسین	ممبر کا دوسرا نام	۱۹۷۵ء
۱۱	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی	کڑوی خوشبو	۱۹۷۳ء
۱۲	بانو طاہرہ سعید	برگِ سبز	۱۹۶۱ء
۱۳	" " "	مہکتے ویرانے (شعری مجموعہ)	۱۹۷۶ء
۱۴	برقؔ موسوی	ید بیضا	۱۹۹۵ء
۱۵	بشیر النساء بیگم بشیرؔ	آبگینہ شعر	۱۹۴۸ء
۱۶	بشیر امجد	رنگِ حیات	۱۹۸۹ء
۱۷	" "	تصویرِ حیات	۱۹۹۳ء
۱۸	" "	آئینہ حیات	۱۹۹۵ء
۱۹	" "	سازِ حیات	۱۹۹۹ء

۲۰	بیگ احساس پروفیسر	ہزار مشعل بکف ستارے (انتخابِ کلام علی ظہیر)	۱۹۹۴ء
۲۱	حیرت بدایونی	"آئینہ" (غزلوں کا مجموعہ کلام)	۱۹۸۳ء
۲۲	حسن فرخ	آبگینہ	۱۹۶۹ء
۲۳	" "	ٹوٹا ہوا واسطہ	۱۹۷۵ء
۲۴	" "	مالم یالم	۱۹۸۲ء
۲۵	حمید رونق	کسے سنائیں	۱۹۹۵ء
۲۶	حمایت اللہ	دھنمڑی	۲۰۰۱ء
۲۷	حلمی آفندی	ساغرِ آلِ نبی (نوحہ جات)	۱۹۸۷ء
۲۸	خورشید حسین مضطر	غزال	۱۹۹۶ء
۲۹	خورشید احمد جامی	انتخابِ کلامِ جامی	۱۹۹۶ء
۳۰	خیرات ندیم	اوراقِ گل	۱۹۸۷ء
۳۱	" " "	موبافِ سحر	۱۹۷۸ء
۳۲	خواجہ شوق	چشمِ نگراں (مجموعہ کلام)	۱۹۸۴ء
۳۳	رئیس اختر	اشکوں کے پھول (شعری مجموعہ)	۱۹۹۴ء
۳۴	رئیس اختر	"روحِ دل" (شعری مجموعہ)	۱۹۹۸ء
۳۵	رئیس اختر	"سفینۂ گل" (شعری مجموعہ)	۲۰۰۴ء
۳۶	راشد آزر	اندوختہ	۱۹۹۷ء
۳۷	" "	آب دیدہ	۱۹۷۴ء
۳۸	" "	منزلِ شوق	۱۹۹۲ء
۳۹	" "	خاکِ انا	۱۹۷۹ء
۴۰	" "	صدائے تیشا	۱۹۷۱ء
۴۱	" "	زخموں کی زباں	۱۹۹۳ء
۴۲	رحمن جامی	ارغن	۲۰۰۲ء
۴۳	" "	بیخودی	۲۰۰۵ء

۴۴	رحمٰن جامی	جامِ انا	۱۹۹۰ء
۴۵	" "	دوآبہ	۲۰۰۵ء
۴۶	" "	فسطاط	۲۰۰۱ء
۴۷	" "	سبو	۲۰۰۲ء
۴۸	رؤف خیر	اقراء	۱۹۷۷ء
۴۹	" "	ایلاف	۱۹۸۳ء
۵۰	رؤف رحیم	گلزارِ صفی	۱۹۸۷ء
۵۱	رشید جلیلی	آرزو کے چراغ	۲۰۰۳ء
۵۲	ریاض فاطمہ تشہیر ڈاکٹر	علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن	۲۰۰۳ء
۵۳	رؤف خلش	نئی رُتوں کا سفر	۱۹۷۹ء
۵۴	رؤف خلش	صحرا صحرا اجنبی	۱۹۸۹ء
۵۵	" "	شاخِ زیتون	۱۹۸۹ء
۵۶	راہی ڈاکٹر	دستک	۱۹۸۰ء
۵۷	" "	مہک	۱۹۹۷ء
۵۸	" "	تب وتاب	۱۹۹۲ء
۵۹	سعید شہیدی	کفِ گل فروش	۱۹۹۳ء
۶۰	سکندر علی وجد	بیاضِ مریم	۱۹۷۴ء
۶۱	" " "	اوراقِ مصور	۱۹۶۲ء
۶۲	" " "	آفتابِ تازہ	۱۹۵۲ء
۶۳	" " "	لہو ترنگ	۱۹۴۳ء
۶۴	" " "	انتخاب	۱۹۷۷ء
۶۵	سلیمان اریب	پاسِ گریباں	۱۹۶۱ء
۶۶	سیدہ وہاب النساء	شاہد صدیقی، حیات اور کارنامے مقالہ برائے ایم۔فل	۱۹۸۳ء
۶۷	شمس الدین تاباں	زنجیر و زنار	۱۹۷۸ء

۶۸	شاذ تمکنت	بیاضِ شام	۱۹۷۳ء
۶۹	شاذ تمکنت	تراشیدہ	۱۹۶۶ء
۷۰	" "	کلیاتِ شاذ	۲۰۰۴ء
۷۱	" "	نیم خواب	۱۹۷۷ء
۷۲	" "	دستِ فریاد	۱۹۹۴ء
۷۳	" "	مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے	۱۹۶۸ء
۷۴	صاحبزادہ میکش	نوید	۱۹۴۷ء
۷۵	صفی اورنگ آبادی	انتخابِ صفی	تاریخ اشاعت ندارد
۷۶	" " "	پراگندہ	تاریخ اشاعت ندارد
۷۷	صلاح الدین نیر	تیرا کیا ہوگا اے گلِ تازہ	۲۰۰۴ء
۷۸	" " "	"چراغ آرزو جلتا رہیگا" (مجموعہ کلام)	۲۰۰۳ء
۷۹	" " "	ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے	۲۰۰۱ء
۸۰	" " "	عظمتِ خیاباں	۱۹۸۹ء
۸۱	صدق جائسی	دربارِ دربار ناشر حسامی بک ڈپو	۲۰۰۱ء
۸۲	صادق نقوی ڈاکٹر	عباداتِ صادق	۲۰۰۳ء
۸۳	" "	روشن زاویے	۱۹۹۰ء
۸۴	طیبہ بیگم	آصفِ سابع میر عثمان علی خاں اور انکا عہد	۱۹۳۰ء
۸۵	طالب رزاقی	نوائے طالب	۱۹۷۹ء
۸۶	طالب خوندمیری	سخن کے پردے میں	۱۹۹۴ء
۸۷	ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر	کلیاتِ فانی	۱۹۹۲_۹۳ء
۸۸	ظفر الحسن	عمر گذشتہ کی کتاب	۱۹۷۸ء
۸۹	علی ظہیر	انگلیوں سے خون	۱۹۸۴ء
۹۰	" "	جب زمینوں سے شجر اگتے ہیں	۱۹۹۴ء
۹۱	" "	رات کے ہزار ہاتھ	۱۹۷۶ء
۹۲	" "	دوسرا قدم	۱۹۹۰ء

۹۳	علامہ نجم آفندی	تہذیب مودت	تاریخ اشاعت ندارد
۹۴	,, ,, ,,	لہو قطرہ قطرہ	تاریخ اشاعت ندارد
۹۵	علی صائب میاں	''گھوکرو کے کانٹے'' (طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ کلام)	۱۹۶۸ء
۹۶	علی الدین نوید	صدف تمام ریت ریت	۱۹۷۹ء
۹۷	علی الدین نوید	دھواں دھواں چراغ جاں	۱۹۹۳ء
۹۸	علامہ رشید ترابی	شاہ مرداں	۲۰۰۰ء
۹۹	علامہ رشید ترابی	جوابِ شکوہ	۱۳۵۲ھ
۱۰۰	علی احمد جلیلی	اردو غزل پر ہندی کے اثرات	۲۰۰۲ء
۱۰۱	,, ,, ,,	ورقِ انتخاب	۱۹۹۹ء
۱۰۲	علی احمد جلیلی	نقشِ قدم	۱۹۷۰
۱۰۳	,, ,, ,,	اندھیرے اجالے	۱۹۸۱ء
۱۰۴	,, ,, ,,	منظر منظر شاعری	۱۹۸۷ء
۱۰۵	,, ,, ,,	نئی غزل میں منفی رجحانات	۱۹۸۴ء
۱۰۶	,, ,, ,,	فصاحت جنگ جلیل	۱۹۹۳ء
۱۰۷	,, ,, ,,	لہو کی آنچ	۱۹۹۶ء
۱۰۸	,, ,, ,,	شہرِ تمنا	۱۹۷۷ء
۱۰۹	,, ,, ,,	مکاتبِ جلیل	۱۹۸۲ء
۱۱۰	,, ,, ,,	کائناتِ جلیل	۱۹۸۵ء
۱۱۱	,, ,, ,,	اردو کا عروض	۱۹۹۲ء
۱۱۲	,, ,, ,,	بت خانہ جلیل	۱۹۹۴ء
۱۱۳	,, ,, ,,	نقد و نگاہ	۱۹۹۷ء
۱۱۴	عزیز قیسی	دو آتشہ	۱۹۸۷ء
۱۱۵	غیاث صدیقی	سمندر ناؤ میں	۱۹۹۴ء
۱۱۶	غیاث متین	زینہ زینہ راکھ	۱۹۸۰ء

۱۱۷	" "	دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ	۱۹۹۳ء
۱۱۸	فاطمہ تاج	اب کے برس	۱۹۹۲ء
۱۱۹	" "	خوشبوئے غزل	۱۹۹۵ء
۱۲۰	" "	حوصلہ	۱۹۹۷ء
۱۲۱	فیض الحسن خیال	"قندِ ھند"	۱۹۹۵ء
۱۲۲	" " "	موجِ صبا	۱۹۶۵ء
۱۲۳	" " "	صبح کا سورج	۱۹۷۲ء
۱۲۴	" " "	کانچ کا شہر	۱۹۷۹ء
۱۲۵	قدر عریضی	قدر سخن (حصہ اول)	۱۹۶۷ء
۱۲۶	" "	قدر سخن (حصہ دوم)	۱۹۶۸ء
۱۲۷	کلیم احمد عاجز	وہ جو شاعری کا سبب ہوا	۱۹۹۶ء
۱۲۸	" " "	کوچہ جاناں جاناں	۲۰۰۲ء
۱۲۹	مضطر مجاز	ایک سخن اور	۱۹۸۴ء
۱۳۰	" " "	"ارمغانِ حجاز" کا منظوم اردو ترجمہ	۱۹۷۷ء
۱۳۱	" " "	"پیامِ مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ	۱۹۹۶ء
۱۳۲	" " "	"جاوید نامہ" کا منظوم اردو ترجمہ	۱۹۸۱ء
۱۳۳	" " "	شہرِ بقاء	۱۹۹۶ء
۱۳۴	" " "	"طلوعِ مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ	۱۹۷۵ء
۱۳۵	" " "	موسمِ سنگ	۱۹۷۹ء
۱۳۶	محسن جلگانوی	الفاف	۱۹۷۹ء
۱۳۷	مومن خاں شوق	بدلتے موسم	۱۹۸۱ء
۱۳۸	مظفر النساء ناز	بات پھولوں کی	۱۹۸۶ء
۱۳۹	محمد نورالدین خاں	تاریخ وادب	۱۹۹۲ء
۱۴۰	مغنی تبسم	تحسینِ شعر	۲۰۰۳ء
۱۴۱	محمد نورالدین خاں	"یادداشت"	۲۰۰۳ء

۱۴۲	مرزا شکور بیگ	''خوشبوئے درد'' (نعتیہ مجموعہ کلام)	۱۹۹۳ء
۱۴۳	محمد نورالدین خاں	سوانح عمری صفی اورنگ آبادی مولف	۱۹۸۹ء
۱۴۴	'' '' ''	صدق جائسی	۱۹۹۴ء
۱۴۵	مولانا آزاد کالج (ناشر)	جمال اجنتا جلال ہمالہ	۱۹۸۸ء
۱۴۶	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	کلیم احمد عاجز شخصیت اور شاعری	۲۰۰۴ء
۱۴۷	مومن خاں شوق	یہ موسم گل	۲۰۰۳ء
۱۴۸	'' '' ''	صف مژگاں	۱۹۷۷ء
۱۴۹	'' '' ''	چاندنی کے پھول	۱۹۸۷ء
۱۵۰	'' '' ''	نشاط آرزو	۱۹۹۳ء
۱۵۱	مومن خاں شوق	کرن کرن اجالا	۱۹۸۸ء
۱۵۲	'' '' ''	یہ موسم گل	۲۰۰۳ء
۱۵۳	مصحف اقبال توصیفی	گماں کا صحرا	۱۹۹۴ء
۱۵۴	'' '' '' ''	فائزا	۱۹۷۸ء
۱۵۵	محبوب علی خاں اخگر	کلیات صفی اورنگ آبادی	۲۰۰۰ء
۱۵۶	محمد یعقوب مطیب	حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی	۲۰۰۰ء
۱۵۷	محمد اکبرالدین صدیقی	یادگار امجد	۱۹۶۱ء
۱۵۸	مقبول احمد مقبول ڈاکٹر	مضطر مجاز شخصیت اور فن	۲۰۰۶ء
۱۵۹	مظفر النساء ناز	روشنی	۱۹۹۸ء
۱۶۰	'' '' ''	کتنا روشن میرا گھر ہے	۲۰۰۱ء
۱۶۱	میر برہان علی خاں کلیم	جھونکے شمیم سخن کے	۲۰۰۱ء
۱۶۲	مرزا مصطفیٰ علی بیگ	آئی ایم سوری	۱۹۹۳ء
۱۶۳	نظام ٹرسٹ	انتخاب کلام آصف سابع	۱۹۷۵ء
۱۶۴	وہاب عندلیب	غیاث صدیقی شخصیت اور فن	۲۰۰۳ء
۱۶۵	ڈاکٹر ہادی قادری	تحیات ہادی	۱۹۹۶ء
۱۶۶	'' '' ''	صوت ہادی	۱۹۸۹ء

۱۶۷	یوسف یکتا	گونگی دعا	۱۹۹۴ء
۱۶۸	" " "	غنچہ عطر بیز	۲۰۰۱ء

......اخبارات ورسائل......

۱ اخبار "جنگ" مورخہ ۲۲؍ڈسمبر ۱۹۷۳ء

۲ ادارۂ ادبیاتِ اردو (مرتبہ) تہنیت النساء بیگم زور شخصیت اور شاعری ۲۰۰۲ء

۳ ادارۂ ادبیاتِ اردو (مرتبہ) ماہنامہ "سب رس" ۱۹۴۸ء

۴ روزنامہ سیاست امجد سے شاذ تک ۱۹۸۸ء

۵ روزنامہ "منصف" مضمون "چار مینار کے دامن میں"
از جہاندار افسر، صفحہ ۳ مورخہ ۱۸؍ستمبر ۲۰۰۳ء

۶ محمد قمر الدین صابری (ایڈیٹر) شاداب حیدرآباد کے اردو شعراء نمبر ۱۹۹۳ء

SUKHANWARANE HYDERABAD

(HYDERABAD MEIN URDU SHAIRI ĀZADI KE BAAD)

BY

DR. SYED BASHEER AHMED
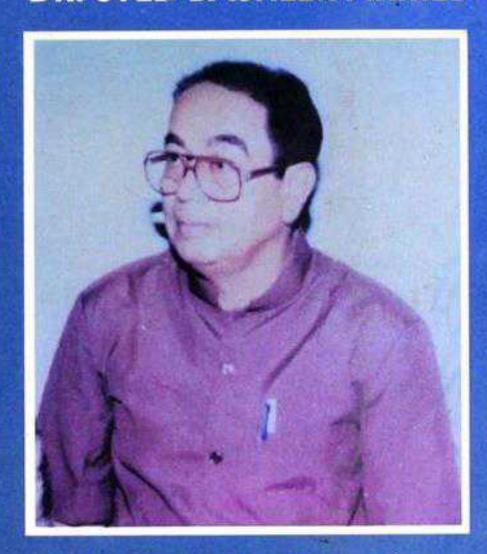
مصنف کی دیگر تصانیف

- ☆ حیدرآباد میں غیر مسلموں کی اُردو خدمات (آزادی کے بعد) — ۲۰۰۴ء
- ☆ مسکراہٹوں سے قہقہوں تک — ۲۰۰۶ء
- ☆ انوارِ صوفیائے حیدرآباد — ۲۰۰۷ء
- ☆ مزاح نگارانِ حیدرآباد — زیرِ اشاعت
- ☆ اُردو کے روشن مینار — زیرِ اشاعت

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)

PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-8223-286-4